قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

www.urducouncil.nic.in

جولائی 2019 قیمت 15₹

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

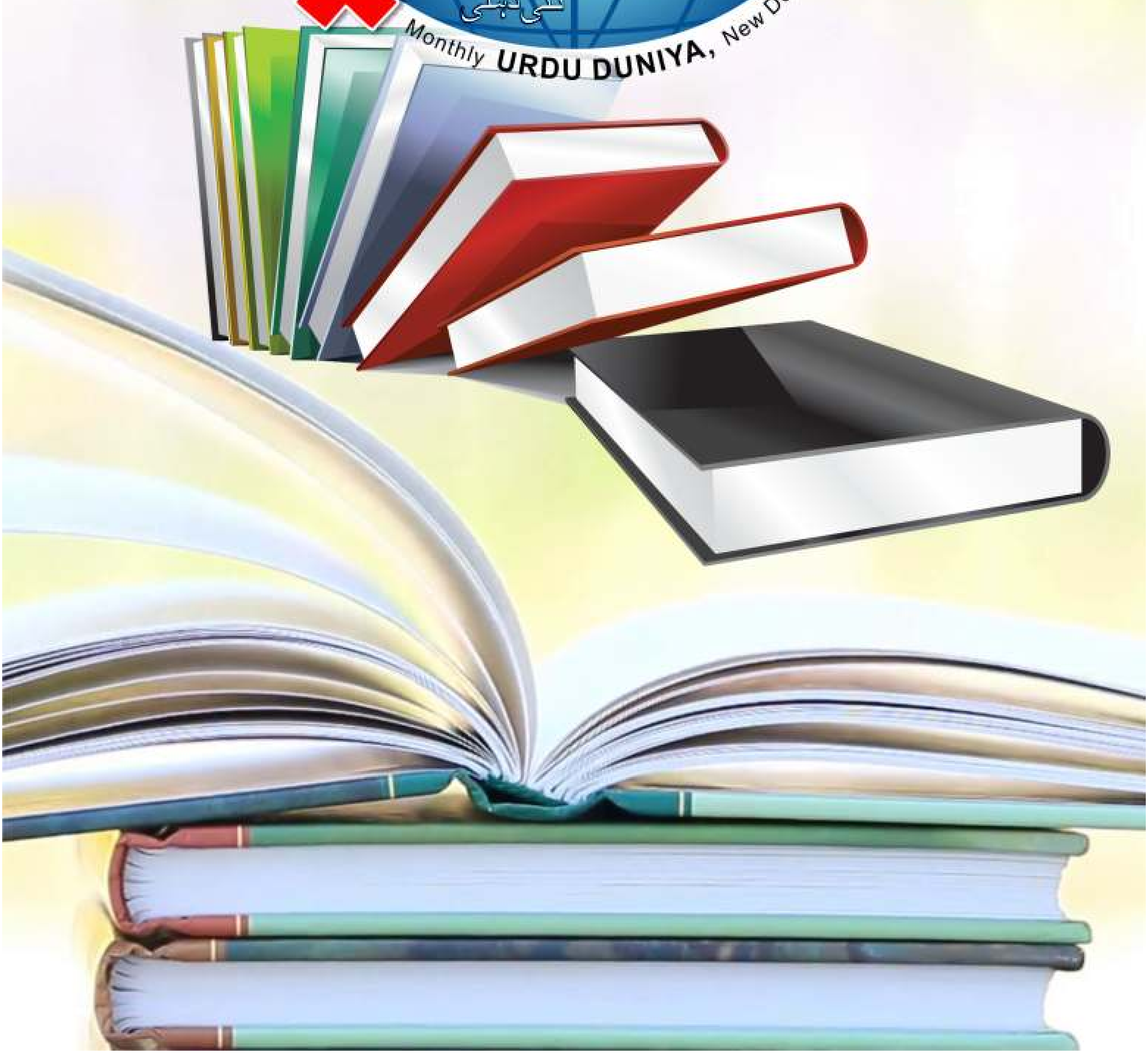

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

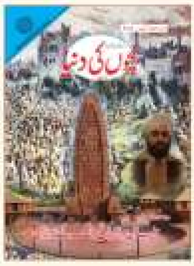

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے سالانہ: 100 روپے

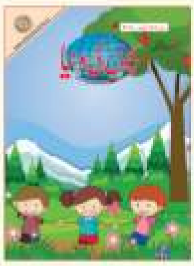

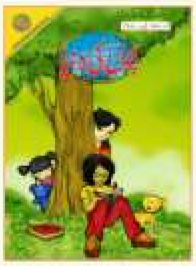

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

ماہنامہ
اُردو دُنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:21،شمارہ:07،جولائی2019

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
نائب مدیر : ڈاکٹرعبدالحی
مشیر : حقانی القاسمی

ناشراورطابع

ڈائرکٹر،قومی کونسل برائے فروغِ اردوزبان
وزارتِ ترقی انسانی وسائل،محکمۂ اعلیٰ تعلیم،حکومتِ ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈسنز،بی۔88،اوکھلاانڈسٹریل ایریا
فیز-II،نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفترقومی اردوکونسل

کمپوزنگ:محمداکرام
ڈیزائننگ:محمدزید

قیمت-/15روپے سالانہ -/150روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آراسے قومی اردوکونسل NCPULاور اس کے مدیرکامتفق ہوناضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhiکے نام ارسال کریں

صدردفتر
فروغِ اردوبھون،ایف سی 33/9،انسٹی ٹیوشنل ایریاجسولہ،۔
نئی دہلی-110025
فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8،ونگ-7 آرکے پورم،نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس:26108159
ای میل:sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ:110-7-22،تھرڈفلور،ساجدیارجنگ کمپلکس
بلاک نمبر5-1پتھرگٹی،حیدرآباد۔500002
فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
آپ کی بات قارئین کے خطوط 5

زبان اور زمینی صورتِ حال
چالوالفاظ کا چلن بڑھ رہاہے شکیل احمد 8

نقد و نگاہ
کس کس نے حالی کی مخالفت کی؟ تقی عابدی 12
غالب صدی کے بعد دیوانِ غالب کی قابل ذکراشاعتیں شمس بدایونی 16

اردوکاپہلانثری سفرنامہ علی عباس 21
سلاطین دہلی کے علمی رجحانات مہتاب جہاں 25
نہال چندلاہوری اور مذہب عشق امتیازوحید 27
الٰہی بخش نشاط کاندہلوی اوران کی 'بکٹ کہانی' ندیم احمد انصاری 30
1980 کے بعد کی اردواور ہندی کہانیوں کا تقابلی مطالعہ محمدنہال افروز 33
اردوزبان وادب کے مسائل عبدالرحمٰن فیصل 38
غیرافسانوی اصنافِ ادب محمدعظمت الحق 41
مطبع مجتبائی دلی عبداللہ عثمانی 47

خراجِ عقیدت
شمع کی لو: یونس دہلوی محمدبشیرمالیرکوٹلوی 49

شخصیات
کیفی وجدانی بریلوی پی پی سریواستورند 51
شاعربھٹکل ڈاکٹرمحمدحسین فطرت محمدناصرسعیداکرمی 54

ہم نے جنھیں بھلا دیا
حکیم سیدفخرالدین خیالی انیس احمدندوی 56

عالمی ادبیات
وِدربھ میں فارسی زبان وادب کاارتقا آغاغیاث الرحمٰن 59
انگریزی کاشاہکارادب ذاکرانعامدار 63

نیا آسماں نئے ستارے
اردوادب اورعالمی مسائل اسعداللہ 66

خصوصی گفتگو
آیئے تعلیم کوسزاسے مزہ میں بدل دیں: پروفیسرادریس صدیقی عبدالحی 69

سائنس/ ٹیکنالوجی/ماحولیات
کاغذکی اہمیت اوراس کی افادیت سلطان آزاد 72
فضائی آلودگی حمیدادیبی نانڈوروی 74
اوزون کودرپیش خطرہ عظیم اقبال 76

کمپیوٹر
گرافکس 78

کتابوں کی دنیا
تعارف وتبصرہ ادارہ 81

خبرنامہ
اردودنیا کی خبریں ادارہ 91

ہماری بات

مادیت اور صارفیت میں محصور معاشرے کا رشتہ کتابوں سے ٹوٹ چکا ہے۔ صارفی کلچر نے انسانی ذہن کو اس قدر مادیت پرست بنا دیا ہے کہ انسان کی معراج اب صرف مادی عروج اور ترقی بن کر رہ گئی ہے۔ کتابوں میں جو روحانیت کی خوشبو ہوتی ہے اس سے ہمارا سماج دور ہو چکا ہے۔ ایسی صورت میں کتاب کلچر کو فروغ دینا وقت کی ضرورت بن جاتی ہے کیونکہ اس کلچر سے دوری کی وجہ سے ہمارے معاشرے کا چہرہ بھی مسخ ہوتا جارہا ہے اور بہت سی منفی قدریں ہمارے معاشرے کا حصہ بنتی جارہی ہیں، جرائم اور دیگر برائیوں کے بڑھنے کی اصل وجہ بھی کتاب کلچر سے دوری ہے۔ کتاب کلچر سے دوری کا ایک نقصان یہ بھی ہوا ہے کہ اعلیٰ اقدار و افکار و خیالات کے دروازے بند ہو گئے ہیں جبکہ ماضی سے لے کر اب تک کتاب ہی ایک ایسی چیز تھی جو نہ صرف انسان کو اسرارِ فطرت سے آشنا کرتی تھی بلکہ آدابِ زندگی بھی سکھاتی تھی۔ کتاب ہی ہے جو احساس کے نئے نئے دروازے کھولتی ہے اور انسانوں کو متانت اور تمکنت سکھاتی ہے۔ کتاب کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس سے بہتر کوئی دوست نہیں ہے۔ تنہائی کا سب سے بہترین رفیق کتاب کو ہی کہا گیا ہے لیکن آج معاشرہ تیزی کے ساتھ بدل رہا ہے۔ اب کتاب کی جگہ موبائل اور انٹرنیٹ نے لے لی ہے۔ شاید آج کا معاشرہ مادی ترقی پر مرکوز ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لیے روحانیت کے لیے بہت کم جگہ رہ گئی ہے۔ جبکہ انسانی اقدار اور روحانیت کے تحفظ کے لیے کتابوں سے رشتہ جوڑنا بہت ضروری ہے کہ یہی کتابیں ہیں جو ہمیں مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں سے آشنا کرتی ہیں اور ہمارے ضمیر اور ذہن کو نئی زندگی عطا کرتی ہیں۔ اس لیے کتاب کلچر سے دوری آج کے معاشرے کا ایک بڑا المیہ ہے جس پر دانشورانِ قوم و ملت کو غور کرنے کی ضرورت ہے کہ معاشرے کو کتابوں سے کیسے جوڑا جائے اور مطالعے کے رجحان کو کیسے بڑھاوا دیا جائے کیونکہ جب تک کتاب اور کاغذ پر توجہ مرکوز نہیں کی جائے گی، حالات نہیں بدل سکتے۔

پرانے زمانے میں لوگ کتابوں کی جستجو میں دور دراز علاقوں کا سفر کرتے تھے، صعوبتیں برداشت کرتے تھے، لیکن آج جبکہ پہلے کے مقابلے میں نئی ٹیکنالوجی کی وجہ سے کتابوں تک رسائی آسان ہوگئی ہے۔ اس کے باوجود بھی لوگ کتابوں سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ اسی لیے اب معاشرے کے بیدار اور حساس افراد کی ذمے داری بنتی ہے کہ کتاب کلچر کے تحفظ کے لیے کوشش کریں اور اس کی کئی شکلیں ہیں۔ ایک بہتر صورت تو یہ ہے کہ ہر گاؤں، قصبہ اور شہر میں لائبریریاں قائم کی جائیں اور کتابیں ردی میں بیچنے کے بجائے لائبریریوں کو دی جائیں۔ آج بہت سے لوگ اپنی کتابیں ردی میں بیچ دیتے ہیں اس طرح کے بہت سے المناک واقعات بھی سامنے آئے ہیں کہ بہت سی قیمتی کتابیں بڑے مصنفین کے وارثوں نے ردی میں بیچ دیں۔ اس طرح کے واقعات یقیناً احساس دلاتے ہیں کہ کتابوں کی جو قدر و قیمت تھی وہ اب ختم ہوتی جارہی ہے۔

تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ جنھوں نے اپنی ذاتی لائبریریوں میں نادر و نایاب کتابوں کا قیمتی اثاثہ محفوظ رکھا ہوا ہے اور انھیں یہ کتابیں اپنی جان سے بھی عزیز تھیں۔ انھیں احساس تھا کہ ان کتابوں سے روشنی پھیلے گی مگر اب صورتِ حال یہ ہے کہ کتابوں کے لیے گھروں میں جگہ نہیں رہ گئی ہے۔ جن گھروں میں کتابوں کی روشنی ہوتی ہے وہ گھر آباد رہتے ہیں لیکن جو گھر کتابوں سے محروم ہیں وہاں تاریکیوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ پرانے زمانے میں کتابیں تحفے میں دی جاتی تھیں اور بہت ہی قیمتی تحفہ سمجھی جاتی تھیں مگر آج کے عہد میں کتابوں کی کوئی اہمیت اور معنویت نہیں رہ گئی ہے اس لیے اب ضرورت ہے کہ دانش گاہوں کے اساتذہ اور طلبا آگے آئیں اور لوگوں کو کتاب کی معنویت اور اہمیت و افادیت سے آگاہ کریں اور مطالعے کے رجحان کو آگے بڑھائیں۔ اس رجحان کو تقویت دینے کے لیے دیہات اور دور دراز کے علاقوں میں بھی اس طرح کی مہم چلانی چاہیے تاکہ ہمارے معاشرے کا رشتہ کتابوں سے قائم ہو سکے کیونکہ کتابیں ہی ہیں جن سے دنیا میں بہت سے انقلابات بپا ہوئے ہیں اور بہت سے ملکوں کی تصویر و تقدیر بھی بدلی ہے۔ کتابوں سے رشتہ جوڑ کر ہم اپنی روایت اور تہذیب کا بھی تحفظ کر سکتے ہیں اور شاید اسی مقصد کے تحت بہت سے ادارے کتاب میلوں کا انعقاد کرتے رہے ہیں۔ ان کے ذریعے عام لوگوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، انھیں معیاری اور سستی کتابیں فراہم کی جاتی ہیں۔ قومی اردو کونسل نے مختلف ریاستوں اور اضلاع میں کتاب میلے کے انعقاد کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ کتابوں سے سماج کو جوڑا جائے کیونکہ کتاب کے ذریعے ہی معاشرے میں متانت اور دانائی پیدا کی جا سکتی ہے۔

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

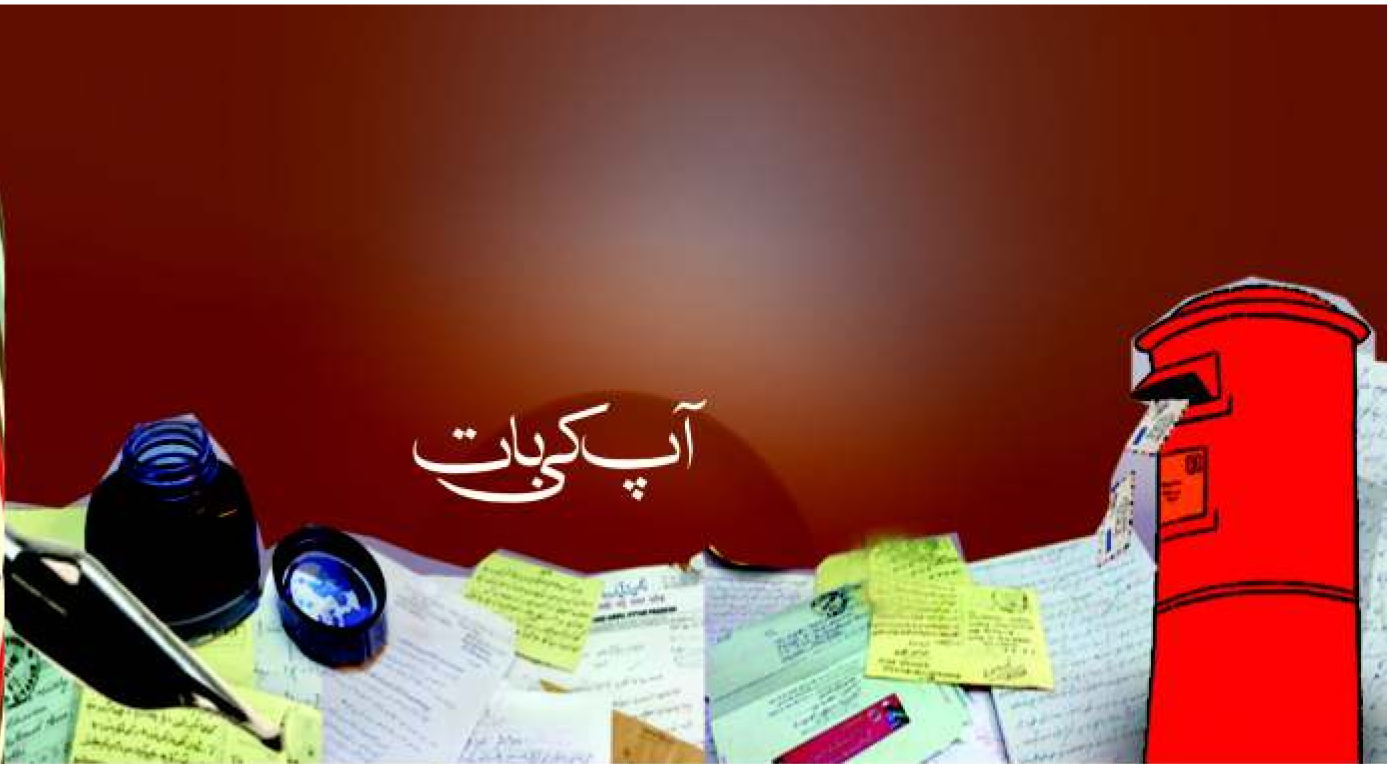

آپ کی بات

✍ ماہنامہ 'اردو دنیا' مئی کے سرورق پر چند نابغۂ روزگار شخصیتوں کے ساتھ عالمی اردو کانفرنس کی ایک ہمہ گیر رپورٹ کے علاوہ معیاری مضامین منصہ شہود پر ظہور پذیر ہوئے۔

اس میں 'تضمین نگاری' اور 'اشعار غالب سے ماخوذ عنوانات' کے موضوعات پر دو مضامین ہیں۔ کلاسیکی شعرا میں غالب، میر، ذوق، ظفر، داغ وغیرہ کے مصرعوں سے ناولوں، افسانوی اور شعری مجموعوں کے عنوانوں کی نشاندہی کی گئی۔ عسکری صفدر سے محمد قمر سلیم کے اول افسانوی مجموعے 'کچھ درد سوا ہوتا ہے' کا شمار کرنا رہ گیا ہے۔ مجموعے کا عنوان غالب کے مشہور شعر کا مصرعہ ہے۔

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف
آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

جمیل مظہری کو وہ مقام نہیں مل پایا جس کے وہ حقدار تھے۔ شہاب ظفر اعظمی نے ان کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی نظموں میں انسان دوستی کا بخوبی محاسبہ کیا ہے، تاہم علامہ اقبال کے جذبۂ خودی کے متعلق جمیل مظہری کے شعر کا حوالہ دینا بھی درکار تھا۔

بقدر پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

صدر عالم گوہر نے ہمیشہ کی ہی طرح اس بار بھی عرق ریزی کے ساتھ مشہور و معروف فلمی شاعر نقش لائل پوری سے ایک معیاری مشافہہ پیش کیا ہے۔ تقریباً نصف صدی قبل مجھے فلمی دنیا سے بڑے بے آبرو ہو کر واپس آئے ہوئے ایک نوجوان شاعر سے پتا چلا تھا کہ نقش صاحب فلمی دنیا کے نامساعد حالات سے دن رات نبرد آزما ہونے والے اس جیسے متعدد نوجوان 'اسٹرگلر' نغمہ نگاروں

سے چند ٹکوں میں ان کے گیتوں و غزلوں کو خرید لیتے تھے، بعد میں انہیں تخلیقات کو چند الفاظ کے رد و بدل کے ساتھ اپنے نام سے فلموں میں داخل کر دیا کرتے تھے۔ یہ امر متنازعہ فیہ ہوسکتا ہے، لیکن موصوف کی تمام عمر کی شاعری کا محاکمہ کرتے وقت اس راز کی تصدیق ہونی بھی درکار ہے، تاکہ بے روزگار نوجوانوں کے درد کو بھی زبان دی جا سکے۔

❁ **کرشن بھاوک** : گورونانک نگر، گلی نمبر 18-K، پٹیال، پنجاب

✍ 'اردو دنیا' مئی 2019 بدست ہوا۔ بشمول 'ہماری بات' سرورق کی کہانی عالمی اردو کانفرنس کی طویل ترین (ص 7 تا ص 32) دلچسپ روداد درج ہے۔ اس میں جہاں کسی ابہام کی اطمینان بخش صراحت ہے، وہیں اسے رنگین، دیدہ زیب و برموقع تصاویر کی معاونت سے مزید خوبصورت بنا دیا گیا۔ ص 33 پر ایک روداد طرز کا مضمون شامل ہے 'اردو آپ کے دروازہ تک' جو اردو کونسل کی موجودہ قیادت کے اہم منصوبوں اور ان کی عملی انجام دہی کو منعکس کرتا ہے۔ مثلاً وہ علاقے جہاں اردو کی ترویج کی حاجت ہے جیسے دوردراز انڈومان نکوبار، شمال مشرقی ریاستیں منی پور وغیرہ۔ چنانچہ اسی کوشش میں شروعات گوا اور جھارکھنڈ سے کی گئی ہے اور وہاں کی متعلقہ وزارت اور رانچی یونیورسٹی کے اعلیٰ ترین افسران سے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر کی زیر قیادت اعلیٰ اختیاری وفد کی ملاقات اور نشست کا بیانیہ درج ہے جو ایک خوش آئند پیش رفت ہے۔ ص 37 پر بتایا گیا ہے کہ ٹکنالوجی میں اردو کے مستقبل کا راز پوشیدہ ہے۔ تقریباً ہر شمارہ میں 'سوالات برائے انٹرویو' دیے جاتے ہیں جن کی بنیاد پر اس کی تفصیلات فراہم کی گئی ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ص 42 پر 'تضمین نگاری' سے متعلق اک عالمانہ مضمون دیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ کسی ایک مصرعہ یا ایک شعر یا پوری نظم یا غزل کے تمام اشعار کو ضم کرنے کو تضمین نگاری کہتے ہیں۔ مثلاً حکیم مومن خان مومن کے مشہور شعر

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کی تضمین اس طرح کی گئی ہے۔

دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ثریا صولت حسین اپنی ہیئت کے اعتبار سے یہ بڑی حد تک طرحی مصرعہ پر گرہ لگانے جیسا ہے۔ لیکن اس مضمون کو ہائی اسکول، جونیئر کالج، انڈر گریجویٹ طلبہ کو ضرور پڑھنا

چاہیے۔ ص 42 پر قابل توجہ مقالہ بعنوان 'اشعار غالب سے ماخوذ عنوانات' دیا گیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ غالب کے کلام سے بڑے بڑے شعرا نے اپنے مجموعوں کے عنوانات اخذ کیے ہیں، مثلاً علامہ اقبال نے اپنے شعری مجموعہ کا عنوان 'بالِ جبریل' غالب کے اس شعر سے اخذ کیا۔

تیرا اندازِ سخن شانۂ زلفِ الہام
تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل

اسی طرح مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی نے اپنے رسالے کا عنوان 'نقش وفا' غالب ہی کے شعر سے لیا۔ رشید احمد صدیقی کی دو کتابوں کے عنوانات 'آشفتہ بیانی میری' اور 'گنج ہائے گراں مایہ' غالب کے اشعار سے ہی ماخوذ ہیں۔ بہرحال اتنی نادر مثالیں ہیں کہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں کیونکہ یہ ایک ایسی تحقیقی کاوش ہے جس کی مثال عنقا ہے۔ ص 49 پر محترم جمیل مظہری کے کلام میں آدم کی عظمت اور احترام انسانیت کے علاوہ ان کے فکر و فلسفہ اور تصورات عمرانی کا بیان ہے۔ ص 52 پر بدایوں کے غزل گو شاعر منشی دیبی پرشاد سحر کا ذکر ہے۔ اسے ان کی شخصیت اور کلام کی روداد سمجھیے۔ اسی طرح ص 54 پر تمل ناڈو کے ادیب کاوش بدری کے فن و شخصیت کا بیان ہے۔ امجد حیدر آبادی اپنی رباعیات کے لیے بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ ان کی شخصیت اور فن کی خصوصیات مع مثال ص 57 پر پیش ہے۔ ص 60 پر معروف گیت کار نقش لائل پوری کی بپتا بیان کی گئی ہے کہ زندگی اور فلمی ماحول میں انھیں کن کن زیادتیوں سے سمجھوتہ کرنا پڑا۔ ص 63 پر کمپیوٹر کورس پر آپ کو عمدہ تکنیکی مواد حاصل ہو جائے گا۔ ص 64 پر تبصرہ اور تعارف کی شروعات ہوتی ہے جس کے تحت کوئی گیارہ نئی مطبوعات پر تبصرے شامل ہیں جن سے آپ کو اپنی پسند کی کتب منتخب کرنے میں سہولت رہے گی۔ ص 73 سے قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں کا خبرنامہ شروع ہوتا ہے جس میں ہر خبر چونکا دینے والی اور قابل تعریف ہے، مثلاً پہلی خبر تو نہایت ہی خوش آئند ہے یعنی نابینا افراد کے لیے اردو میں بریل کی تیاری، ویسے ہی مزید کوئی پچیس کے خبریں درج ہیں۔ اس طرح اس شمارے میں ادب کی چاشنی، صحافت کا انداز، تنقید، شخصیات اور ان کی نفسیات، یادرفتگاں، کمپیوٹر ٹکنالوجی، کتابوں پر عمدہ تبصرے، علاوہ ازیں دنیا بھر کی خبریں ایک معیاری رسالہ سے بجز اس کے آپ اور کیا توقع رکھتے ہیں؟ آپ کے ذوق کی تسلی کے لیے اتنا کچھ کافی نہیں؟

مصطفیٰ ندیم خاں غوری: اورنگ آباد، مہاراشٹر

سابقہ آب و تاب لیے ادبی معنویت سے پُر 'اردو دنیا' مئی 2019 کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر جناب ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کا اداریہ 'ہماری بات' لائق تحسین و ستائش ہے۔ 'آپ کی بات' کے تحت قارئین کے خطوط میں اردو دنیا کے مشمولات کی پسندیدگی کا اظہار حق بجانب ہے۔ عبدالرشید اعظمی اور مسرت کی مشترکہ رپورٹ میں عالمی اردو کانفرنس کی مکمل روداد سے واقفیت ہوئی جس میں کانفرنس کے موضوعات کی بڑی خوبصورت اور جامع رپورٹنگ کی گئی ہے۔ رپورٹ بڑی تفصیلی مگر دلچسپ ہے جو قاری کو مطالعے کے لیے باندھے رکھتی ہے۔ دوسری رپورٹ از شاہد اختر انصاری 'اردو آپ کے دروازے تک' سے بھی کونسل کی سرگرمیوں اور زبان و ادب کے لیے کیے جارہے تفصیلی کاموں سے بخوبی واقفیت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر فہیم احمد صدیقی کا مضمون 'تضمین نگاری' ایک عمدہ مضمون ہے جو عہد حاضر میں تضمین گوئی کے ضمن میں شعرا کی بے توجہی پر اظہار تاسف کے ساتھ تضمین گوئی کی تحریک دلاتا ہے۔ عسکری صفدر کا مضمون اشعار غالب سے ماخوذ عنوانات اپنی نوعیت کی ایک منفرد کاوش ہے جو لائق ستائش ہے۔

علاوہ ازیں شہاب ظفر اعظمی کا 'جمیل مظہری کی نظموں میں عظمت آدم اور احترام انسانیت'، علیم صبا نویدی کا 'بدایوں کا ایک غزل گو منشی دیبی پرشاد سحر'، تمل ناڈو کا ایک انمول رتن: کاوش بدری' از قاضی حبیب احمد، محترمہ خدیجہ زبیر احمد کا 'سید امجد حسین امجد حیدر آبادی شخصیت اور شاعری'، 'کچھ باتیں کچھ یادیں: نقش لائل پوری کی' از صدر عالم گوہر وغیرہ پر از معلومات اور مرقع ہیں۔ 'دستاویز اور ٹیکسٹ کو فارمیٹ کرنا' و 'ٹکنالوجی میں اردو کے مستقبل کا راز پوشیدہ ہے' وغیرہ مشمولات نے اردو اور ٹکنالوجی کو ہم آہنگ کرنے میں اہم کردار نبھایا ہے۔

محمد احمد دانش رواتوی: بجنور، یوپی

'اردو دنیا' بابت مئی 2019 موصول ہوا۔ حسب روایت دیدہ زیب اور معیاری مواد سے مزین ہے۔ اس شمارے میں میرے محترم دوست علیم صبا نویدی کا مضمون 'بدایوں کا ایک غزل گو منشی دیبی پرشاد سحر' نظر سے گزرا۔ بھائی علیم صبا نویدی نے سحر صاحب کا تعلق کائستھ خاندان کی ایک شاخ 'شری واستو' تحریر کیا ہے جو درست نہیں ہے۔ جناب سحر کا تعلق میرے ہی فرقہ 'سریواستو' سے تھا۔ ان کے خاندان کے افراد اب بھی شہر بدایوں میں مقیم ہیں۔

تذکرہ آگیا تو عرض کردوں کہ کائستھ خاندان کا زبان اردو کی ترویج و اشاعت میں بہت بڑا ہاتھ رہا، جس میں ہمارے فرقے 'سریواستو' اور 'سکسینہ' ادیبوں اور شاعروں کا لہو شامل رہا۔ اردو کے تاریخی اوراق پر نظر ڈالیں تو منشی ہرگوپال 'تفتہ' تلمیذ مرزا غالب سے لے کر فراق گورکھپوری تک اور منشی پریم چند سے لے کر منشی بابو رام سکسینہ تک کے ادیبوں نے نظم اور نثر دونوں کی آبیاری کی۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر عبور حاصل کیا۔ فن اور فن کی باریکیوں سے واقفیت کی۔ کائستھ حضرات کی ادبی خدمات کو فراموش کرنا ممکن نہیں۔ منشی پورن چند ذرہ، دوارکا پرشاد افق، منشی نوبت رائے نظر، منشی رام سہائے تمنا، منشی دیا شنکر فرحت، تلمیذ داغ، منور لکھنوی۔ جگر بریلوی، ادیب لکھنوی، بسمل الہ آبادی، سحا میرٹھی، قیس بنارسی، گوپی ناتھ امن لکھنوی، بلدیو پرشاد سوزن، شفق لکھنوی، راجہ کرن پرشاد، کرشن بہاری نور لکھنوی، درگا سہائے سرور جہان آبادی وغیرہ سیکڑوں نام ایسے ہیں جو اپنے زمانے میں اردو اور فارسی کے عالم رہے اور استاد تسلیم کیے گئے۔ انھوں نے اپنی باقیات میں بہت بڑا سرمایہ چھوڑا جو کتب خانوں کی کتابوں میں دم سادھے پڑا ہے اور سسک رہا ہے۔ کائستھ فرقہ جس کی مادری زبان کبھی اردو اور فارسی تھی، اب ہمارے ساتھ نہیں ہے۔ ایک پڑھا لکھا اور ذہین طبقہ ایک دم اردو سے الگ ہوگیا۔ اس حقیقت پر کسی کی نظر نہیں گئی۔ گنگا جمنی تہذیب میں اب نہ گنگا ہے اور نہ جمنا۔ صرف ریت کے بگولے اڑ رہے ہیں۔

بات تھی منشی دیبی پرشاد سحر کی مگر کچھ آگے ہی نکل گئی۔ میرا شعر ہے۔

ہمارے گھر میں بھی اردو کہاں بچی اے رند
ادب شناس کوئی خاندان بھر میں نہ تھا

پی پی سریواستو رند: R-16، سیکٹر 11، نوئیڈا، یوپی

'اردو دنیا' اپریل کا شمارہ ملا۔ زیر نظر شمارے کے اداریے 'اپنی بات' میں آپ نے دنیا کی تمام زبانوں کو قدرے مشترک کے پیمانے میں ناپتے ہوئے تمام زبانوں کی روح ایک جیسی ہوتی ہے سے گردانا ہے جو برحق ہے لیکن ان تمام زبانوں میں اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو ہندوستان کی تہذیبی روح کو ساری دنیا میں پھیلا بھی رہی ہے اور پھول بھی رہی ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ اس کی پرورش اور پرداخت میں ہندوستان کے تمام طبقات چاہے وہ اندرونی ہوں یا بیرونی اس زبان کی تشکیل میں وقتاً فوقتاً اپنا اہم کردار ادا کرتے رہے اور

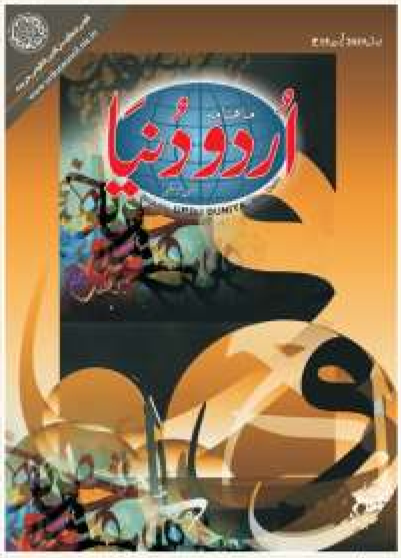

آج بھی اس کا سلسلہ جاری وساری ہے۔ بقول آپ کے یہ بات صد فی صد سچ ہے کہ اردو کو کسی مذہب، قوم یا جغرافیائی دائرے میں بند نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ اپنی تہذیبی شناخت میں ہندوستان کی مٹی سے گندھی ہوئی ہے اور عالمی سطح پر قدرآور پیکر رکھتی ہے جس کو عالمی شناخت دینے میں وہ تمام قدآور شعرا وعلما وادبا نے اپنے خونِ جگر سے اور اپنی خوبصورت تخلیقات سے اس کو سنوارا اور نکھارا ہے جن میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی یہاں تک انگریزی، جاپانی، فرانسیسی اور جرمنی ادبا اور پروفیسر بھی اس منفرد زبان کو سینے سے لگاتے ہوئے اس کو سینہ بہ سینہ پھیلانے میں آج بھی کوشاں اور مگن ہیں۔

اداریے کے آخری جملوں میں آپ نے آج کی ٹیکنالوجی ڈیجیٹل ایج سے گزرتی ہوئی اردو زبان کا بغور جائزہ لیا ہے جو فکر انگیز ہے کیونکہ ٹیکنالوجی اور ڈیجیٹل میڈیا میں اردو کا حسن نکھر کر سامنے نہیں آرہا ہے جو باتیں کتاب کی صورت میں اردو کی وراثت کا تحفظ کیے ہوئے تھی یہ ڈیجیٹل میڈیا کتابی لسانی تہذیبی تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔

محمد نذیر احمد کا مضمون 'دکنی شاعری میں تلمیحات' بڑی عرق ریزی اور محنت کا غماز ہے، مضمون کے مطالعے سے معلومات میں بھی اضافہ ہوا۔ اردو رباعی کا مکمل نقشہ سلام سندیلوی نے سب سے پہلے دکھایا تھا پھر اس رباعی کے روشن نقوش کا آئینہ علامہ ناوک حمزہ پوری، شمس الرحمن فاروقی، سید وحید اشرف وغیرہ نے اردو ادب کے آگے رکھا۔ رباعی گو شعرا میں بقول فاروق جائسی علامہ کوثر جائسی نے تین ہزار رباعیات لکھیں۔ محمد اسلم فاروقی نے رباعیات پر روشنی ڈالنے کی بساط بھر کوشش کی ہے۔ رشید حسن خان پر خالد ظہیر اور شکیب جلالی کی غزلوں پر سلیم انور کے مضامین بھی اچھے لگے۔

❖ **علیم صبا نویدی**: رائس منڈی اسٹریٹ، چینئی، تمل ناڈو

✍ 'اردو دنیا' ماہ اپریل کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ شمارہ وقت پر ملنے سے خوشی ہوتی ہے، ہندوستان کے مقتدر رسالوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ ہماری بات میں مدیر نے اردو زبان اور اس کے موقف پر بات کی ہے آپ نے کہا کہ اردو میں پوری ہندوستانیت ہے یقیناً اس میں ہندوستان کے تہذیبی، تمدنی وثقافتی عناصر کی عکاسی وترجمانی ہوتی ہے۔ اردو اپنے دامن میں تکثیری قدریں لیے ہوئے ہے اور ملک وقوم کی تہذیب وتمدن کو توانا کیا ہے حیات نو بخشی ہے، اردو اور ہندوستان ایک جان دو قالب ہیں ملک کا لازمہ ہے۔ محمد قمر سلیم نے کہا ہے کہ تعمیریت اور زبان کی تدریس میں اب بھی اردو کے کلاس روم روایتی انداز سے چل رہے ہیں۔ کمرہ جماعت میں ٹیچر سب کچھ بول دیتا ہے۔ بچوں کو بولنے کا موقع نہیں ملتا۔ طلبہ اب بھی اخلاقی دباؤ میں ہیں، استاد سے سوال کرنا بے ادبی سمجھتے ہیں۔ محمد نذیر احمد نے دکنی شاعری میں تلمیحات کی تشریح وتعبیر کی ہے۔ مذہبی اور تاریخی تلمیحات زیادہ ہیں۔ محمد اسلم فاروقی نے اردو رباعی کی اخلاقی قدریں اور ان کی عوامی معنویت میں رباعی گو شعرا کی رباعیات کے حوالے سے بات کی ہے اور ان میں روحانی اور اخلاقی عناصر کی نشاندہی کی ہے۔ 'علامہ شبلی اور جدید عربی زبان' میں قمر اقبال نے شبلی کے عربی کارنامے اور ان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ محمد خالد ظہیر نے 'اردو املا اور زبان و قواعد کی اصلاح میں رشید حسن کا کردار' میں ان کی املا والی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ پی کے عبدالحمید کاراشیری نے قومی یکجہتی کے فروغ میں اردو کا حصہ، غالب، اقبال، فیض، علی سردار جعفری، محمد قلی قطب شاہ، پریم چند وغیرہ کے کلام ونثر کے حوالے سے قومی یک جہتی کے تصور کو عام کرنے کی کوشش کی اور بھی شعرا ہیں جنھوں نے رواداری، تحمل، برداشت، گنگا جمنی تہذیب کو عام کیا ہے۔ عصری ماحول میں ایسے مضامین کی معنویت اور افادیت بڑھ جاتی ہے۔ 'صفی لکھنوی لسان القوم' فوزیہ خانم نے لکھا ہے اس میں صفی کی زندگی اور شاعری کے حوالے سے اہم لسانی نکات کو پیش کیا ہے۔

❖ **ناظم علی** : سابق پرنسپل، یاقوت پورہ، حیدرآباد، تلنگانہ

■

قلم کاروں سے گزارش

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں ہر شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے افراد کے ذوق اور سطح کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ادب کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی تحریریں شائع کی جاتی ہیں مگر ایسے مضامین کو ترجیح دی جاتی ہے جو سائنسی ، سماجی، ثقافتی اور تعلیمی شعبوں میں ہونے والی ترقیات کا احاطہ کرتے ہوں یا روزگار کے حصول میں معاون وسائل کی نشان دہی کرتے ہوں۔ یہ ہر طبقے کا رسالہ ہے اسی لیے اس میں تنوع کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' کی خوش بختی ہے کہ اسے ہندوستان بھر کے قلم کاروں کا تعاون حاصل ہے۔ ہر موضوع پر ہمیں مضامین ملتے رہتے ہیں۔ لیکن تمام مضامین کی فوری اشاعت ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اب قلم کاروں سے گزارش ہے کہ اپنے مضمون کے ساتھ چند سطروں میں مضمون کے اہم نکات کی نشان دہی فرمادیں تاکہ ترجیحی طور پر مضمون کو شامل اشاعت کیا جاسکے۔برائے مہربانی اپنے مضامین، خبروں اور خط کے ساتھ **اپنا موبائل نمبر اور مکمل پتہ مع پن کوڈ ضرور فراہم کریں۔** معاوضے کے لیے بھیجے گئے فارم میں اپنے قلمی اور بینک اکاؤنٹ میں درج نام کی الگ الگ نشان دہی کریں۔

'چالو' الفاظ کا چلن بڑھ رہا ہے: شکیل احمد

اردو رسائل میں اردو زبان کے تعلق سے جو بھی گفتگو ہوتی ہے ان سے حقیقی صورتِ حال کا ادراک نہیں ہوپاتا۔ زبان کی زمینی صورت حال کیا ہے اس سے آگہی کے لیے ضروری ہے کہ تحریکات و رجحانات کے بجائے ان بنیادی مسائل پر توجہ دی جائے جن کا زبان کے فروغ اور تحفظ سے تعلق ہے۔ عموماً اردو کے حقیقی مسائل سے اجتناب کیا جاتا ہے اور یہ جاننے کی کوشش نہیں کی جاتی کہ کن کن علاقوں میں اردو کی حقیقی صورتِ حال کیا ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں سوال نامے کے ذریعے دراصل اردو زبان کے بنیادی مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ ملک کے مختلف علاقوں میں تعلیم، تدریس اور دیگر سطحوں پر اردو زبان کی صورت حال کیا ہے اور وہاں کس طرح کی دشواریاں اور مشکلات پیش آرہی ہیں۔ جب تک اردو زبان کے بنیادی مسائل پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا جائے گا تب تک اردو زبان کے تحفظ اور بقا کے لیے مربوط لائحہ عمل تیار کرنا مشکل ہوگا۔

س1: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

جواب: موجودہ حالات میں اردو کی تعلیم سے عدم دل چسپی، گھروں میں اس کی تعلیم میں کمی، روزمرہ زندگی میں اردو کتابوں اور اخبارات کی خریداری میں کمی اور عصری تعلیمی اداروں میں اردو کی تدریس کے محدود ہوتے مواقع کو دیکھتے ہوئے، بعض حلقے اردو کے مستقبل سے مایوس نظر آتے ہیں اور فکر مند ہیں کہ یہ زبان زوال پذیر ہوکر اپنی موت کے مرحلے میں نہ پہنچ جائے۔ میں اس رجحان میں یقین نہیں رکھتا۔ اردو پر زبانوں کی موت کا اطلاق مستقبل قریب میں دور دور تک نظر نہیں آتا کیونکہ اس زبان کی تعلیم اور تدریس جاری ہے۔ سیکھنے، پڑھنے لکھنے اور بولنے والے موجود ہیں۔ اس کے رسم الخط پر فی الحال کوئی خطرہ نہیں منڈلا رہا ہے۔ تعلیم گاہوں سے لے کر الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا میں یہ زبان ترقی پذیر ہے ابتدائی سے اعلیٰ تعلیم کے مختلف مراحل میں یہ اپنی زندگی کے ثبوت کے ساتھ گامزن ہے۔ ادبی مذاکرے، مشاعرے اور قصبات تک منعقد ہونے والے مسابقے اس کی زندگی کے ثبوت کے لیے کافی ہیں۔

س2: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟

جواب: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے اس کی تعلیم، املا اور رسم الخط کی حفاظت، کتابوں کی اشاعت اور قاری سے اس کا مضبوط رشتہ اس کو زندہ رکھنے کے اہم ذرائع ہیں۔ روزمرہ زندگی میں بول چال کے ساتھ نئی نسل میں اس کی خواندگی کا انتظام اور دل چسپی ضروری ہے۔

س3: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟

جواب: کسی بھی زبان کا تہذیب اور ثقافت سے آئینہ اور عینک کا رشتہ ہے۔ چہرے کی درستگی کی جانچ کے لیے آئینہ اور بینائی کی کمزوری کو دور کرنے کے لیے عینک کی کلیدی حیثیت ہے۔ زبانیں، معاشرت اور ثقافت کے لیے آئینہ اور عینک کا درجہ رکھتی ہیں۔ زبان اور تہذیب وثقافت کا باہمی رشتہ توانا ہو تو زبان کی ترقی اور نشو ونما کی بابت تشویش کی ضرورت نہیں۔

س4: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

جواب: زندہ زبان میں موجود ثقافتی ورثہ اگر دوسری زندہ زبانوں کی طرح محفوظ اور مقبول ہو مگر زبان اپنے

وجود کی جنگ لڑ رہی ہو تو زندگی کی جنگ ہار جانے کے بعد اس کا ثقافتی سرمایہ بھی ضائع ہوسکتا ہے اگر برے دنوں کی آہٹ کے ساتھ اس کے ثقافتی سرمائے کو دوسری زندہ زبان میں منتقل نہ کیا جاسکا۔ پھر بھی اس کا ایک حصہ یقیناً ضائع ہوجائے گا کیونکہ ہر زبان کا معاشرتی اور ثقافتی سرمایہ ایک جیسا نہیں ہوتا۔ مزاج ایک جیسا نہیں ہوتا۔ اس لیے تحفظ کے مقصد سے دوسری زبان میں منتقل کرنے کے باوجود اس کے بہت بڑے ورثے کی حفاظت کے بارے میں اطمینان نہیں کیا جاسکتا کیونکہ زبان کا اس کی ثقافت سے گہرا رشتہ ہے۔

س5: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

جواب: ہمیں ثقافتی ورثے پر تکیہ کرنے کے ساتھ سائنسی، سماجی اور جدید تر تعلیمی رجحانات کو بھی فراخ دلی سے قبول کرنا چاہیے ثقافتی سرمائے، کلاسیکی وسعت پر فخر ضرور کرنا چاہیے روزمرہ میں اس کا استعمال بھی جاری رہنا چاہیے لیکن سماجی، سائنسی اور تکنیکی علوم کی خواندگی اور ان کے حاصل کرنے کے تمام مروجہ ذرائع بھی اس زبان میں موجود ہونے چاہئیں۔ عدم دستیابی کی صورت میں 'ضرورت' روکی نہیں کی جاسکتی، پانی کو روانی چاہیے تاکہ اس میں کثافت نہ پیدا ہو، مروجہ علوم زبانوں کو رواں رکھنے کا راستہ دیتے ہیں۔ یہ راستے مہیا نہ ہوں گے تو پانی کی طرح زبان بھی محدود ہوکر ناقابل استعمال ہوجائے گی۔ بدبودار کثیف پانی کھیتوں کی سیرابی کے کام تو آسکتا ہے۔ انسانوں کے استعمال کے لائق نہیں۔

س6: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

> **زندہ زبان میں موجود ثقافتی ورثہ اگر دوسری زندہ زبانوں کی طرح محفوظ اور مقبول ہو مگر زبان اپنے وجود کی جنگ لڑرہی ہو تو زندگی کی جنگ ہار جانے کے بعد اس کا ثقافتی سرمایہ بھی ضائع ہوسکتا ہے اگر برے دنوں کی آہٹ کے ساتھ اس کے ثقافتی سرمائے کو دوسری زندہ زبان میں منتقل نہ کیا جاسکا۔ پھر بھی اس کا ایک حصہ یقینا ضائع ہوجائے گا کیونکہ ہر زبان کا معاشرتی اور ثقافتی سرمایہ ایک جیسا نہیں ہوتا۔ مزاج ایک جیسا نہیں ہوتا۔ اس لیے تحفظ کے مقصد سے دوسری زبان میں منتقل کرنے کے باوجود اس کے بہت بڑے ورثے کی حفاظت کے بارے میں اطمینان نہیں کیا جاسکتا کیونکہ زبان کا اس کی ثقافت سے گہرا رشتہ ہے۔**

جواب: اردو زندہ اور ترقی یافتہ زبان ہے۔ اعلیٰ تعلیم کی سطح پر اس کا عمل دخل اطمینان بخش نظر تو آتا ہے۔ ہند و پاک کے علاوہ درجنوں ملکوں اور ان کی جامعات میں اس کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہے۔ تمام متعلقہ ملکوں اور خطوں میں اخبارات و رسائل کی اشاعت، ادبی محفلوں کا انعقاد اور مشاعروں کا اہتمام ہوتا ہے۔ اس اطمینان بخش صورتِ حال کے ساتھ اس کی ابتدائی تعلیم، روزمرہ زندگی میں اس کی پذیرائی اطمینان بخش نہیں ہے۔ اس کے رسم الخط اور تدریس کے مناسب انتظام کے ساتھ گھروں سے بھی اس زبان کا رشتہ کمزور نہیں ہونا چاہیے حالات گواہ ہیں اور زمینی صورتِ حال واضح اشارہ کررہی ہے کہ ہمارے گھروں میں اردو زبان اور بڑی حد تک تہذیب کو جو قبولِ عام آج سے نصف صدی قبل تک حاصل تھا وہ پذیرائی کم ہوتی جارہی ہے۔ یہ صورتِ حال باعثِ تشویش ہے۔ سیمناروں اور مذاکروں کے ساتھ اردو کی ابتدائی تعلیم اور روزمرہ زندگی میں اس کے استعمال کو جاری رکھنے اور فروغ دینے کی سخت ضرورت ہے۔

س7: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہورہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟

جواب: ہمارے گھروں میں جب اردو کی سرپرستی اور پذیرائی کم ہوگی تو اس کی جگہ کسی بھی دوسری زبان کو پر کرنی ہوگی۔ جو یقینی طور پر اردو کے مزاج اور رویے سے مختلف

سوال نامہ برائے انٹرویو

ماہنامہ اردو دنیا میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے۔ یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل و صورت ذرا سی تبدیل کردی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورت حال سے آگاہ ہوسکیں۔

- س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقۂ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- س: زبان کا تہذیب و ثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟
- س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- س: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- س: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہورہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟
- س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہورہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی تدبیریں استعمال کی جاسکتی ہیں؟
- س: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- س: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کام کررہے ہیں؟
- س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی/قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کررہے ہیں؟
- س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جاسکتی ہیں؟
- س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟
- س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- س: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- س: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟
- س: سینٹرل اسکولوں اور نودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ اردو دنیا میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان و ادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورت حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

ہوگی۔ یہ صورت حال اردو کے چہرے کو یقینی طور پر مایوس کن انداز میں متاثر کرے گی۔ آج اردو تلفظ متاثر ہو رہا ہے۔ خوبصورت اردو الفاظ حاشیے پر ہیں اور ان کی جگہ 'بول چال کے چالو الفاظ' نئی نسل کی زبان پر ہیں۔ اس کی روک تھام، درس گاہوں سے زیادہ گھروں اور ماؤں کے ذریعے ہی ہوسکتی ہے۔ گھر کے بزرگوں اور خاص طور پر خواتین اس خطرے کو بڑی حد تک ٹال سکتی ہیں۔ اردو کی تعلیم اور تلفظ کی تربیت کے ساتھ اردو کتابوں اخبارات اور ادبی مجلسوں سے ہماری دل چسپی برقرار رہے گی (بڑی حد تک برقرار بھی ہے) اور جدید تر ذرائع ابلاغ جیسے 'ریختہ' جیسے ادارے فعال رہیں گے تو اردو کا مستقبل روشن ہے۔ دیکھنے اور سننے کے جدید ذرائع ابلاغ کے ساتھ اردو کے مطبوعہ سرمائے پر بھی ہماری نظر رہنی چاہیے۔ کتابوں سے قاری کا رشتہ منقطع نہیں ہونا چاہیے۔ تخلیق کار بھی قاری کے رجحان کو سامنے رکھنے کے ساتھ اپنا تخلیقی سفر جاری رکھیں۔ آج، حالات کے تناظر میں دونوں کے باہمی رابطے اور اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچنی چاہیے۔ زبان اور تلفظ کی حفاظت کے ساتھ عصری مطالبات کے مطابق فنی اور ادبی تخلیقات بھی رواں، عام فہم اور شستہ زبان میں پیش کی جانی چاہیے۔

س10: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی

خوبصورت اردو الفاظ حاشیے پر ہیں اور ان کی جگہ 'بول چال کے چالو الفاظ' نئی نسل کی زبان پر ہیں۔ اس کی روک تھام، درس گاھوں سے زیادہ گھروں اور ماؤں کے ذریعے ھی ھوسکتی ھے۔ گھر کے بزرگوں اور خاص طور پر خواتین اس خطرے کو بڑی حد تک ٹال سکتی ھیں۔ اردو کی تعلیم اور تلفظ کی تربیت کے ساتھ اردو کتابوں اخبارات اور ادبی مجلسوں سے ھماری دل چسپی برقرار رھے گی (بڑی حد تک برقرار بھی ھے) اور جدید تر ذرائع ابلاغ جیسے 'ریختہ' جیسے ادارے فعال رھیں گے تو اردو کا مستقبل روشن ھے۔ دیکھنے اور سننے کے جدید ذرائع ابلاغ کے ساتھ اردو کے مطبوعہ سرمائے پر بھی ھماری نظر رھنی چاھیے۔ کتابوں سے قاری کا رشتہ منقطع نھیں ھونا چاھیے۔ تخلیق کار بھی قاری کے رجحان کو سامنے رکھنے کے ساتھ اپنا تخلیقی سفر جاری رکھیں۔

اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

جواب: ادب کی تخلیق اور زبان کی ترقی و نشو و نما میں توازن ضروری ہے۔ جڑ خشک اور کمزور ہوتی جائے تو شجر کی شادابی کے ختم ہوجانے اور درخت کے رفتہ رفتہ خشک ہوجانے کو روکا نہیں جاسکتا۔ پتوں پر پانی کے چھڑکاؤ سے درخت کی زندگی بچائی نہیں جاسکتی اس لیے اردو زبان کی تدریس خشتِ اوّل کا درجہ رکھتی ہے۔ ادب کے قاری کا ہونا ضروری ہے اور قاری کا وجود زبان کی تدریس، لکھنے پڑھنے اور اپنانے پر منحصر ہے۔ ابتدائی مرحلے یا نچلی سطح سے اردو زبان کو سیکھنے پڑھنے لکھنے اور اپنانے والے نہ پیدا ہوں گے تو رفتہ رفتہ قاری ناپید ہوسکتے ہیں اور تب ادب یا ادب عالیہ اپنے وجود کو نہ محفوظ رکھ سکتا ہے اور نہ زندہ۔ اس لیے اردو کی تنظیموں اور اداروں کے لیے لازم ہے کہ وہ ادب کی اشاعت اور ترویج کی مساعی کے دوران اردو کی ابتدائی تعلیم، اس کے اداروں اور افراد کی طرف پوری توجہ دیں۔ ان کی سرپرستی اور مدد سے غافل نہ ہوں بلکہ اولیت زبان کو سیکھنے، پڑھنے اور لکھنے والوں کو دینے کی ضرورت ہے۔ مگر ''اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ'' اور ادب کے فروغ کے نام پر سمیناروں کے انعقاد اور کتابوں کی اشاعت میں محنت کم اور یافت زیادہ ہوتی ہے۔ موجودہ صورتِ حال میں زبان و ادب کے فروغ پر ہونے والے جلسوں اور کانفرنسوں میں باتیں اچھی ہوتی ہیں۔ ضیافت بھی مناسب ہوتی ہے مگر ٹیوب ویل سے نکلنے والا پورا پانی کھیت تک نہیں پہنچ پاتا کیونکہ کھیت تک پہنچنے والی نالی یا پائپ کے سوراخوں کے باعث ایک حصہ اپنی منزل مقصود سے قبل ضائع ہوجاتا ہے۔ اس کے تدارک کی کوشش فائدہ مند ہوگی (افراد کے لیے نہیں اردو کے لیے)

س11: کیا کلاسکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

جواب: کلاسیکی ادب اور جدیدیت کی گفتگو سے ذہنی اور فکری ورزش تو ہوسکتی ہے اردو زبان کی تدریس اور ابتدائی تعلیم کو کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ زبان کے تحفظ اور فروغ کے لیے مخلص اردو اساتذہ کی ضرورت ہے۔

س13: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

جواب: مئوناتھ بھنجن شہر اور ضلع مئو کے قصبات میں درجن بھر سے زیادہ اردو لائبریریاں ہیں جن میں موجود کتابوں سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد بتدریج کم ہوتی جارہی ہے۔ اخبار خواں حضرات کی تعداد میں اگر اضافہ نہیں ہورہا ہے تو کیا ان کی تعداد ماضی کی طرح

ادب کی تخلیق اور زبان کی ترقی و نشو و نما میں توازن ضروری ھے۔ جڑ خشک اور کمزور ھوتی جائے تو شجر کی شادابی کے ختم ھوجانے اور درخت کے رفتہ رفتہ خشک ھوجانے کو روکا نھیں جاسکتا۔ پتوں پر پانی کے چھڑکاؤ سے درخت کی زندگی بچائی نھیں جاسکتی اس لیے اردو زبان کی تدریس خشت اوّل کا درجہ رکھتی ھے۔ ادب کے قاری کا ھونا ضروری ھے اور قاری کاوجود زبان کی تدریس، لکھنے پڑھنے اور اپنانے پر منحصر ھے۔ ابتدائی مرحلے یا نچلی سطح سے اردو زبان کو سیکھنے پڑھنے لکھنے اور اپنانے والے نہ پیدا ھوں گے تو رفتہ رفتہ قاری ناپید ھوسکتے ھیں اور تب ادب یا ادب عالیہ اپنے وجود کو نہ محفوظ رکھ سکتا ھے اور نہ زندہ۔

اطمینان بخش ہے۔ ان لائبریوں میں 'انقلاب'، 'راشٹریہ سہارا'، 'آگ' اور 'وارثِ اودھ' اخبارات پڑھے جاتے ہیں۔ چند ادبی اور مذہبی جرائد بھی آتے ہیں۔

س14: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کررہے ہیں؟

جواب: 'انجمن ترقی اردو' اور 'اردو رابطہ کمیٹی' کی سرگرمیاں ماضی کی داستان بن چکی ہیں۔ گزشتہ ایک دہائی سے 'اردو پڑھاؤ تحریک' شہر اور نواحی قصبات میں محدود پیمانے پر ہی سہی سرگرم ہے۔ اردو کی تعلیم اور اخبارات کی خریداری نیز عوامی جگہوں اور تقاریب کے دعوت نامے اردو میں لکھے جانے کی طرف متواتر راغب کررہی ہے۔ اردو انجمنیں شعرگوئی کے لیے بزم آراستہ کرتی ہیں جہاں شعرفہمی کے ساتھ زبان و ادب کی گفتگو کا سلسلہ قائم ہے۔

س15: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

جواب: اردو شعر و ادب سے وابستہ مرحوم اور موجود شخصیات کو صوبائی اردو اکیڈمی، فخرالدین میموریل کمیٹی کی جانب سے کتابوں پر انعام یا کتابوں کی اشاعت کے لیے جزوی مالی تعاون ملتا رہا ہے۔ فضا ابن فیضی، اثر انصاری اور نیر اعظمی جیسے مرحوم شعرائے کرام کے فکر و فن پر یونیورسٹی کی سطح پر تحقیقی کام ہوچکے ہیں۔ ساہتیہ اکادمی

سطح یا مجموعی خدمات کی سطح کا کوئی اعزاز کسی کو نہیں ملا۔

س17: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

جواب: اردو زبان کے فروغ سے متعلق چند باتیں قابل توجہ ہیں۔ اول یہ کہ جن خطوں اور شہروں میں اردو کی ابتدائی تعلیم کا مکمل اور وسیع انتظام ہے ان کی طرف بھی نظر عنایت کی ضرورت ہے۔ مئوناتھ بھنجن شہر اور ضلع مئو کے قصبات گھوسی، چریاکوٹ، ادری، کوپاگنج، خیرآباد، محمد آباد گوہنہ اور پورہ معروف میں مکتب اور مدرسوں میں اردو تعلیم کا مکمل انتظام ہے۔ ایک درجن سے زیادہ مدارس سے ملحق بوائز اور گرلس انٹر کالج اور ڈگری کالج ہیں۔ تعلیم نسواں کا اتنا منظم نٹ ورک کم ملے گا۔ میں نے جملہ مدارس اور ان سے ملحق تمام ادارہ جات سے رابطہ کر کے یہ تعداد دریافت کی ہے کہ پورے ضلع میں تقریباً پچاس ہزار بچے بچیاں مدرسوں اسکولوں اور کالجوں میں زیر تعلیم ہیں۔ تقریباً چالیس ہزار کی تعداد میں بچے بچیاں ابتدائی سے اعلیٰ، سطح تک اردو اور اردو ذریعہ تعلیم کی بدولت علم حاصل کر رہے۔ خاص طور پر عالمیت اور فضیلت کے درجات میں ملک کے دیگر صوبوں کے طلبہ اور طالبات ہوسٹل میں رہ کر تعلیم حاصل کرتے ہیں اور فراغت کے بعد ان میں سے ایک معتد بہ تعداد کسی نہ کسی صورت میں اردو کے فروغ میں معاون بنتی ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ ان مدارس کے اساتذہ یا ذمہ داران میں سے بھی اردو اکادمی یا اردو سے متعلق نصابی یا دیگر کمیٹیوں میں رکن بنا کر نمائندگی دی جائے ان سے زمینی حقائق معلوم کر کے اردو کے فروغ کی کوششوں میں مدد لی جائے۔ اگر مدرسے اردو طلبہ و طالبات کی کھیپ نہ پیدا کریں تو یونیورسٹیوں کے اردو شعبے میں سناٹا بڑھتا جائے گا۔ المیہ یہ ہے کہ جو حلقہ گریجویشن کی سطح پر اردو کی تدریس سے وابستہ ہے وہی اردو کا اصل نمائندہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ انہیں اردو خدمت گزاروں پر توجہ کی ضرورت ہے جو معمولی تنخواہ پر مدرسوں سے وابستہ ہیں اور اردو کی جڑوں کی آبیاری کر رہے ہیں مگر درخت جب ثمر آور ہوتے ہیں تو یہ حضرات صرف ان کی شکل دیکھ پاتے ہیں۔ پھل میں ان کا بھی کچھ حصہ ہونا چاہیے۔

س19: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟

جواب: دوسری علاقائی زبانوں کے ساتھ اردو کا رشتہ تہذیبی سماجی اور فکری ہے۔ ہمارے مسائل میں خاصی مماثلت بھی ہے اس کے باوجود ہمارا دائرہ کار قدرے مختلف ہونے کے ساتھ باہم قدم ملا کر چلنے کا ہے۔ تعلیمی اداروں میں منعقد ہونے والے طلبہ و طالبات کے تعلیمی ثقافتی اور علمی مباحث میں اردو تخلیق کاروں اور ان کے شاہکاروں کو بھی متعارف کرایا جاسکتا ہے۔ ڈرامے اشعار یا کہانیوں کے ذریعے علاقائی زبانوں کے خطوں میں یہ کام اردو زبان اور اس کے ثقافتی اور فکشن سرمائے سے متعارف ہونے کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ علمی اور ادبی سطح پر بھی دیگر علاقائی زبانوں کے تخلیق کاروں کے ساتھ ہر سطح پر اسٹیج شیئر کرنا مفید ہوگا۔ ان زبانوں میں اردو کتابوں کے اور تخلیقات کے ترجمے کا سلسلہ جاری ہے اس کو مزید توانائی ملنی چاہیے۔ اگر خدانخواستہ کوئی علاقائی زبان یا اس کے ارباب علم اردو سے بے اعتنائی برتیں پھر بھی اردو والوں کو وسیع القلبی اور وسیع المشربی کے ساتھ ان کے ساتھ قدم ملا کر انھیں اپنے سے قریب کرنے کا راستہ اپنانا چاہیے۔

س20: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

جواب: اردو میرے اجداد کی زبان اور ہم سبھی کی مادری زبان ہے۔ میری تین اولادیں ہیں: ایک بیٹا اور دو بیٹی۔ میں نے تینوں کو مساوی تعلیم دلائی۔ تینوں نے اردو میں ماسٹر ڈگری حاصل کی۔ ماشاء اللہ تینوں ٹیچر ہیں۔ ان کی اولادیں یعنی میرے پوتی، پوتے، نواسی اور نواسے جو تعلیم کی عمر کو پہنچ چکے ہیں ایک مضمون کی حیثیت سے بھی اردو پڑھ رہے ہیں۔

س21: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

جواب: اس لیے میں مطمئن ہوں کہ میرے کنبے میں اردو ان شاء اللہ نسل در نسل زندہ رہے گی۔ میری ذاتی لائبریری کی تقریباً دو ہزار کتابوں اور رسائل کے خاص نمبر کے یہی وارث ہوں گے۔ اس کی حفاظت کریں گے، استفادہ کریں گے۔ 'راشٹریہ سہارا' اور 'آگ' اخبارات کے علاوہ 'اردو دنیا'، 'ایوان اردو'، 'کتاب نما' اور 'تذکیر'، 'گلبن' کا خریدار ہوں چند رسائل کو مجبوراً بند کرنا پڑا کیونکہ بار بار شکایت کے باوجود محکمۂ ڈاک میری ڈاک میرے گھر تک پہنچا سکا۔

س23: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

جواب: ضلع مئو میں کوئی یونیورسٹی نہیں۔ ضلع کے 148 ڈگری اور پوسٹ گریجویٹ کالجوں میں سے تقریباً ایک تہائی میں اردو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاری ہے۔ ان کالجوں میں سے بیشتر میں طلبہ و طالبات کی تعداد اطمینان بخش ہے۔ اگر کسی مجبوری یا حالات کی ستم ظریفی کی وجہ سے طالب علم ہائی اسکول یا انٹرمیڈیٹ میں اپنی اسٹریم کی وجہ سے اردو نہ لے سکا اور آرٹ اسٹریم میں جانے پر مجبور ہوگیا تو وہ بھی گریجویشن کی سطح پر اردو مضمون لے لیتا ہے کیونکہ انگلش میڈیم اسکولوں میں چند میں کلاس آٹھ تک اردو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔

س25: سینٹرل اسکولوں اور نو ودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

جواب: سائنس اور کامرس اسٹریم کے بچوں کے لیے اردو میں مواقع کم نظر آتے ہیں اس لیے ان اسکولوں میں اردو خواں طلبہ و طالبات کی کمی کی وجہ سے اردو تعلیم کا نظام نہ ہوسکا۔ ان اسکولوں میں داخلہ لینے والے بچے بچیاں ابتدائی چند درجات کے بعد اردو پڑھنا بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ اس لیے اسکول کے ساتھ اردو والے بھی ذمے دار ہیں۔

اردوزبان کے فروغ سے متعلق چند باتیں قابل توجہ ہیں۔ اول یہ کہ جن خطوں اور شہروں میں اردو کی ابتدائی تعلیم کا مکمل اور وسیع انتظام ہے ان کی طرف بھی نظر عنایت کی ضرورت ہے۔ مئوناتھ بھنجن شہر اور ضلع مئو کے قصبات گھوسی، چریاکوٹ، ادری، کوپاگنج، خیرآباد، محمد آباد گوہنہ اور پورہ معروف میں مکتب اور مدرسوں میں اردو تعلیم کا مکمل انتظام ہے۔ ایک درجن سے زیادہ مدارس سے ملحق بوائز اور گرلس انٹرکالج اور ڈگری کالج ہیں۔ تعلیم نسواں کا اتنا منظم نٹ ورک کم ملے گا۔ میں نے جملہ مدارس اور ان سے ملحق تمام ادارہ جات سے رابطہ کرکے یہ تعداد دریافت کی ہے کہ پورے ضلع میں تقریباً پچاس ہزار بچے بچیاں مدرسوں اسکولوں اور کالجوں میں زیرتعلیم ہیں۔ تقریباً چالیس ہزار کی تعداد میں بچے بچیاں ابتدائی سے اعلیٰ، سطح تک اردو اور اردو ذریعۂ تعلیم کی بدولت علم حاصل کررہے۔

■

Dr. Shakil Ahmad
Qasmi Manzil, Domanpura Chungi
P.O: Maunath Bhanjan - 275101 (UP)
Mob:9236722570
Email: dr.shakil.mau@gmail.com

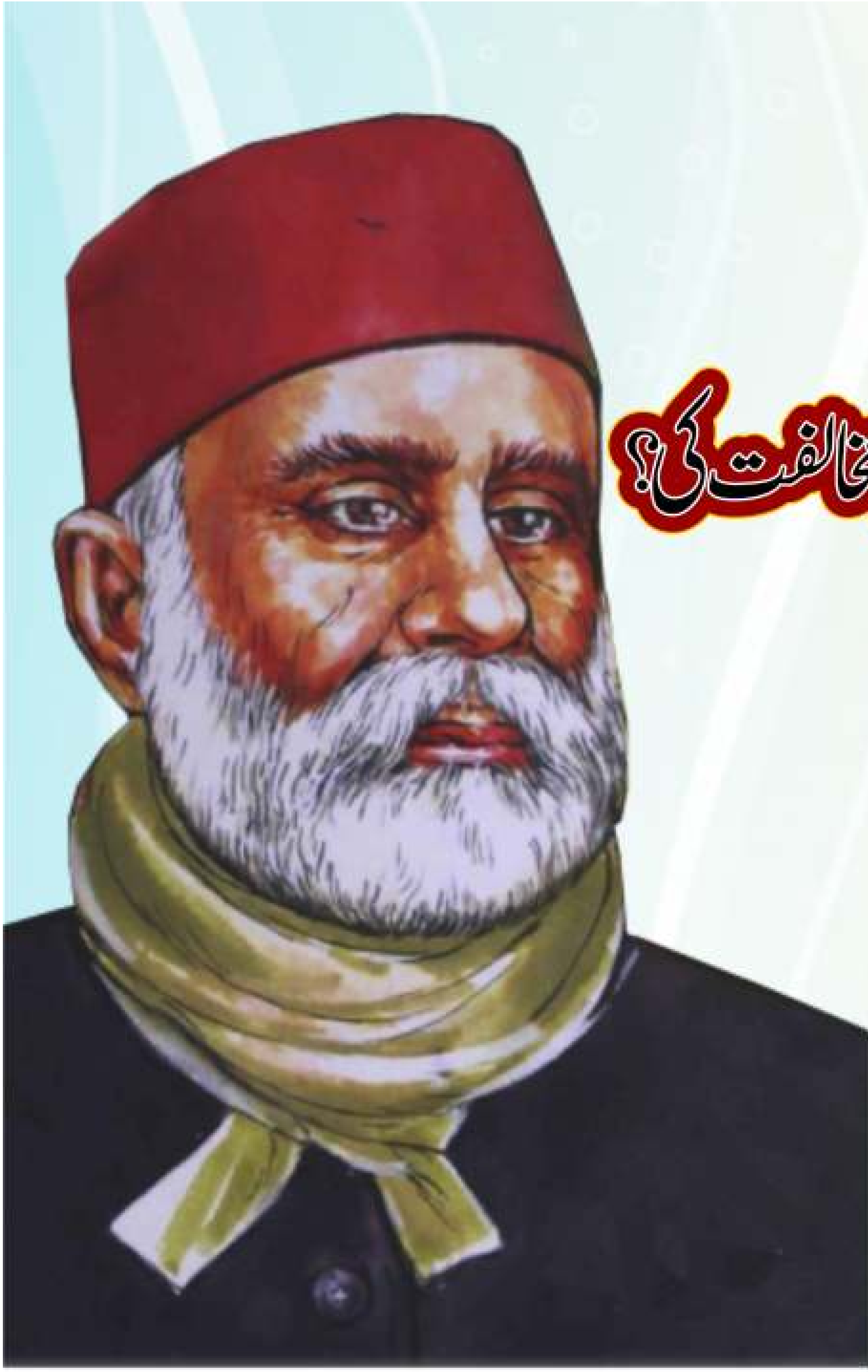

سید تقی عابدی

کس کس نے حالی کی مخالفت کی؟

حالی کے دوست بے شمار تھے لیکن دشمنوں اور مخالفوں کی کمی بھی نہ تھی۔ ان کے مخالفین میں مذہبی غیر مذہبی اور دوست نما دشمن شامل تھے۔ حالی کی مخالفت کی ایک خاص وجہ ان کی سر سید سے دوستی، علی گڑھ تحریک سے وابستگی اور سر سید کی سوانح، حیات جاوید کی تصنیف تھی۔ ہماری اس تحریر میں چند پردہ نشین مردوں کے نام بھی آئیں گے جو ظاہراً دوستی کا دم بھرتے تھے لیکن ان کے دل حالی سے صاف نہ تھے بقول میر انیس ”میں نے تو ایک دل بھی نہ دیکھا جو صاف ہو۔“ حالی کی مخالفت ادیبوں اور شاعروں کا مرغوب مشغلہ تھا۔ اگر چہ سر سید، شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد اور علامہ اقبال کی طرح حالی پر کفر کا فتویٰ نہیں لگایا گیا مگر حالی کی شخصیت اور فن کو مسلسل نشانہ بنایا گیا۔ حالی کے دور کے سیاہ اوراق آج بھی موجود ہیں۔ مذہبی لوگ حالی کو سر سید کی بانسری اور نیچری کہتے تھے۔ حالی نے جو اُردو شاعری کی پاکیزگی کی مہم کو اپنا شعار بنایا تھا وہ بہت سے شاعروں اور ادیبوں کو کھلتا تھا کیونکہ وہ حالی کو اہل دِلّی اور لکھنؤ نہیں مانتے تھے وہ حالی کو پانی پت کا ایک معمولی شاعر جانتے تھے۔ ”دِلّی دِلّی کیسی دِلّی = پانی پت کی بھیگی بلی“

حالی کی مخالفت ان کی موضوعاتی نظموں سے شروع ہو چکی تھی۔ مسدس حالی کی عوام میں پذیرائی ان کے مخالفین کے لیے خطرے کی گھنٹی محسوس ہو رہی تھی جو فن برائے فن وہ بھی بطور تفنن کے قائل تھے۔ حالی ایسی شاعری کو عفونت میں سنڈاس سے بدتر بتا رہے تھے اور ایسے شاعروں کی موجودگی یا غیر موجودگی سے متاثر نہ تھے جیسا کہ انھوں نے مسدس میں اعلانیہ کہا تھا۔

ہجرت جو کر جائیں شاعر ہمارے
کہیں مِل کے خس کم جہاں پاک سارے

مقدمہ شعر و شاعری میں چوما چاٹی کی شاعری پر شدید ردعمل نے لکھنؤ اور دِلّی کے رومانی شعرا کو حالی کے مقابل کر دیا۔ درجنوں حالی کو دشنام اور نازیبا خطوط ملنے لگے۔ مختلف روزنامے اور رسالے مستقل طور پر حالی کے خلاف صف آرا ہو گئے جن میں حسرت موہانی کا اُردوئے معلّیٰ اور سجاد حسین لکھنوی کا اودھ پنچ پیش پیش تھے۔ حالؔی کے خلاف سوقیانہ ہجو لکھی جانے لگیں۔ اودھ پنچ کے سرورق پر کئی سال تک یہ شعر چھپتا رہے۔

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدانِ پانی پت کی طرح پائمال ہے

حالی کو خالی، جعلی، مالی، خیالی اور ڈفالی جیسے ناموں سے یاد کیا جانے لگا۔ لکھنؤ اور دِلّی کے اہل زبان کہتے تھے یہ پانی پتی شخص کس جرات سے اہل زبان کے ہم زبان ہی نہیں بلکہ مسیحائے زبان ہونے کی کوششیں کر رہا ہے۔ حالی ان تمام حملات کا خاموشی سے جواب دے رہے تھے اور ہمہ تن دن رات چمنستان شعر کی پاکیزگی میں مصروف تھے۔

اردو دنیا اور دنیائے ادب کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں معاصرین پر تخریبی تنقید نظر آتی ہے جیسے والٹیر کا حملہ شیکسپیئر پر گٹے کا حملہ ڈانٹے پر رشید وطواط کا حملہ خاقانی پر، فرخی کا حملہ فردوسی پر احراری کا حملہ سعدی پر، سودا کا حملہ میر پر شیفتہ کا حملہ نظیر پر رجب علی بیگ کا حملہ میر امن پر وغیرہ۔ چنانچہ ہر ادب اور ہر دور میں تخریبی تنقید نظر آتی ہے۔ یہاں ہم حالی کے چند معاصرین کی

معاندانہ تنقید کو مستند حوالوں سے درج کرتے ہیں۔

حسرت موہانی اُردوئے معلّیٰ میں حالی پر سخت اعتراضات کرتے تھے۔ ایک اسی قسم کا واقعہ تذکرہ حالی میں شیخ اسماعیل پانی پتی نے یوں لکھا ہے:

''علی گڑھ کالج میں کوئی عظیم الشان تقریب تھی۔ نواب محسن الملک کے اصرار پر مولانا حالی بھی اس میں شرکت کے لیے تشریف لائے اور حسب معمول سید زین العابدین مرحوم کے مکان پر فروکش ہوئے۔ ایک صبح حسرت موہانی دو دوستوں کے ساتھ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چندے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوا کیں۔ اتنے میں سید صاحب موصوف نے بھی اپنے کمرے میں سے حسرت کو دیکھا۔ اُن میں لڑکپن کی شوخی اب تک باقی تھی۔ اپنے کتب خانے میں گئے اور اُردوئے معلّیٰ کے دو تین پرچے اُٹھا لائے۔ حسرت اور اُن کے دوستوں کا ماتھا ٹھنکا کہ اب خیر نہیں۔ اور اُٹھ کر جانے پر آمادہ ہوئے مگر زین العابدین کب جانے دیتے تھے۔ خود پاس بیٹھ گئے۔ ایک پرچے کے ورق الٹنا شروع کیے اور مولانا حالی کو مخاطب کرکے حسرت اور اُردوئے معلّیٰ کی تعریفوں کے پل باندھ دیے..... کسی کسی مضمون کی دو چار سطریں پڑھتے اور واہ خوب لکھا ہے کہہ کر داد دیتے....... حالی بھی ہوں، ہاں سے تائید کرتے جاتے تھے .... اتنے میں سید صاحب مصنوعی حیرت بلکہ وحشت کا اظہار کرکے بولے:

''ارے مولانا یہ دیکھیے آپ کی نسبت کیا لکھا ہے اور کچھ اس قسم کے الفاظ پڑھنا شروع کیے۔ سچ تو یہ ہے کہ حالی سے بڑھ کر مخرب زبان کوئی نہیں ہوسکتا اور وہ جتنی جلدی اپنے قلم کو اُردو کی خدمت سے روک لیں اُتنا ہی اچھا ہے۔ فرشتہ منش حالی ذرا مکدر نہیں ہوئے اور مسکرا کر کہا تو یہ کہا کہ نکتہ چینی اصلاح زبان کا بہترین ذریعہ ہے اور یہ کچھ عیب میں داخل نہیں۔''

کئی روز بعد ایک دوست نے حسرت سے پوچھا اب بھی حالی کے خلاف کچھ لکھو گے؟ جواب دیا جو کچھ لکھ چکا اُسی کا ملال اب تک دل پر ہے۔ حالی کا یہ ضبط، وقار اور عالی ظرفی بڑے بڑے مخالفوں کو شرمندہ اور نکتہ چینوں کو پشیمان کر دیتی تھی۔''

جب حالی کی شہکار کتاب 'حیات جاوید' شائع ہوئی تو شبلی نعمانی نے اس کی سخت مخالفت کی۔ مولوی عبدالحق 'چند ہم عصر' میں لکھتے ہیں۔ جب میں حیات جاوید کا ایک نسخہ ان کو دیا تو دیکھتے ہی فرمایا۔ ''یہ کذب وافترا کا آئینہ ہے'' یہ جملہ سن کر عبدالحق دم بخود رہ گئے کیوں کہ پڑھنے سے پہلے ایسی سخت رائے کیا معنیٰ رکھتی تھی۔

شبلی حبیب الرحمٰن خان شیروانی کے خط میں حیات جاوید کو کتاب المناقب لکھتے ہیں۔ ایک اور خط میں شیروانی کو لکھتے ہیں وہ محض دعوے کرتے ہیں واقعات کی شہادت پیش نہیں کرتے بہر حال میں حیات جاوید کو مدلل مدّاحی سمجھتا ہوں۔

شبلی اپنے شاگرد عبدالسمیع کو حیات جاوید پر منفی ریویو کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔ ''میں کچھ مزید نہیں کہنا چاہتا تم مقلد نہیں مجتہد ہو پھر تقلید کیوں؟''

اب آئینہ کا دوسرا رخ حالی کا کریکٹر دیکھیے جسے عبدالحق نے اپنی کتاب چند ہم عصر میں دکھایا ہے۔

''ایک روز مولوی ظفر علی خاں مولانا حالی سے ملنے آئے اس زمانے میں وہ دکن ریویو نکالتے تھے کچھ عرصہ پہلے اِس رسالے میں ایک دو مضمون مولانا شبلی کی کسی کتاب یا رسالے پر شائع ہوئے تھے ان میں کسی قدر بے جا شوخی سے کام لیا گیا تھا۔ مولانا نے اس کے متعلق ظفر علی خاں صاحب سے ایسے شفقت آمیز پیرائے میں نصیحت کرنی شروع کی کہ ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور سر جھکائے آنکھیں نیچی کیے چپ چاپ سُنا کیے۔ مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ میں تنقید سے منع نہیں کرتا، تنقید بہت اچھی چیز ہے اور اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گے تو ہماری اصلاح کیوں کر ہوگی لیکن تنقید میں ذاتیات سے بحث کرنا یا ہنسی اُڑانا منصب تنقید کے خلاف ہے۔''

وحید الدین سلیم پانی پتی جنھیں حالی نے دنیائے اُردو میں معروف کیا وہ بھی حیات جاوید کے بارے میں صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کو لکھتے ہیں۔'' حالی نے دیباچہ میں جس امر کا وعدہ کیا ہے اس کو وہ ایک شمہ بھی پورا نہیں کر سکے۔ جہاں انھوں نے سرسید کی تفسیر کی بحث کی ہے یہ کہتے ہوئے کہ بحث طولانی ہو جائے گی ادھورا چھوڑ دیا ہے۔''

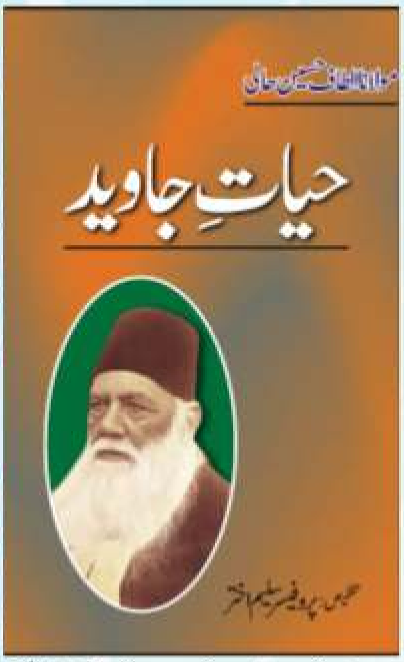

بقول رشید حسن خان کہ حالی کو غالب کے بہت واقعات کا علم تھا وہ اگر اپنے طور پر ان کو لکھتے تو بعض ایسی باتیں ضرور بیان میں آجاتیں جو ان کے نزدیک وضاحت طلب نہیں تھیں۔ اس اُلجھن اور اس کشمکش سے چھٹکارا حاصل کرنے کا یہ طریقہ انھوں نے اختیار کیا کہ بعض اہم واقعات کے بیان میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے خود مرزا صاحب کے بیانات کو نقل کردیا اس طور سے سوانح نگار کی حیثیت سے ان کے کسی بیان کا جائزہ نہیں لیا اس طریقۂ کار نے کئی واقعات کی واقعی شکل وصورت کو سامنے آنے نہیں دیا۔''

سچ تو یہ ہے کہ لعن وطعن، گالی وشنام، طنز واعتراضات کے طوفان کو حالی نے ایک نرالے طریقے سے زیر کیا۔

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا اُنھوں پر ہم نے دم نہ مارا

لیکن جیسا ہمیشہ ہوتا آیا ہے مخالفت کا یہ طوفان جو خس و خاشاک کی کائنات تھا، جلد ہی دب گیا اور حالی کی عظمت اور شان اپنی جگہ قائم رہی۔ ''غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں''

اُردو تنقید پر یہ بھی الزام لگایا جاتا ہے کہ اس کے ناقدین عموماً سکے کے دو رخ پیش نہیں کرتے یا تو سراسر مدح ہوگی یا پھر ہر لفظ میں ذم وقدح کا پہلو ہوگا۔ حالی کی

حالی کو غالب کے بہت واقعات کا علم تھا وہ اگر اپنے طور پر ان کو لکھتے تو بعض ایسی باتیں ضرور بیان میں آجاتیں جو ان کے نزدیک وضاحت طلب نہیں تھیں. اس الجھن اور اس کشمکش سے چھٹکارا حاصل کرنے کا یہ طریقہ انہوں نے اختیار کیا کہ بعض اہم واقعات کے بیان میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے خود مرزا صاحب کے بیانات کو نقل کردیا اس طور سے سوانح نگار کی حیثیت سے ان کے کسی بیان کا جائزہ نہیں لیا اس طریقۂ کار نے کئی واقعات کی واقعی شکل و صورت کو سامنے آنے نہیں دیا.

حیات جاوید پر اعتراض کرتے ہوئے شبلی نعمانی نے کہا تھا یہ کتاب المناقب ہے مدلل مداحی ہے جب کہ خود شبلی نے جب موازنہ انیس و دبیر لکھا تو انیس کی مداحی اور دبیر کی قداحی لکھی۔ حالی نے اپنی تینوں سوانح عمریوں میں یعنی حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید ان تینوں بزرگوں کی مدحت آرائی کی ہے اور خود اس بات کا اقرار بھی کیا ہے کہ ابھی برصغیر میں کریٹکل بیوگرافی کا وقت نہیں آیا ہے۔ ہم کہتے ہیں حالی سے تسامح ہوا ہے اگر وہ تذکرے دیکھ لیں تو معلوم ہوگا کہ تذکرہ نویس نے کس طرح تخلیق کار کی شخصیت اور تخلیق کا ناحق خون کیا ہے۔ کیا حالی کے استاد مصطفیٰ خان شیفتہ نے نظیرا کبرآبادی کے ساتھ ظلم نہیں کیا؟ کیا گلشن بے خار خارداری کی وجہ سے گلشن بے کار نہیں ہوا؟ اصلی تخلیق کار ایک پہاڑ ہوتا ہے اگر ناقد اس سے سر ٹکرائیں تو سر پھوٹتا ہے پہاڑ نہیں ٹوٹتا۔ ہم نے حالی کی شاعری اور ان کے نثری کلام پر ناقدین کے دونوں رخ پیش کرنے کی کوششیں کی ہے۔ جن نقادوں نے رسمی طور پر ایک دو جملے تعریف کے لکھ کر منفی باقی کا دفتر کھولا ہے جس میں انصاف سے کام لینے کے بجائے ذاتی فکر و تجربہ سے اخذ کردہ تنقیص اور ذم کا پہلو دکھایا گیا ہے جو علمی عقلی اور منطقی حوالوں سے ثابت نہیں ہوسکتا ہے۔ ان ناقدین میں احسن فاروقی، وحید قریشی اور کلیم الدین احمد سرفہرست ہیں۔ ان ناقدوں نے نوک خار سے گل تخلیق کو تار تار کرنے کی ناکام کوششیں کی ہے۔

حالی کے منظوم اور نثری کلام پر کئی تبصرہ نگاروں نے کلیم الدین احمد کے تند و تیز جملے نقل کیے جنھیں بعض مقامات پر توڑ موڑ کر کچھ جوڑ کر اور کچھ چھوڑ کر اسی طرح بیان کیا کہ مسائل پر پوری روشنی نہیں پڑ سکی اس لیے ہم کلیم الدین احمد کے ایک طویل مضمون حالی سے جو ان کی کتاب 'اردو تنقید پر ایک نظر' میں شامل ہے، اقتباسات بغیر کسی متن کی تحریف کے یہاں لکھ کر حالی کے مقدمہ اور شعر و شاعری کے بارے میں ان کا نظریہ پیش کر رہے ہیں جہاں وہ حالی کی معمولی سی مغربی شاعری اور تنقید کی سہل انگاریوں یا ان سے واقفیت کو جرم سنگین بتا کر ان کی شخصیت اور تصنیف کا بہیمانہ قتل کرتے ہیں۔ ان کی تنقید دیکھ کر یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ انھوں نے حالی کے تمام تر کلام کا مطالعہ کیا ہے۔

کلیم الدین احمد حالی کو اُردو تنقید کا بانی، اُردو کا بہترین ناقد جن کی نثر بلند پایہ ہے بتاتے ہیں۔

''اُردو تنقید کی ابتدا حالی سے ہوتی ہے۔ 'پرانی تنقید' محذوف و مقصود کے جھگڑوں، زبان و محاورات کی صحت اسناد کی ہنگامہ آرائی تک محدود تھی۔ حالی نے سب سے پہلے جزئیات سے قطع نظر کی اور بنیادی اصول پر غور و فکر کیا۔ شعر و شاعری کی ماہیت پر کچھ روشنی ڈالی اور مغربی خیالات سے استفادہ کیا۔ اپنے زمانہ، اپنے ماحول اپنے حدود میں حالی نے جو کچھ کیا وہ بہت تعریف کی بات ہے۔ وہ اُردو 'تنقید' کے بانی بھی ہیں اور اُردو کے بہترین نقاد بھی ہیں یہاں جو کچھ لکھا جائے گا اس سے حالی کی تحقیر مقصود نہیں۔ ان کی تاریخی اہمیت اظہر من الشمس ہے۔ ان کی نثر بلند پایہ ہے، ان کا خلوص زبردست ہے۔''

پھر لکھتے ہیں:

''شعر و شاعری کی اہمیت کا صحیح اندازہ حالی کے بس کی بات نہیں وہ کہتے ہیں ''شعر کی مدح و ذم میں بہت کچھ کہا گیا ہے اور جس قدر اس کی مذمت کی گئی ہے وہ بہ نسبت مدح کے زیادہ قرین قیاس ہے۔'' وہ افلاطون کے ہم خیال ہیں اور شاعری کو غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ یوں کہتے ہیں کہ شاعری کا ملکہ بے کار نہیں ہے لیکن ان کے خیال میں شاعری محض تفریح طبع کا ذریعہ ہے۔ شاعری کوئی دلچسپ کھیل نہیں، وہ تو انسان کی بہترین دماغی تحریکات کا آئینہ ہے۔ اس سے کامل سکون، ایک ابدی سرور ملتا ہے جو اور کسی چیز سے نہیں ملتا اور نہ مل سکتا ہے۔ یہ بہترین فن ہے جس کی برابری کوئی دوسرا فن نہیں کر سکتا ہے۔ اس کا مقام سائنس اور فلسفہ سے بھی بلند ہے بعض نقاد تو یہاں تک کہتے ہیں کہ مستقبل میں مذہب کی جگہ لے لے گی۔ افسوس ہے تو یہیں کہ آج بھی یہ کہنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ شاعری تفنن طبع کا ذریعہ نہیں۔ اس کے آئینہ میں مادّی اور روحانی دنیا اور اس دنیا کے بنیادی اور پائیدار قوانین کا صاف، مکمل اور پرسکون عکس ملتا ہے حقیقت اور اس کی پراسرار کارفرمائیاں اسی آئینہ میں اپنی جھلک

دکھاتی ہیں۔ اس نقطۂ نظر کی حالی کو خبر نہ تھی وہ شعر و شاعری کی اہمیت اور قدر و قیمت سے واقف نہ تھے اسی لیے دوسروں کو ان چیزوں سے آگاہ کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔

جس شخص نے بھی حالی کا مقدمہ پڑھا ہے ان کے مسدس کا مطالعہ کیا ہے ان کی نظموں کا تاثیری اثر جذب کیا ہے کیا وہ کلیم الدین احمد کے ان گول مٹول جملوں سے مرعوب ہوسکتا ہے۔

شعر کی تاثیر کو ثابت کرنے کے لیے جو مثالیں حالی نے دی کیا وہ آج بھی ضرب المثل نہیں ہیں۔ یہاں کون نا سمجھ ہے ذیل کی عبارت پڑھ کر فیصلہ کیا جاسکتا ہے:

''شعر کی تاثیر کو ثابت کرنے کے لیے وہ بہت سی مثالیں بھی دیتے ہیں۔ چھ مثالوں سے ان کی ناسمجھی ظاہر ہوتی ہے لیکن اس ناسمجھی سے قطع نظر یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ جس تاثیر کا وہ ذکر کرتے ہیں وہ اہم نہیں۔ شعر کا مقصد جذبات کو بھڑکانا نہیں ہے۔ شاعری جذبات کی تعلیم و تربیت کرتی۔ انھیں برانگیختہ نہیں کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری کا اثر ہنگامی نہیں پائدار ہوتا ہے۔ اس سے ہماری روحانی، جذباتی اور جسمانی زندگی خوشگوار ہو جاتی ہے۔ اچھے شعر جذبات کو بھڑکاتے نہیں ہیں اور جو شعر جذبات کو بھڑکاتے ہیں وہ اچھے نہیں ہوتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ حالی کا معیار مادی ہے۔ وہ شعر کو زیادہ اہم نہیں سمجھتے ہیں۔ اس غلط فہمی کا سبب یہی مادی معیار ہے وہ شعر کی تاثیر اور اس کے فائدہ کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس خوش فہمی کا سبب بھی یہی مادی معیار ہے۔

شعر کی ماہیت سے بھی وہی بے خبری ہے جو شعر کی اہمیت سے تھی۔ حالی صرف میکولے کا قول نقل کرتے ہیں۔ میکولے کی نقاد کی حیثیت سے کوئی وقعت نہیں۔ اس کے قول کی بھی کوئی خاص اہمیت نہیں میکولے کے خیال میں (اور یہ خیال بھی ماخوذ ہے) شاعری ایک قسم کی نقالی ہے۔ یہ نقالی فن مصوری یا نقاشی کے مقابلہ میں نامکمل ہے لیکن اس کی دنیا وسیع ہے۔ ''خصوصاً انسان کا بطون صرف شاعری ہی کی قلمرو ہے۔''

میکولے کا یہ قول بھی صحیح نہیں کہ ''نقالی فنی مصوری یا نقاشی کے مقابلہ میں نامکمل ہے۔'' اگر آنکھوں کی تسکین کو معیار سمجھا جائے تو اس قول میں صحت ہوسکتی ہے لیکن آنکھوں اور کانوں کی تسکین کو کامل تسکین نہیں سمجھ سکتے ہیں۔ یہ تسکین ادھوری سی ہوتی ہے۔ اس میں کچھ کمی محسوس ہوتی ہے۔ ہماری دماغی اور روحانی زندگی، ہمارے جذبات اور احساسات کو جو تسکین شاعری میں ملتی ہے، وہ کسی دوسرے فن لطیف میں نہیں ملتی اور نہ مل سکتی ہے۔

میکولے کو اس حقیقت کا احساس نہ تھا اور حالی میں بھی اس احساس کی کمی نظر آتی ہے۔

شاعری کے لیے جو شرطیں حالی ضروری سمجھتے ہیں وہ بھی سطحی اور کورانہ طور پر اخذ کی گئی ہیں۔ یہ شرطیں تین ہیں۔ تخیل، کائنات کا مطالعہ اور تفحص الفاظ۔

کلیم الدین احمد کولرج کے مقلد ہیں وہ میکولے کے قائل نہیں اس لیے تمام غصہ بیچارے حالی پر نکالتے ہیں۔ مغربی ناقدوں کے نظریات میں مشرقی نقاد کی طرح اختلاف رائے موجود ہے۔ تنقید کا کھیل دو اور دو چار نہیں ہوتا۔ اگر تخیل، کائنات کا مطالعہ اور تفحص الفاظ سطحی شرطیں ہیں تو پھر اصلی شرطیں کلیم الدین احمد کیوں بیان نہیں کرتے۔

''حالی نے مغرب سے استفادہ کیا۔ اس استفادے کا نتیجہ جو ہوا ظاہر ہے شاعر فطرت کی خصوصیات اور شاعری کی اہم صفات پر حالی کی پوری بحث پر مجموعی نظر ڈالتے ہوئے ہمیں یہ نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ جتنی زیادہ یہ بحث اہم ہے حالی اتنے ہی زیادہ اس پر طبع آزمائی کے لیے نااہل ہیں۔ جن علوم کی قابلیت اور جن فطری صلاحیتوں کی اس سلسلہ میں ضرورت تھی وہ ان میں نہ تھیں۔ وہ ایک بحر بیکراں میں بے خطر کود پڑے ہیں اور ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ مگر ان کا کود پڑنا اور ہاتھ پاؤں مارتے رہنا ہی اہم ہے ان کی تمام بحث کی یہ نوعیت ہے جیسے کہ کسی بڑی مکمل اور مربوط تصنیف میں سے کوئی طالب علم کوئی ادھر کی اور کوئی ادھر کی بات نوٹ کرے اور یہ سمجھے کہ وہ پوری کتاب پر حاوی ہوگیا۔''

افسوس یہ ہے کہ یہ حالی ہی تھے جنھوں نے اُردو ادب کو مغربی قدروں اور لٹریچر سے روشناس کروایا۔ اگر آزاد حالی نہ ہوتے تو کلیم الدین احمد کا وجود نہ ہوتا جنھیں یہ غصہ ہے کہ حالی اس مغربی دریا میں کیوں اترے اور اگر اترے تھے تو کیوں نہ پورا دریا پیرا کی کی۔ حالی نے کہیں یہ بات بالواسطہ یا بلاواسطہ نہیں کہی کہ انھیں نے مغربی لٹریچر پر عبور حاصل کیا وہ تو صرف مغربی قدروں کی نشان دہی اور مختصر تعارف کر کے چلے گئے۔ کلیم الدین احمد کہتے ہیں حالی فینسی اور امیجینیشن میں امتیاز نہیں کر سکتے لیکن جو تعریف انھوں نے لکھی ہے وہ بھی نامکمل اور ادھوری ہے۔ وہ کہتے ہیں اگر مقدمے کو خضر راہ سمجھیں تو ترقی ممکن نہیں۔

''افسوس کی بات ہے کہ آج جب لکھنے والوں کا مطمح نظر حالی کی طرح محدود نہیں جب وہ بہترین مغربی ادب۔ تنقیدی ادب سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود کسی نے بھی 'مقدمہ شعر و شاعری' سے بہتر تنقیدی کارنامہ پیش

افسوس یہ ہے کہ یہ حالی ہی تھے جنھوں نے اُردو ادب کو مغربی قدروں او رلٹریچر سے روشناس کروایا۔ اگر آزاد حالی نہ ہوتے تو کلیم الدین احمد کا وجود نہ ہوتا جنھیں یہ غصہ ہے کہ حالی اس مغربی دریا میں کیوں اترے اور اگر اترے تھے تو کیوں نہ پورا دریا پیرا کی کی۔ حالی نے کہیں یہ بات بالواسطہ یا بلاواسطہ نہیں کہی کہ انھیں نے مغربی لٹریچر پر عبور حاصل کیا وہ تو صرف مغربی قدروں کی نشان دہی اور مختصر تعارف کرکے چلے گئے۔ کلیم الدین احمد کہتے ہیں حالی فینسی اور امیجینیشن میں امتیاز نہیں کرسکتے لیکن جو تعریف انھوں نے لکھی ہے وہ بھی نامکمل اور ادھوری ہے۔ وہ کہتے ہیں اگر مقدمے کو خضر راہ سمجھیں تو ترقی ممکن نہیں۔

نہیں کیا۔ یہ خیال ہے کہ 'مقدمہ شعر و شاعری' اُردو میں بہترین تنقیدی کارنامہ ہے نہایت حوصلہ شکن ہے۔

حالی کے کلام کے تابوت پر کلیم الدین احمد نے آخری کیل یوں ماری۔

خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، فہم وادراک معمولی غور و فکر ناکافی تمیز ادنیٰ دماغ و شخصیت اوسط یہ تھی حالی کی کائنات۔ ہم صرف یہی کہیں گے کہ تنقید نگاری کو جذباتی نہیں ہونا چاہیے ورنہ اس کی ناقدانہ رائے قبول نہیں ہوتی۔ کلیم الدین احمد کی رائے کو اکثر اس لیے پیش کرتے ہیں کہ ان تمام عیوب کے باوجود حالی عمدہ ترین تنقید نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں اور مقدمہ شعر و شاعری علمی تنقید کی پہلی معتبر کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اگر مرغ یہ سمجھیں کہ اس کے ککڑکوں نہ کرنے سے سورج طلوع نہ ہوگا تو مرغ کی خوش فہمی ہے۔ اُردو تنقید کا کارواں اپنی ارتقائی منازل پر گامزن ہے۔

وارث علوی 'حالی مقدمہ اور ہم' میں لکھتے ہیں:

''نقاد جب حوالداروں کی طرح بات کرنا شروع کرتا ہے تو اس کا طرز گفتگو بھی کتنا غیر شریفانہ بن جاتا ہے۔ جوش تنقید میں انھیں یہ تک خیال نہیں رہتا کہ حالی جیسے نقاد پر قلم اٹھاتے وقت ہمیں آداب گفتگو کی پاسداری کرنی پڑتی ہے۔ حوالداری سے میرا کیا مطلب ہے اسے سمجھنے کے لیے محمد احسن فاروقی کے یہ جملے دیکھیے جو ان کے مقدمہ پر تنقید سے جستہ جستہ انتخاب کیے گئے ہیں:

''ایسی باتیں پڑھ کر تو یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ ایسا شخص کسی طرح شاعری کرنے اور شاعری پر رائے دینے کا اہل ہی نہیں ہوسکتا۔''

''اس اخلاق کی وکالت میں انھوں نے بڑے دھوکے کھائے ہیں اور تنقید نگاری کی بہت ہی غلط مثالیں قائم کی ہیں۔ اس کی بدترین مثال مقدمہ کا وہ حصہ ہے جس میں مراثی کی اخلاقی نوعیت کو واضح کیا گیا ہے۔''

''یہاں وہ تنقید نگاری کے نقطۂ نظر سے ایسا جرم کر رہے ہیں جس کی تلافی نہیں ہوسکتی۔''

''یہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم علم کس قدر پُر خطر ہوسکتا ہے۔''

''جتنی زیادہ یہ بحث اہم ہے، حالی اتنے ہی زیادہ اس پر طبع آزمائی کے لیے نااہل ہیں۔''

اگر احسن فاروقی مقدمہ کو ذرا غور سے پڑھتے تو حالی کا اسلوب نگارش انھیں آداب تنقید بھی سکھاتا۔ اس طرح کا طرز بیان صرف فاروقی تک محدود نہیں بلکہ کلیم الدین احمد کہیں مقدمے کی تعریف کرتے ہوئے حالی کی نثر کے بارے میں اُسے انفرادی خصوصیتیں عطا کرتے ہیں کہ حالی نے صاف اور سادہ طرز ایجاد کی لیکن اس طرز میں بے رنگی نہیں پھسپھا پن نہیں اس میں ایک لطافت ہے ایک جاذبیت ہے ایک رنگینی ہے اور یہ تنقیدی مسئلوں پر بحث کرنے کے لیے موزوں بھی ہے۔''

پھر حالی کی تنقید کے ہر جملے کو مغربی ترازو پر تولتے ہیں اور اس میں جو کچھ کم و کسر ہے اسی کو سب کچھ بتا کر فتوے صادر کرتے ہیں۔ کلیم الدین کا فیصلہ سنیے'' خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، فہم وادراک معمولی غور و فکر ناکافی تمیز ادنیٰ دماغ و شخصیت اوسط یہ تھی حالی کی کل کائنات۔''

وحید قریشی لکھتے ہیں:

''ادبی مسائل میں جہاں کہیں بھی دو بزرگوں میں اختلاف کا موقع آیا حالی اپنے اعتدال کا ترازو لے کر آگئے۔ حالی کی دکان داری کا یہ انداز ان کی صلح جو طبیعت کا ترجمان اور ان کی شخصیت پرستی کا آئینہ دار ہے۔ لیکن ان ہی دوراہوں پر ان کا تنقیدی نظام متزلزل نظر آتا ہے۔ شاعری شائستگی کے زمانے میں ترقی پاتی ہے یا ناشائستگی کے زمانہ میں اس پر انھوں نے مقدمے میں طویل بحث کی ہے۔ مشکل یہ تھی کہ ہر دو آرا مغرب سے آئی تھیں۔ جس کی پیروی کی انھوں نے قسم کھا رکھی تھی۔ مرحلہ نازک تھا لیکن فیصلہ قطعی، اس لیے دونوں کو خوش کرنے کے خیال سے اور احترام کی خاطر انھوں نے درمیان کی راہ نکالی کہ پہلی بات بھی کسی قدر صحیح ہے اور دوسری بھی۔''

■

Dr. Syed Taqi Abedi
Toronto, Canada
taqiabedi@rogers.com

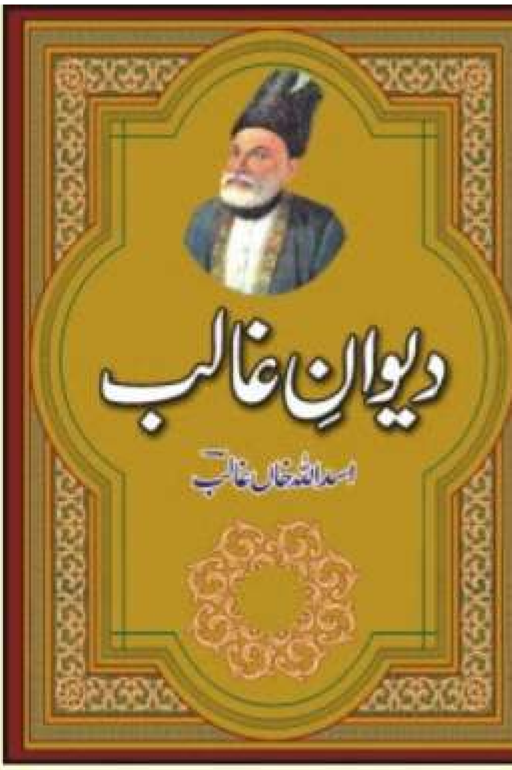

شمس بدایونی

غالب صدی کے بعد دیوانِ غالب کی قابل ذکر اشاعتیں

زندہ و فعال افراد کی طرح کتابیں بھی شہرت، مقبولیت اور عظمت کے معیار و درجات تک پہنچتی رہی ہیں۔ اردو شاعری میں یہ تینوں درجات 'دیوان غالب' کو حاصل ہوئے۔ اپنی اشاعت اول 1841 سے آج تک صدہا ایڈیشن اس کے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ تحقیق، ترتیب، تدوین اور انتخاب کے مراحل سے بھی یہ لگاتار گزرتا رہا ہے، ہزارہا صفحات پر مشتمل تحقیقی وتنقیدی بحثیں بھی اس پر موجود ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

15/فروری 1869 کو مرزا غالب کی وفات ہوئی۔ فروری 1969 میں ان کی صد سالہ برسی منائی گئی۔ اس موقعے پر غالب اور غالبیات کے حوالے سے قابل قدر سرمایہ سامنے آیا۔ اس سرمائے کا بڑا حصہ دیوان غالب کے مطالعے پر مشتمل ہے۔ صدی گزر گئی، ایسی کامیاب صدی جس میں غالب پر تحقیق وتنقید، تشریح وتعبیر کے ایسے اعلا [اصولی و عملی] نمونے پیش کیے گئے جو اردو تحقیق وتنقید کے بھی مثالی نمونے قرار پائے۔ 1969 سے آج 2019 تک تقریباً پچاس سال کی مدت میں دیوان غالب پر تحقیقات کا یہ سلسلہ بند نہیں ہوا۔ سطور ذیل میں انھی پچاس سال میں دیوان غالب کے حوالے سے کی جانے والی بعض تحقیقی کوششوں کا تعارف مقصود ہے۔ اس تعارف کو تین شقوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

1۔ دیوان غالب کے خطی نسخوں کی بازیافت
2۔ دیوان غالب ومنتخبات کے عکسی ایڈیشن
3۔ غالب کے دیوان اور انتخاب کی تاریخی تدوین

1۔ دیوان غالب کے خطی نسخوں کی بازیافت: ہند و پاک میں غالب کے دیوان کے خطی نسخے بڑی تعداد میں معلوم ودستیاب ہیں، لیکن المیہ یہ ہے کہ تدوین کے لحاظ سے کارآمد اور مفید مطلب جن خطی نسخوں کی غالب صدی کے دوران یا اس سے قبل تدوین ہوئی وہ گم ہو گئے۔ میری مراد نسخۂ حمیدیہ، نسخۂ لاہور اور بیاض غالب بخط غالب سے ہے، لیکن گذشتہ پچاس سال کے دوران ان میں سے دو کی بازیافت ہوئی اور یہ اشاعت کے مراحل سے بھی گزرے۔ میرے پیش نظر جو نسخے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

1۔ دیوان غالب اردو نسخۂ خدا بخش، تقدیم: فرخ جلالی۔ ناشر: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، اشاعت اول 1996، صفحات: [8 + 78 =] 86

خدا بخش لائبریری پٹنہ میں رضا لائبریری رامپور کی طرح دیوان غالب کے متعدد قلمی نسخے موجود ہیں، لیکن زیر نظر نسخے کی کتابت [جس کا کال نمبر 92 ہے] بقول قاضی عبدالودود [ف 1984] 1857 سے پیشتر کی ہے۔ فرخ جلالی [2013] کی رائے میں یہ کتابت 1840 کے آس پاس کی ہے۔ یہی سبب بنا اس کو مرتب کرنے کا؛ لیکن افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اس کے مقدمے اور حواشی کو آئندہ پر موقوف رکھا گیا۔ جبکہ سرورق پر تقدیم کے تحت فرخ جلالی کا نام مرقوم ہے۔ اس طور یہ نسخہ چار سطری حرفے چند از عابد رضا بیدار اور دو تعارفی صفحے از قلم فرخ جلالی کے ساتھ شائع کر دیا گیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تعارف بھی مرتب کے کسی مضمون سے اخذ کر کے شامل کرلیا گیا ہے۔ اس قیاس کی حسب ذیل وجوہ ہیں:

اول یہ کہ اس نسخے کا تعارف نہیں کرایا گیا، صرف اس طرح کے قلمی نسخوں کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی۔

دوم اس تعارف کے پہلے صفحے پر، صفحہ نمبر 189 درج ہے۔

سوم دوسرے صفحے پر یہ جملہ بھی ہے: میں نسخۂ عظیم آباد کو شائع کرانا چاہتا ہوں۔

اس طور ہم اس نسخے کو مدون کرنے کی وجوہ سے ناواقف رہے۔ 'حرفے چند' میں عابد رضا بیدار نے لکھا ہے:

دیوان غالب کے کئی قلمی نسخے خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہیں۔ فرخ جلالی صاحب نے ان میں سے ایک کا خصوصی مطالعہ کر کے اس کی تدوین کی ہے اور اس پر

تفصیلی حواشی لکھے ہیں۔ اس نسخے کا تعارف اور متن پیش کیا جا رہا ہے، مقدمہ اور حواشی اگلی بار [ص:3] اور یہ مقدمہ وحواشی آج تک شائع نہیں ہوئے۔

اس اشاعت کے شروع کے آٹھ صفحات: سرورق، کتابی کوائف، حرفے چند اور تعارف پر مشتمل ہیں۔ نسخے کا متن 78 صفحات کو محیط ہے، گویا خطی نسخہ 78 صفحات پر مشتمل ہے۔

نسخۂ خدا بخش، دیباچۂ غالب اور تقریظ نیر سے عاری ہے، ترقیمہ بھی نہیں ہے۔ پہلا صفحہ "رب یسر بسم اللہ الر حمن الرحیم و تمم بالخیر" کے بعد شروع ہو گیا ہے۔ فوری طور پر میں نے صفحۂ اول اور آخری عبارت کا طبع اول سے ملان کیا تو پہلی غزل کے بعد کا شعر۔

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغ جگر ہدیہ
مبارکباد! اسد غم خوارِ جانِ درد مند آیا

نسخے میں نہیں پایا۔ آخری صفحے پر بھی رباعیات کی ترتیب متداول دیوان کے مطابق نہیں۔ آخری رباعی سے پیشتر تمام شد لکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تدوین کے نقطۂ نظر سے اس نسخے کی کوئی خاص اہمیت نہیں؛ ورنہ قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی اور مالک رام وغیرہ کی توجہ کا مرکز یہ ضرور بنا ہوتا۔ تاہم اس کی اشاعت کی اپنی اہمیت ہے۔

2- دیوانِ غالب [نسخۂ خواجہ] ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، مکتبۂ اعجاز، لاہور، 1998، صفحات: 352، باراول

دیوان غالب نسخۂ خواجہ، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، الوقار پبلی کیشنز، لاہور۔ اگست 2000 صفحات: 236

باردوم، ڈیلکس ایڈیشن۔ راقم الحروف کے پیش نظر یہی ایڈیشن ہے۔ دراصل یہ نسخۂ لاہور ہے جو بقول عرشی 1852 کے آخر میں مرتب کیا گیا۔ یہ پنجاب یونیورسٹی پنجاب لائبریری کی ملکیت تھا۔ وہاں سے یہ غائب ہو گیا۔ کسی طرح یہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن [ف: 2005] کے ہاتھ لگا اور انھوں اسے نسخۂ خواجہ کے نام سے مرتب کر کے شائع کر دیا۔

جس طرح 'بیاض غالب بخط غالب' کی اشاعت کے بعد ماہرین غالب کے درمیان نسخے کی صحت وعدم صحت پر بحث برپا ہوئی تھی، اسی طرح اس نسخے کی اشاعت کے بعد بھی لاہور کے اخبارات ورسائل میں ایک طویل بحث چھڑ گئی۔ بحث کا موضوع تھا کہ یہ نسخۂ لاہور ہے، ماضی میں جس کا تعارف اردو کے بڑے محققین ڈاکٹر سید عبداللہ [دیوان غالب کا ایک نادر قلمی نسخہ، مطبوعہ ماہنامہ 'ماہ نو' کراچی جولائی 1954] قاضی عبدالودود [متفرقات، نقوش لاہور اکتوبر 1958] امتیاز علی خاں عرشی [نسخہ لاہور مشمولہ دیوان غالب نسخۂ عرشی، دہلی 1958] کرا چکے ہیں۔ جب کہ سید معین الرحمٰن کا دعویٰ تھا کہ یہ مخطوطہ ان کے ذاتی ذخیرۂ نوادر کا حصہ ہے۔ انھوں نے یہ پرانی کتابوں کے کسی بیوپاری سے خرید کر اپنے ذاتی ذخیرے میں شامل کیا تھا۔ [حرفے چند ص:10] ان کے دعوے کے رد میں جو چھوٹے بڑے رسائل اور جوابات شائع ہوئے وہ حسب ذیل ہیں:

1۔ دیوان غالب نسخۂ خواجہ، تجزیہ و تحسین، مرتبین: ڈاکٹر سید معراج نیر، اصغر ندیم، الوقار پبلی کیشنز لاہور، 2000، [یہ کتاب 5/نومبر 1999 کو ڈاکٹر معین الرحمٰن کی ستاونویں سالگرہ پر پیش کی گئی تھی]

2۔ دیوان غالب نسخۂ خواجہ اصل حقائق ڈاکٹر تحسین فراقی، بک وائز لاہور 2000، ص:82

3۔ دیوان غالب نسخۂ خواجہ یا نسخۂ مسروقہ۔ ایک جائزہ، سید قدرت نقوی، مکتبۂ تخلیق ادب کراچی 2000 ص:48

4۔ دیوان غالب نسخۂ خواجہ صحیح صورت حال، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، الوقار پبلی کیشنز لاہور، مئی 2000، ص:64

5۔ دیوان غالب نسخۂ خواجہ اصل حقائق، از ڈاکٹر تحسین فراقی اور دیوان غالب نسخۂ خواجہ صحیح صورت حال از ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، ایک تقابلی جائزہ، مولفہ ڈاکٹر عارف ثاقب، اظہار سنز لاہور، ستمبر 2000، ص:16

مذکورہ بالا تحریری بحث میں نسخۂ خواجہ کو کتب خانۂ پنجاب یونیورسٹی کا گم شدہ نسخہ، نسخۂ لاہور قرار دیا گیا اور کتب خانے سے اس کے گم ہونے اور مرتب کے ذریعے اس کی اشاعت کو ان کی ادبی خیانت سے تعبیر کیا گیا۔

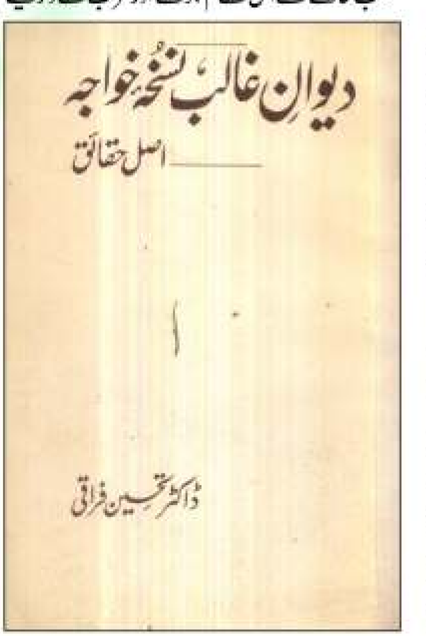

یہ نسخہ 64 اوراق یعنی 128 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں 1548 اشعار ہیں۔ بشمول دیباچۂ غالب و تقریظ، غزلیات، قصائد، قطعات اور رباعیات پر مشتمل ہے۔ عرشی صاحب کی رائے ہے کہ یہ نسخہ 1852 کے نصف آخر میں مرتب کیا گیا۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی ترتیب سے یہ پہلی بار چھپ کر شائع ہوا۔

مرتب نے اسے انگریزی و اردو ادبیات کے عالم پروفیسر خواجہ منظور حسین (ف 1986) سے منسوب کرتے ہوئے 'نسخۂ خواجہ' نام دیا (تعارف :16) وہ لکھتے ہیں: ''اس نسخے کی جدول چھ رنگ کی ہے۔ پہلے صفحے سے آخری صفحے تک مطلا اور مذہّب خوشنما بیل بوٹے، انتہائی دیدہ زیب باریک نفیس طلائی کام سے مزین'' (تعارف :6) آگے مزید لکھتے ہیں: ''نسخہ خواجہ جو اپنے وقت میں بڑے مثالی اہتمام اور کاوش کے ساتھ تیار ہوا ہے اغلب ہے کہ نواب ضیاء الدین احمد نیر درخشاں یا کسی شہزادے کے ذخیرے کا گوہر گم گشتہ ہو'' (تعارف:19) لیکن پروفیسر حنیف نقوی کا خیال ہے:

میرے نزدیک ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کا شائع کردہ یہ نسخہ وہ گم شدہ دیوان ہے جو غالب نے جانی بانکے لال رند وکیل بھرت پور کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے خاص اہتمام سے تیار کرایا تھا... یہ نسخہ 17/دسمبر 1852 کو بہ سبیل ڈاک رند کے نام روانہ کیا گیا تھا۔
(دیوان غالب تجزیہ و تحسین :39)

سید صاحب نے اس اشاعت کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ شروع کے 44 صفحات متعدد عنوانات: حرفے چند، تقدیمات، مخطوطے کا تعارف وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ درمیان کے 128 صفحات مطلا اور مذہّب نسخے کے عکس اور آخر کے 64 صفحات بہ عنوان، اضافات مرتب: نسخے سے متعلق حواشی، دیباچۂ غالب اور تقریظ دیوان غالب کا اردو ترجمہ، فہرست اشعار، اشاریے اور انگریزی میں نسخۂ خواجہ کے تعارف وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ مکمل دیوان آرٹ پیپر پر شائع کیا گیا ہے۔ نسخے کی ہو بہو رنگین کاپی شائع کی گئی ہے۔ میرا خیال ہے غالب صدی کے بعد اتنا خوبصورت نسخہ دیوان غالب کا ابھی تک شائع نہیں ہوا۔

3۔ نسخۂ حمیدیہ ڈیجیٹل کاپی: یہ نسخہ مرزا نے 1821 میں نقل کرایا جو 5/صفر 1237ھ/ یکم نومبر 1821 کو مکمل ہوا اور ریاست بھوپال کے فوجدار محمد خاں (ف 1865) کی ذاتی ملکیت بنا۔ یہ نسخہ ان تک کب اور کس طرح پہنچا اس سلسلے میں ابھی تک کوئی مصدقہ شہادت دستیاب نہیں ہو سکی

ہے۔ 1918 میں پہلی مرتبہ اہلِ علم کو اس کا پتہ چلا، اس وقت یہ نسخہ ریاست کے فرماں روا نواب حمید اللہ خاں (ف 1960) کے ذاتی کتب خانے کا حصہ تھا۔ انھی دو شخصیتوں سے نسبت کے سبب اول: یہ نسخۂ بھوپال اور پھر نسخۂ حمیدیہ کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ نسخہ مفتی محمد انوار الحق (ف 1940) کی ترتیب سے پہلی بار 'دیوان غالب جدید' کے نام سے مفید عام پریس آگرہ سے چھپ کر 1921 میں شائع ہوا۔ اس نسخے میں وہی کلام تھا جس کی بابت مرزا نے دیوان کے دیباچے میں لکھا تھا:

''شاعروں کے قدر شناس قارئین سے توقع ہے کہ وہ اُن پراگندہ ابیات کو جو اس دیوان سے خارج ہیں، عاصی کی تراوشِ قلم کا نتیجہ نہ سمجھیں اور ایسے اشعار کی تعریف وتعریض میں اس دیوان کے مرتب (غالب) کو ممنون وماخوذ نہ ٹھہرائیں''

لیکن مفتی صاحب نے اس میں متداول دیوان کا کلام بھی شامل کر دیا۔ اس طور جملہ کلام گڈ مڈ ہوگیا۔ کلام کی تاریخی ترتیب طے کرپانا مشکل ہوگئی بعد میں پروفیسر حمید احمد خاں (ف 1974) نے اسے ازسرِنو اصل کے مطابق مرتب کرکے 1969 میں مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع کیا۔

جنوری 1944 تک یہ نسخہ کتب خانۂ حمیدیہ میں موجود تھا اور اس سے بعض بڑے محققین نے استفادہ کیا، لیکن بعد کے عرصے میں یہ وہاں سے گم ہوگیا۔ 2015 میں یہ ڈھاکہ کے جناب شہاب ستار کو لندن میں پرانی کتابوں کے ایک بیوپاری سے حاصل ہوا جس کی انھوں نے مہر افشاں فاروقی کی وساطت سے ڈیجیٹل کاپی تیار کی، اس کی ہندوستانی قیمت چھ ہزار روپے قرار پائی۔ پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے یہ کاپی خریدی جو اس وقت میرے پیشِ نظر ہے۔ ظفر احمد صدیقی نے ایک مقالہ بہ عنوان ''نسخۂ حمیدیہ دریافت، گم شدگی، بازیافت'' بھی لکھا جو معارف مئی 2017 میں شائع ہوا۔ سطور ذیل میں اس ڈیجیٹل کاپی کا پہلی مرتبہ تعارف پیش کیا جارہا ہے:

11x8.50، انچ کا 281 صفحات (8+ 241 + 22) پر مشتمل ڈیجیٹل نسخہ اصل کے مطابق پیش کیا گیا ہے؛ یعنی سائز کے لحاظ سے اور دستیاب نسخے کے کاغذ کے رنگ کو بھی (جو مٹ میلا ہوچکا ہے) ہو بہو پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس نسخے پر صفحات نمبر کا اہتمام نہیں تھا، لہٰذا اس پر نمبر شمار بھی نہیں دیے گئے۔ ٹائیٹل پر فوجدار محمد خاں کی مہر، مرزا کا فوٹو، مہر افشاں فاروقی کا ایک اقتباس نقل کرتے ہوئے سرنامہ یہ بنا گیا ہے:

مرزا اسداللہ خاں غالب کے اصل مخطوطۂ دیوان کی ڈیجیٹل شکل/ 'نسخۂ حمیدیہ'/ حافظ معین الدین خطاط نے 1821 میں رقم کیا/ مع تعارف از مہر افشاں فاروقی۔

سرورق پر یہ اضافہ ملتا ہے 'غالب کے عہد شباب کا دیوان' اور مہر افشاں فاروقی کے نام کے نیچے درج ہے: ڈپارٹمنٹ آف مڈل ایسٹرن اینڈ ساؤتھ ایشیین لینگو یجز اینڈ کلچر، یونیورسٹی آف ورجینیا'' [مہر افشاں فاروقی کے تعارف میں یہ لکھنا کافی ہوگا کہ وہ اردو کے معروف نقاد جناب شمس الرحمٰن فاروقی کی بیٹی ہیں]

سرورق کے بعد کے صفحے پر کتابی کوائف کی طرح کاپی رائٹ [2015 یعنی سالِ اشاعت] آئی ایس بی این نمبر وغیرہ کا اندراج ہے۔ تیسرا صفحہ انتساب کے لیے مخصوص ہے جو جناب شہاب ستار نے اپنے والد، اے ستار کے نام کیا ہے۔ اس پر تاریخ اکتوبر 2015 درج ہے۔ تاریخ کے نیچے ڈھاکہ لکھا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مخطوطہ 2015 یا اس سے پہلے کے عرصے میں

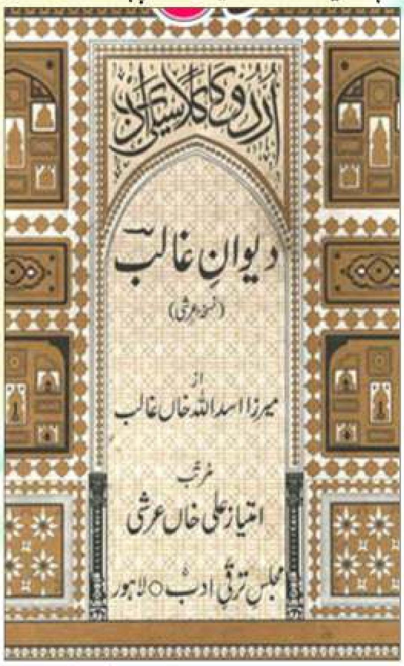

دستیاب ہوا تھا اور اس پر کام قیام ڈھاکہ کے دوران شروع ہوگیا تھا۔ اگلے تین صفحات پیش لفظ کے لیے مختص ہیں جو جناب شہاب ستار نے لکھا ہے اس پر بھی تاریخ اور جگہ کا اندراج حسب سابق ہے۔ آگے کے 12 صفحات مہر افشاں فاروقی کے مقدمے بہ عنوان ''غالب کے 1821 کے دیوان کی تاریخ'' [مترجم ظفر سید] شامل ہے۔ اس کے بعد 241 صفحات پر مشتمل عکس ہے آخر کے 22 صفحات میں نیا انگریزی سرورق، کتابی کوائف، انتساب، پیش لفظ، اور مقدمے کا انگریزی متن ہے۔

اس نسخے کی اشاعت سے بہت سے اختلافات ازخود حل ہوجائیں گے جیسا کہ مہر افشاں فاروقی نے بھی اپنے مقدمے میں انتہائی عالمانہ انداز میں اس پر گفتگو کی ہے۔

دیوان غالب ومنتخبات کے عکسی ایڈیشن:

غالب کی زندگی میں دیوان غالب کے پانچ ایڈیشن چھپ کر شائع ہوئے:

1۔ دیوان غالب، سید المطابع دہلی، اکتوبر 1841 تعداد اشعار 1903
2۔ دیوان غالب، مطبع دارالسلام دہلی، مئی 1847، تعداد اشعار 1158
3۔ دیوان غالب مطبع احمدی دہلی، جولائی 1861، تعداد اشعار 1796
4۔ دیوان غالب، مطبع نظامی کانپور، جون 1862، تعداد اشعار 1802
5۔ دیوان غالب، مطبع مفید خلائق آگرہ، بعد از جون 1863، تعداد اشعار 1795

عام طور پر غالب کے متداول دیوان میں 1796 یا 1802، اشعار ملتے ہیں۔ یہ تمام اشعار 1855 تک کہے گئے اشعار سے انتخاب کیے گئے ہیں، اسی لیے ان دواوین کی اہمیت ہے، چونکہ ان دواوین کے نسخے کمیاب و نایاب ہیں، اس لیے ان کی عکسی اشاعتوں کی اہمیت محسوس کی گئی۔ کالی داس گپتا رضا (ف 2001) کے ذاتی ذخیرۂ کتب میں کلام غالب کی جملہ اشاعتیں موجود تھیں، لہٰذا انھوں نے دو کی عکسی اشاعتیں اپنے پیش لفظ کے ساتھ چھپوا کر شائع کردیں۔

1۔ دیوان غالب (عکسی) طبع اول، ناشر: ول پبلی کیشنز بمبئی، 1986 ص: [16+ 110] = 126

چھ صفحات پر مشتمل پیش لفظ میں کالی داس گپتا رضا نے اس دیوان سے متعلق جملہ تفصیلات سے مطلع کیا ہے۔ اس شاعت کا انتساب مالک رام [ف: 1993] کے نام کیا گیا ہے۔

2۔ دیوان غالب چوتھا ایڈیشن، مطبع نظامی کانپور، جون جولائی 1862 (عکسی) ول پبلی کیشنز بمبئی، 1987 ص: [24+ 104] = 128

انتساب ڈاکٹر گیان چند جین [2007] کے نام ہے۔ پیش لفظ 19 صفحات پر مشتمل ہے، جس میں غالب کے دیوان کی جملہ اشاعتوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ دیوان کا متن 104 صفحات پر مشتمل ہے۔ پیش لفظ میں مرتب نے لکھا ہے:

''ان میں پہلا ایڈیشن اور چوتھا ایڈیشن نہایت اہم

ہیں۔ پہلا اس لیے کہ یہ نہایت کمیاب ہے۔ (ظاہر ہے کہ اس میں سب ایڈیشنوں سے کم شعر ہیں) نیز یہ غالب کی مطبوعہ اردو شاعری کے سفر میں پہلا قدم ہے؛ اور چوتھا اس لیے کہ اس میں سب ایڈیشنوں سے زیادہ شعر ہیں اور اس کی بنیاد تیسرے ایڈیشن کا وہ نسخہ ہے جو خود غالب نے اپنے قلم سے درست اور نظر ثانی کر کے اشاعت کے لیے دیا تھا'' (ص:16)

آگے مزید لکھتے ہیں:

''اس ایڈیشن میں وہ تمام (1796) اشعار لیے گئے ہیں جو تیسرے ایڈیشن میں شامل تھے۔ ان کے علاوہ چھ شعروں کا اضافہ بھی کر دیا... اس طرح اس ایڈیشن کے کل اشعار 1802 ہو گئے اور غالب کا یہی کلام متداول ہے(ص:16)

عکسی اشاعت کے مطالعے سے پتہ چلا کہ طبع اول بنا جدول شائع ہوا تھا اس اشاعت میں جدول کا اہتمام ملتا ہے۔ اس کے علاوہ غزلیات پر نمبر شمار بھی دیے گئے ہیں۔ نیّر کی تقریظ اس میں شامل نہیں ہے آخری صفحے پر ''خاتمۃ الطبع'' کے عنوان سے مطبع نظامی کانپور کے مالک محمد عبد الرحمٰن کا ایک نوٹ ہے اور خواجہ طالب حسین طالب کا ایک تاریخی قطعہ ہے۔ اس کے بعد مالک مطبع کے دستخط اور مہر ہے۔

3۔ دیوان غالب مطبوعہ 1863 (عکسی) مقدمہ حکیم سید ظل الرحمٰن، ناشر ابن سینا اکادمی علی گڑھ، اشاعت: 2016، ص: [22 + 146] = 168

یہ غالب کی زندگی میں شائع ہونے والا آخری دیوان ہے۔ جو ان کی وفات سے چھ سال قبل 1863 میں مطبع مفید عام خلائق آگرہ سے 146 صفحات پر چھپ کر شائع ہوا تھا۔ یہ مع دیباچہ وتقریظ نیّر [فارسی] قطعات، مثنوی، قصائد، غزلیات اور رباعیات پر مشتمل ہے اشعار کی تعداد 1795 ہے۔ عرشی صاحب نے اس اشاعت کی بابت لکھا ہے:

اس نسخے کی یہ خصوصیت قابل بیان ہے کہ پوری کتاب میں کچھ مقامات کے سوا، یاے معروف ومجہول اور ہاے سادہ ومخلوط میں فرق کیا گیا ہے۔ شاید اس سے پہلے کسی مطبوعہ کتاب میں یہ التزام نہیں۔''

(دیوان غالب نسخہ عرشی، ص: 144)

حکیم سید ظل الرحمٰن فاؤنڈر ابن سینا اکادمی کے ذاتی ذخیرے میں یہ نسخہ موجود تھا۔ انھوں نے اول اس کا عکس سہ ماہی 'سورج' لاہور میں شائع کرایا [سالنامہ اکتوبر 2006] بعد ازاں ایک مقدمہ لکھ کر اس کا عکسی ایڈیشن اپنے ادارے سے شائع کیا۔ یہ دیوان 146 صفحات پر مشتمل ہے۔ شروع کے 22 صفحات کتابی کوائف اور مقدمے کے لیے وقف ہیں۔ اس ایڈیشن کا انتساب ریاض الرحمٰن خاں شروانی کے نام کیا گیا ہے۔

15 رصفحات پر مشتمل مقدمے میں مرتب نے دیوانِ غالب کی جملہ اشاعتوں کا تعارف کراتے ہوئے اس عکسی ایڈیشن کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے اور اس امر سے بھی مطلع کیا کہ:

''اس کا عکس 'سورج' میں بہت صاف نہیں چھپا تھا۔ میں نے مسلم ایجوکیشنل پریس کے مالک شجاع الدین سے اس کی صفائی کا خاص خیال رکھنے کے لیے کہا۔ یہ ان کی تعریف کی بات ہے کہ انھوں نے پھیلی ہوئی سیاہی اور دھبوں کو جہاں تک ہو سکا دور کیا۔ بعض اشعار جو تجلید کی نذر ہو گئے تھے، اسی طرح جگہ جگہ جو حروف ٹوٹ گئے تھے اور چھاپے میں صاف نہیں آئے تھے انھیں بڑی محنت سے ابھارنے کی کوشش کی۔ 1841 اور 1862 کی عکسی اشاعتوں میں بھی چھاپے کی صفائی اور اڑے ہوئے حروف کے بنانے پر توجہ نہیں کی گئی تھی۔ (ص 20)

حکیم صاحب کا یہ بیان بالکل درست ہے۔ اس وقت میرے پیش نظر تصانیف غالب کے بیشتر عکس موجود ہیں۔ یہ دیوان صفائی اور درستگی الفاظ کے لحاظ سے ان سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو کہ یہ ڈیجیٹل پرنٹنگ کے عہد میں چھپا ہے۔

3۔ گل رعنا مع آشتی نامۂ غالب، مرتبہ سید قدرت نقوی، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، 1975، صفحات: [12 + 358 + 120] = 490

اس نسخے پر حرفے چند جمیل الدین عالی [ف: 2015] نے لکھا ہے اور مقدمہ مرتب نے۔ یہ مرزا غالب کا اردو و فارسی کلام کا پہلا انتخاب ہے جو انھوں نے مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر کیا تھا۔ پیش نظر نسخے کی ترتیب کے وقت 'گل رعنا' کے پانچ مخطوطے معلوم اور چار دستیاب تھے۔ [1] نسخۂ حسرت موہانی [2] نسخۂ بلگرامی [3] نسخۂ خواجہ [4] نسخۂ سُویدا [5] نسخۂ وصی احمد یعنی زیر نظر مخطوطہ۔ نسخۂ حسرت عدم دستیاب ہے۔ دوسرا مالک رام کی ترتیب سے علمی مجلس دہلی سے 1969 میں شائع ہوا۔ تیسرے اور چوتھے نسخے کی روشنی میں سید وزیر الحسن عابدی نے [ف: 1979] متن مرتب کیا جسے ادارۂ تحقیقات پاکستان لاہور نے 1970 میں شائع کیا۔ پانچواں نسخہ سید وصی احمد بلگرامی [1976] کی ملکیت تھا جسے مشفق خواجہ [ف: 2005] نے حاصل کر کے سید قدرت نقوی (ف 2000) سے مرتب کرایا۔ اس میں غالب کا اردو کلام کا انتخاب شامل ہے، جس میں 454 شعر ہیں۔ مالک رام کے یہاں یہ تعداد 455 اور عابدی کے یہاں 477 ہے۔ یہ اشاعت مالک رام اور عابدی صاحب کی اشاعتوں سے اس لحاظ سے وقیع ہے کہ اس میں گل رعنا کے مخطوطۂ پنجم کا عکس بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

اس مخطوطے کا سائز 20x30/16 تھا۔ جلد بندی کے بعد کچھ فرق واقع ہو گیا۔ کل اوراق 62 یعنی 104 صفحات ہیں۔ صفحات شماری بعد میں کی گئی ہے۔ اردو اشعار کا اندراج صفحہ 8 سے صفحہ 50 کو محیط ہے۔ کلام دو

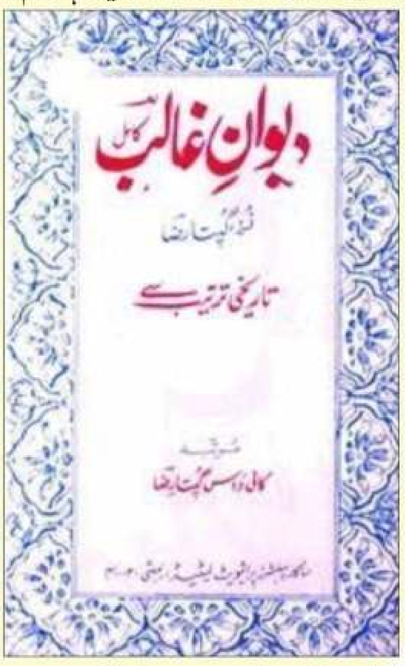

کالم میں بغیر جدول ترچھا انداز اختیار کرتے ہوئے خوبصورت پیرائے میں لکھا گیا ہے۔ اس مخطوطے کا عکس بہت صاف اور واضح ہے۔

3۔ غالب کے دیوان اور انتخاب کی تاریخی تدوین:

اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو دیوان غالب کی تاریخی تدوین مولانا عرشی نے اپنی مرتبہ اشاعتوں 1958، اور 1982 نسخۂ عرشی میں کر دی تھی، لیکن یہ عنوان بند یا ابواب بند تھی یعنی نسخۂ عرشی کو انھوں نے تین حصوں میں تقسیم کیا تھا: گنجینۂ معنی، نواے سروش، یادگار نالہ پہلے عنوان کے تحت صرف نسخۂ حمیدیہ و شیرانی کے اشعار جمع کیے، دوسرے کے تحت دیوان متداول کے اور تیسرے کے تحت وہ اشعار دیے جو نسخوں کے متن میں نہیں بلکہ حاشیوں، خطوط، بیاضوں یا خاتمے سے لیے گئے۔ کلام کی تاریخوں کا اندراج کلام کے ساتھ نہ کر کے حواشی میں کیا۔ کالی داس گپتا رضا نے اس سے استفادہ کرتے

ہوئے اس پورے دیوان کو تاریخی ترتیب میں سلسلہ وار مرتب کر دیا۔ یہ ایک نوعیت کا علاحدہ کام تصور کیا گیا اور پسند کیا گیا۔ اس سلسلے کے ان کے مرتبہ نسخے کے جو ایڈیشن شائع ہوئے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

1۔ دیوان غالب کامل (تاریخی ترتیب سے) کالی داس گپتا رضا، ساکار پبلی کیشنز، بمبئی، بار اول 15رفروری 1988، صفحات: 400

اس دیوان کا انتساب مرتب نے اپنی اہلیہ ساوتری کالی داس گپتا کے نام کیا ہے۔ شروع میں طویل مقدمہ ہے [ص: 11 تا 109] متن میں 4209 شعر پیش کیے گئے ہیں۔ ترتیب گیارہ ادوار میں کی گئی ہے۔ پہلا دور 1807 تا 1812 اور گیارہواں دور 1863 تا 1867 ہے۔ آخر میں اشاریے [فہرست اشعار، اشخاص، کتب ورسائل مقامات] دیے گئے ہیں۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی نے 1990 میں اسے پاکستان سے شائع کیا۔

2۔ طبع دوم ہمارے پیش نظر نہیں۔ لیکن یہ ہندوستان میں 1990 میں اور پاکستان میں 1994 میں طبع ہوا تھا۔ رضا نے طبع سوم میں لکھا ہے: ''اگرچہ دوسرے ایڈیشن میں بھی ردو بدل کیا گیا تھا مگر وہ کچھ ایسا نمایاں نہ تھا۔ (ص: 9)

3۔ دیوان غالب کامل نسخۂ گپتا رضا (تاریخی ترتیب سے) کالی داس گپتا رضا، ساکار پبلی کیشنز، بمبئی، 15رفروری 1995، (ترمیم واضافوں کے ساتھ) صفحات: 564

اس کی ترتیب بھی ماقبل کے ایڈیشن کے مطابق ہے، البتہ اس میں مرتب نے خاصے اضافے کیے ہیں۔ طبع اول میں اختلاف نسخ کو محض اس لیے واضح نہیں کیا گیا تھا کہ یہ کام بہ طریق احسن، عرشی صاحب انجام دے چکے تھے۔ املا اور روایت اشعار بھی بیشتر نسخۂ عرشی کے مطابق تھے، لیکن اس اشاعت میں انھوں نے اپنے طور پر ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ عرشی صاحب کا اعتراف قدم قدم پر کیا ہے، لیکن درجۂ اول کے 19 مآخذ میں سے 8 مآخذ سے استفادہ بتوسط نسخۂ عرشی ہی کیا ہے۔ اس ایڈیشن کا مقدمہ 113 صفحات کو محیط ہے۔ مقدمے میں انھوں نے ترتیب سے متعلق سارے اہم مسائل پر گفتگو کی ہے اور حتی الوسع اسے حتمی شکل دینے کی سعی کی ہے۔ مقدمہ ہی میں توقیت کا اضافہ کیا ہے۔ مقدمہ میں اختیار کردہ عنوانات سے اس اشاعت کی اہمیت کا کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

کلام غالب کی تاریخی ترتیب کیوں، تعارف، غالب کا اولین اردو منظوم کلام، عمدۂ منتخبہ میں ذکر غالب، حرف نامعتبر، غالب کے بعض غیر متداول اشعار کا زمانۂ فکر، غالب کے کچھ ہنگامی مصرعے اور اشعار، دیوان غالب طبع اول، غالب کی زندگی میں دیوان غالب کی اشاعت، (دیباچہ، تقریظ، خاتمۃ الطبع اور تعداد اشعار) توقیت غالب۔

مقدمے کے بعد دیوان غالب کا متن حسب سابق گیارہ ادوار میں نقل کر دیا گیا ہے۔ طبع اول میں پہلے دور کا آغاز 1807 سے کیا تھا۔ اس شاعت میں اس سنہ کو حذف کر کے ڈیش لگا دیے گئے ہیں۔ آخر میں فہرست اشعار بہ لحاظ سال فکر اور بہ لحاظ حروف تہجی (قافیہ و ردیف) کا اضافہ کیا ہے۔ اشاریۂ اشخاص، کتب، مقامات کے علاوہ غالب کی چار تصویریں بھی دی ہیں۔ اس اشاعت کا پاکستانی ایڈیشن انجمن ترقی اردو کراچی نے 1996۔1997 میں شائع کیا جس پر جمیل الدین عالی کا پیش لفظ ہے۔ انجمن نے اس کا چوتھا ایڈیشن 2012 میں بھی شائع کیا ہے۔

4۔ انتخاب کلام غالب، مسعود حسین، سرسید بک ڈپو علی گڑھ اول 1991، صفحات: 224

غالب کے کلام کے متعدد انتخاب ہند و پاک میں شائع ہو چکے ہیں لیکن یہ انتخاب پروفیسر مسعود حسین خاں (ف 2010) ماہر لسانیات کی تراوش فکر کا نتیجہ ہے۔ اس کا انتساب انھوں نے اپنے چچا اور غالب شناس ڈاکٹر یوسف حسین خاں (ف 1979) کے نام کیا ہے۔ شروع میں 'پیش کلام' کے عنوان سے سات صفحے پر مشتمل ایک دیباچہ ہے جس میں انھوں نے اس انتخاب کو مرتب کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''غالب کے مکمل مجموعۂ کلام کی تدوین کا کام تو امتیاز علی عرشی مرحوم اور کالی داس گپتا رضا اپنے اپنے انداز میں انجام دے چکے ہیں۔ 'تاریخ وار مکمل انتخاب' کا بیڑا راقم السطور نے اٹھا لیا۔ اس عمل میں غالب کے دیوان کی ضخامت تقریباً وہی رہی جو متداول دیوان کی ہے۔

ہر چند اس انتخاب کی تاریخی ترتیب کا دعواے ادوار (نسخۂ عرشی کے انداز پر) یا تاریخ وار (کالی داس گپتا رضا کے اہتمام کے مطابق) کہیں نہیں کیا ہے، اس لیے کہ ان دونوں گراں قدر تالیفوں کی موجودگی میں یہ محض ایک تکراری عمل ہوتا؛ تاہم غالب شناس دیکھیں گے کہ اس انتخاب میں بھی غالب کا کل کلام تاریخی ترتیب کے ساتھ ردیف وار پیش کیا گیا ہے۔ قصائد، قطعات اور رباعیات کی ترتیب میں تاریخی التزام قائم رکھا گیا ہے، اس طرح کہ ایک نظر میں غالب کے ذہنی ارتقا کی ترسیم کا

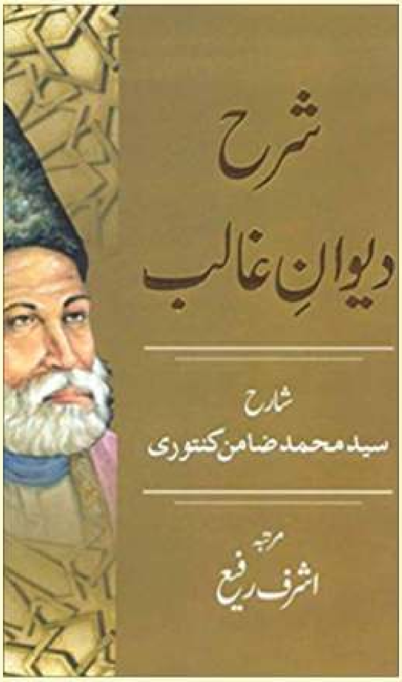

اندازہ ہو جاتا ہے۔'' (ص: 6,7)

راقم الحروف کا خیال ہے کہ ایک ماہر لسانیات اور ناقد ادب کے قلم سے کیا گیا انتخاب غالب کے فکر و فن کی ارتقائی صورت کو سمجھنے کا یقیناً ایک بہتر وسیلہ بنے گا، لیکن کلام کے ساتھ سال فکر کا اندراج نہ کرنے سے یہ مقصد کیوں کر حل ہو سکتا ہے، میں نہیں سمجھ سکا۔ البتہ مرزا خلیل بیگ کی کتاب 'مسعود حسین خاں احوال و آثار' (دہلی 2015) کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے جامعۂ اردو علی گڑھ کے ادیب کامل کے طلبہ کے لیے یہ انتخاب کیا تھا (ص: 144) لیکن دیباچے میں اس طرح کا کوئی ذکر نہیں، بلکہ دیباچے میں جس طرح غالب کے قلمی مخطوطوں کا ذکر کیا ہے اس سے اس انتخاب کی حیثیت تحقیقی ہو جاتی ہے نہ کہ تدریسی۔ واللہ اعلم

دیوان غالب سے متعلق یہ ہیں وہ چند تحقیقی کارگزاریاں جن میں سے ہر ایک مستقل جائزے کی حامل ہے۔ پچھلے پچاس سال کے دوران ہند و پاک میں دیوان غالب کے درجن بھر سادہ ایڈیشن بھی شائع ہوئے ہیں جن کے مرتبین یا ان کو شائع کرنے والے ادارے ادب میں خاص اہمیت رکھتے ہیں، ان کا تعارف پھر کبھی۔ اس مختصر مقالے کو دیوان غالب کی چند قابل ذکر اور اپنی نوعیت کی جدا اشاعتوں کے تعارف تک محدود رکھا گیا۔

■

Dr. Shams Badauni
58, New Azad Param Colony, Izzat Nagar
Bareilly - 243122 (UP)
Mob.: 09837092245

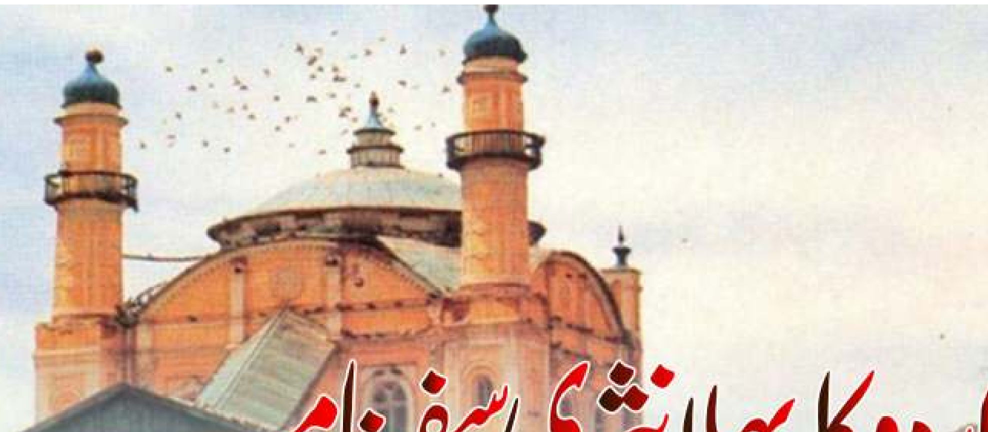

علی عباس

اردو کا پہلا نثری سفرنامہ

اردو ادب میں سفرنامے کی روایت اور اس کے آغاز سے متعلق زیادہ تر محققوں نے اردو کا پہلا (نثری) سفرنامہ تاریخ یوسفی/ عجائبات فرنگ (مطبوعہ 1847 عیسوی)، مصنف یوسف کمبل پوش کو قرار دیا ہے جبکہ 'عجائبات فرنگ' سے قبل اب تک جس (نثری) سفرنامے کا ذکر کیا گیا ہے وہ 'تاریخ افغانستان' از سید فدا حسین بخاری الحیدری ہے۔ اس سفرنامے پر اب تک کسی نے تفصیلی بحث نہیں کی ہے، البتہ اس کے ایک دو اقتباسات کو بنیاد بنا کر ہمارے محققوں نے اسے اردو کا پہلا سفرنامہ قرار دینے کی کوشش ضرور کی ہے۔ مرزا حامد بیگ نے اپنی کتاب 'اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ' میں 'اردو کا پہلا سفرنامہ نگار کون؟' کے ذیل میں خصوصی گفتگو کرتے ہوئے کہا:

''تاریخ افغانستان، از سید فدا حسین کا زمانۂ تصنیف وطباعت 1839 عیسوی ہے اور 'تاریخ یوسفی' از یوسف کمبل پوش کا زمانۂ تصنیف لگ بھگ 1846 عیسوی اور سنہ طباعت 1847 عیسوی۔ یوں زمانۂ تصنیف اور سنہ طباعت کے اعتبار سے 'تاریخ افغانستان' کو 'تاریخ یوسفی' پر پانچ تا چھ برس کا زمانی تفوق اصل ہے یعنی سنین کے مطابق اردو کا پہلا سفرنامہ نگار سید فدا حسین عرف نبی بخش ہی قرار پاتا ہے اور اردو کا پہلا سفرنامہ 'تاریخ افغانستان' ہے نہ کہ 'تاریخ یوسفی' المعروف 'عجائبات فرنگ'[1]

پروفیسر خالد محمود کے بقول:

''اندرونِ ملک 'تاریخ افغانستان' ہی پہلا باقاعدہ سفرنامہ کہے جانے کا مستحق ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنی کمزوریوں کی وجہ سے 'تاریخ یوسفی' کے سامنے 'تاریخ افغانستان' کا چراغ نہیں جلا اور وہ ایک جنگی وقائع نگار کی خام و ثقیل نثر کا نمونہ بن کر رہ گیا۔ یہ سفرنامہ 'تاریخ افغانستان' کے نام سے 1852 میں تحریر ہوا۔''[2]

مرزا حامد بیگ نے تاریخ افغانستان کی تصنیف و طباعت کا زمانہ 1839 عیسوی[3] تحریر کیا ہے۔ جب کہ پروفیسر خالد محمود نے اس کی تحریر کا زمانہ 1852 عیسوی[4]

لکھا ہے۔ راقم نے اس سلسلے میں ان دو بڑے محققوں یعنی پروفیسر خالد محمود اور مرزا حامد بیگ سے براہِ راست رابطہ کیا، انھوں نے اس سفرنامے سے متعلق اپنی معلومات سے آگاہ کیا اور ذکر کیے گئے سفرنامے کی عدم دستیابی پر اظہار افسوس بھی کیا۔ خیر! سعی بسیار کے بعد پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڑھ کی اے۔سی (امر چند) جوشی لائبریری کے شعبۂ مخطوطات میں ایک قلمی نسخہ راقم الحروف کو دستیاب ہوا، جس کے سرورق پر 'جنگ نامۂ کابل' 3 نومبر 1838 عیسوی مطابق 15 شعبان 1255 ہجری، از سید فدا حسین تحریر تھا۔ ذہن میں اب بھی ایک سوال تھا کہ کیا یہ وہی سفرنامہ ہے جس کی مجھے تلاش تھی یا کوئی اور، کیونکہ سید فدا حسین عرف نبی بخش تو وہی ہے مگر سفرنامے کا نام وہ نہیں ہے جس کا ذکر ہمارے محققوں نے کیا ہے یعنی 'تاریخ افغانستان'۔ مگر جب مرزا حامد بیگ کی کتاب میں درج 'تاریخ افغانستان' کے اقتباسات سے دستیاب شدہ نسخے کی عبارتوں کا تقابل کیا تو کافی حد تک عبارتیں ایک جیسی ملیں، جس سے اس بات کے پختہ ثبوت فراہم ہونے لگے کہ دونوں کتابیں ایک ہی ہیں، البتہ عبارتوں میں پائے جانے والے کچھ اختلافات نے راقم الحروف کے ذہن میں یہ سوال پیدا کر دیا کہ ایسا کیسے ممکن ہے کہ ایک ہی نسخے سے نقل کی گئی عبارتوں میں اس قدر اختلافات پائے جائیں، ممکن ہے اس کا کوئی اور بھی قلمی یا مطبوعہ نسخہ موجود ہو، جس کا نام اور عبارتیں وہی ہوں جس کا ذکر مرزا حامد بیگ نے کیا ہے اور پھر 'تاریخ افغانستان' نامی سفرنامے کی تلاش شروع کی۔ ایک عرصے کی مشقت کے بعد ذکر کیے گئے کتب خانے کے ریئر بک سیکشن میں اورینٹل کالج میگزین، لاہور کی فائلوں میں دبی ایک سیاہ جلد میں لپٹی ہوئی مختصر سی کتاب نظر آئی جس کی اوپری سطح پر ایک پرچی چسپاں تھی جس پر تحریر تھا: ''تاریخ افغانستان' از سید فدا حسین عرف نبی بخش حیدری البخاری' اس کے صفحہ اول پہ ذیل کی عبارت درج تھی جس سے اس کے مطابع اور سنہ طباعت کا علم ہوتا ہے، ملاحظہ کریں:

''تاریخ افغانستان، سید محمد خان بہادر کے چھاپہ خانہ کے لیتھوگرافک پریس میں شہر محرم الحرام 1259 ہجری مطابق ماہ فروری 1843 عیسوی کو سید عبدالغفور کے

اہتمام سے دلی میں چھپی، کاتب الحروف سید بوعلی رضوی عفی عنہ۔'' (تاریخ افغانستان، سرورق)

اس کے بعد کے صفحوں پر وہی عبارتیں نظر آئیں جن کے اقتباسات کو مرزا حامد بیگ نے اپنی کتاب 'اردو سفرناموں کی مختصر تاریخ' میں نقل کیا ہے۔ ممکن ہے یہی نسخہ ان کے سامنے رہا ہو۔ مگر انھوں نے اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ اس سفرنامے کو کس مطبع نے زیور طباعت سے آراستہ کیا۔ بہرحال! یہ ثابت ہوگیا کہ سفرنامہ 'تاریخ افغانستان' 1843 عیسوی میں شائع ہوا، نہ کہ 1839 یا 1852 عیسوی میں۔

'جنگ نامہ کابل' کا قلمی نسخہ چوراسی صفحات کو محیط، ہر صفحہ پندرہ سطروں اور ہر سطر تقریباً چودہ تا پندرہ الفاظ پر مشتمل ہے۔ اسی طرح اس کے مطبوعہ نسخے 'تاریخ افغانستان' میں کل 97 صفحات ہیں اور ہر صفحے پر پندرہ سطریں اور ہر سطر میں بارہ تا پندرہ الفاظ موجود ہیں۔

اب آتے ہیں 'جنگ نامہ کابل معروف بہ تاریخ افغانستان' کی جانب اور جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کا مصنف کون ہے اور اس کے سفر کا مقصد کیا تھا، تاکہ سفرنامے میں بیان کیے گئے واقعات و کوائف کو بخوبی سمجھا جاسکے اور یہ بھی معلوم کیا جاسکے کہ اس سفرنامے کے وجود میں آنے کا بنیادی سبب کیا تھا۔ ذکر کیے گئے سفرنامہ سے چند باتیں سامنے آتی ہیں:

1۔ نام: سید فدا حسین، عرف نبی بخش بخاری الحیدری

2۔ وطن: شاہجہاں آباد (دہلی)، گویا یہی اس کا مولد و منشا بھی ہوگا۔

3۔ اس نے روزگار کے سبب انگریزی فوج ترک سواروں میں جمعداری کے عہدے پر ملازمت اختیار کی۔

4۔ انگریزی حکومت نے شاہ شجاع الملک کو کابل کے تخت حکومت پر بٹھانے کے لیے ایک جنگی مہم کا آغاز کیا تھا۔

5۔ سید فدا حسین کا فوجی رسالہ بھی اس مہم کے لیے میرٹھ چھاؤنی سے کابل کے لیے روانہ ہوا۔

6۔ سفر کا آغاز: نومبر کی تیسری تاریخ 1838 عیسوی، مطابق 15 شعبان، 1255 ہجری، قلمی نسخے کے مطابق اور 3 ماہ نومبر 1839 عیسوی، مطابق 25 شعبان 1255 ہجری، مطبوعہ نسخے کے مطابق۔ آخرالذکر تاریخ ہجری اور عیسوی کلینڈر کے مطابق صحیح معلوم ہوتی ہے، کیونکہ مطبوعہ نسخے کی تاریخوں کو ایک دوسرے سے بدل کر دیکھا گیا تو دونوں مہینے کی وہی تاریخیں سامنے آتی ہیں جن کا ذکر مطبوعہ نسخے میں کیا گیا ہے۔

7۔ لارڈ آک لنڈ (گورنر جنرل، ہند) کی معیت میں رجمنٹ سولہ (16)، سات (7) لعل کرتی، تین رسالہ، بائیس پلٹن اور چھ توپخانہ اور چار رسالہ میجر سکندر برنس کی معیت میں کابل بھیجے گئے۔

8۔ فیروز پور پہنچنے پر مہاراجہ رنجیت سنگھ (والی لاہور موت: 27 جون 1839) اور ان کے فرزند کھڑک سنگھ نے بیس ہزار فوج کے ساتھ انگریزی لشکر کا استقبال کیا اور فوج کے ہر سپاہی کو ایک ایک روپیہ بطور انعام کے دیا۔ (ص 3)

9۔ اور مہاراجہ رنجیت سنگھ راس گھوڑے مع ساز طلا اور ایک زنجیر فیل مع عماری مغرق طلائی لارڈ صاحب بہادر کو دیے۔ (ص 3)

10۔ 12/ نومبر 1840 عیسوی کو کابل سے انگریزی فوجوں کی واپسی ہوئی۔

11۔ سفرنامہ لکھنے کا مقصد فدا حسین کی زبانی ملاحظہ کیجیے: ''وقت رخصت بڑے بھائی صاحب نے اس خاکسار کو خدائے کریم کے سپرد کرکے فرمایا کہ اگر خدا حافظ حقیقی تم کو اپنے فضل میں محفوظ رکھے اور زندگی وفا کرے، لازم ہے کہ احوال اس ملک کا جو کہ بچشم خود دیکھو اس کو لکھ کر واسطے دیکھنے میرے کے لانا۔ چنانچہ اس عاجز نے بموجب ارشاد حاجی حسین علی خان صاحب برادر ممدوح کے کچھ تھوڑا سا حال اس سفر کا لکھا ہے۔''5

قدیم سفرناموں کی طرز پر لکھے گئے اس سفرنامے میں بھی مختلف شہروں کے حالات و کوائف اور وہاں کے باشندوں کی بود و باش کو بیان کرنے کے علاوہ جنگی مہم جوئی سے بھی پوری طرح واقف کرایا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ جنگ اس دور کی مشہور جنگ تھی، جس کا ذکر ہندوستان اور افغانستان کی تاریخوں میں خصوصیت سے کیا گیا ہے لیکن جن تفصیلات کا بیان زیر بحث سفرنامے میں کیا گیا ہے، ان کا عشر عشیر بھی تاریخ کے اوراق میں نہیں ملتا۔ ایسا اس لیے کہا جارہا ہے کہ اسی دور کی تاریخ 'حیات افغانی' مطبوعہ 1867 عیسوی میں محمد حیات خان نے اس جنگی مہم کو فقط تاریخی واقعے کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ جبکہ 'جنگ نامہ کابل' کے مصنف نے اپنے اس سفرنامے میں نہ صرف تاریخ جغرافیہ اور انگریزوں اور افغانوں کے درمیان معرکہ آرائیوں کا بیان کیا ہے بلکہ ان مقامات اور ان صورت حال کی منظرکشی بھی کی ہے جن مقامات سے وہ گزرا ہے یا جو حالات اس پر گزرے ہیں۔ یہاں پر 'حیات افغانی اور سفرنامہ 'جنگ نامۂ کابل' سے ایک ہی واقعے کے اقتباس کو پیش کیا جاسکتا ہے اور سمجھا جاسکتا ہے کہ تاریخ اور سفرنامے میں کسی بھی واقعے کے بیان کی تفصیلات کس طور پر بیان کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیں ایک منظر تاریخ کے آئینے میں:

''22 فروری 1839 عیسوی کو انیس ہزار تین سو پچاس سپاہی نے اور چھ ہزار فوج شاہ شجاع نے مقام سیوان سے براستہ درّہ بولاں قندھار کی طرف کوچ کیا اور بسبب کمی پانی بہت سی تکلیف اٹھا کر چہارم ماہ مئی 1839 عیسوی کو قندھار میں پہنچے۔''6

اب اسی واقعے کو 'جنگ نامہ کابل' کے منظرنامے پر دیکھیے:

''پانی نہر کا جو مردمان نواب (بہاول خان) نے بند کردیا تھا اس واسطے لشکر پر بہت تکلیف شدید گزری بلکہ پانی کیچڑ کا ملا ہوا بدبو پیا اور اس میں مزبلہ جانوروں کا بھی تھا۔ در دشکم اٹھا دست جاری ہوئے اور دو دن ایک رات وہ بھی میسر نہ آیا تو آدمی اور جانور لشکر کے قریب ہلاکت کے پہنچے اور ماہی بے آب کی مانند تڑپنے لگے۔ اس وقت ایک بھیدی کو بہت سا انعام دے کر شام کو ایک جمعدار، دو حوالہ دار، دو نایک اور بیس سپاہی اور تمیں تائیس رسالہ کے، واسطے کاٹنے بند آب کے بھیجے۔ قدرت خدا کی سے وہ وہاں پہنچے اور پانی کاٹ دیا۔ آدھی رات کے وقت لشکر کے پاس پانی زندگانی پہنچا، تن بے آب میں جان آگئی۔''7

اس سفرنامے کا ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ جنگی مہموں کے باوجود اس میں سید فدا حسین نے جن حالات و واقعات سے قارئین کو روشناس کرانا چاہا ہے اس میں کسی قسم کا سقم نہیں آنے دیا بلکہ اس سفرنامے میں انیسویں صدی کے چوتھے دہے کے ہندوستان و افغانستان کے مختلف شہروں، قصبوں اور گاؤں کی ایسی تصویرکشی کی گئی ہے جس میں قدیم عمارتوں کے آثار و احوال، مساجد، خانقاہیں، زیارت گاہیں، مقابر، محلات، قلعوں کی تفصیلات، بازاروں اور دوکانوں کے نقشے، عجائبات کائنات، معجزات، وبائی امراض، باغات، نہریں، چشمے، قوموں کے خصائص اور خصائل، قوموں کے رسم و رواج، ملبوسات، دولت مندی اور افلاس، صفائی اور گندگی کی تصویریں، مختلف جگہوں کے باشندوں کے عقائد، زبان اور ان کے معاشرتی نظام وغیرہ کو بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ اس سفرنامے کا مصنف سید فدا حسین انگریزی فوج کا ایک سپاہی تھا لیکن باوجود اس کے اس نے اپنے سفرنامہ میں انگریز حکمرانوں کی چالاکیاں اور

عیاریاں بھی دبے لفظوں میں بیان کی ہیں، ساتھ ہی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے نوابوں اور راجاؤں کی انگریز نوازیاں بھی دکھائی ہیں۔ کابل و قندھار کی طرف بڑھتی ہوئی انگریزی فوجوں کا گزر جن ریاستوں سے ہوتا، وہاں کے امرا و رؤسا جس طرح پلکیں بچھا کر ان کا استقبال کرتے وہ بھی دید کے قابل ہے۔

بہرحال آیئے دیکھتے ہیں کہ 'جنگ نامہ کابل' سفرنامے کے اسلوب، فن اور تکنیک کے لحاظ سے سفرنامے کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے یا نہیں۔ یوسف کمبل پوش کے سفرنامے 'عجائبات فرنگ' کی طرز پر 'جنگ نامہ کابل' کا آغاز بھی حمدِ باری تعالیٰ سے ہوتا ہے۔ اس کے اسلوب سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ فدا حسین کو زبان پر کس قدر قدرت حاصل تھی یا ''تعلیمی استعداد کم ہونے کے باعث زبان و بیان پر اسے بہت زیادہ قابو نہیں رہتا۔'' ملاحظہ کیجیے ''جنگ نامہ کابل'' کے ابتدایئے کا یہ اقتباس:

''حمدِ بے حد جناب پروردگار عالم میں واجب ہے کہ اس نے ہژدہ ہزار عالم کو اپنی قدرت کاملہ ایک حرف کن کے ساتھ پیدا کیا اور انسان کو خطاب اشرف الخلوقات عطا کیا اور اس میں سے انبیا اور اولیا کو برگزیدہ کر کے حالات آسمانی اور راز دوجہانی پر آگاہ کیا اور ہزاروں نعمت اور راحت سے بہرہ اندوز کرایا اور انواع طرح کی مصیبت اور بلا میں بعضوں کو مبتلا کیا اور بعضوں کو عوض اس مصیبت کے توفیق صبر و شکر رفیق اس کے کی کہ درجاتِ عالیات ان کے فردوس اعلیٰ میں پہنچائے۔''[8]

مطبوعہ نسخے (مسمیٰ بہ 'تاریخ افغانستان') میں، ذیل کی عبارت کا اضافہ ہے:

''اور ہزاروں درودِ نامحدود اوپر رسولِ مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام اور اصحاب کرام اور ائمہ معصومین اور تابعین علیہم الرحمت والرضوان پر۔

ہوا نازل جو اس کے حق میں لولاک
گیا معراج کو وہ صاحب ادراک

کہ اس نے چراغ ہدایت کو روشن کر کے گمراہانِ بادیہ ضلالت کو راہِ ایمان دکھلائی اور شفاعت ہم گنہگاروں کی اپنی شفاعت پر موقوف فرمائی۔ امابعد۔[9]

فدا حسین نے اپنے سفرنامے میں جس طرح حالات و واقعات اور مختلف کیفیات کی منظرکشی اور جزئیات نگاری کی ہے اسے دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ اگرچہ وہ ایک انگریزی حکومت کا سپاہی تھا، لیکن باوجود اس کے اس کی نگاہیں ایک ماہر سیاح کی طرح پیش آنے والے واقعات و حالات کو دیکھ رہی تھیں اور ایک حساس انسان کی مانندان واقعات و حالات سے لطف اندوز یا غمگین بھی ہوئی جاتی تھیں۔ اس نے جس خوبصورتی سے مختلف ملکوں اور شہروں کے حالات و کوائف، وہاں کے باشندوں کی رسم و رواج اور ان کی بود و باش کو بیان کیا ہے وہ دیکھنے کے قابل ہیں۔ ملاحظہ کریں چند اقتباسات:

''بہاول پور کو دیکھا کہ شہر خوب اور بازار مرغوب۔ جملہ اشیا پارچہ وغیرہ میوہ تر خشک ہر وقت ارزاں موجود اور باغات کی سرسبز و شادابی کی کچھ تعریف نہیں ہو سکتی لیکن لشکر کے شتربانوں نے ہزاروں درخت میوہ دار از راہِ بدذاتی کاٹ کر تباہ کر دیے۔ دو مقام بہاولپور میں کر کے روانہ احمد پور کے کہ چالیس 40 کوس بہاولپور سے ہے دیکھا کہ وہ شہر نہایت خوش اسلوب کہ تعریف اس کی درمیان احاطہ قلم نہیں سماتی اور اندر شہر کے ایک مسجد اور ایک کنواں پختہ بہت صاف اور اچھا کہ بیچ ہندوستان کے ایسی جگہ کم دیکھی۔ لائق عبادت کے جو کوئی دیکھتا ہے دل اس کا وہاں سے جدا ہونے کو نہیں چاہتا۔'' 10

شکارپور کے عوام، وہاں کے مکانات اور زبانِ ہندوستانی کا ذکر یوں کیا ہے:

''وقت پہنچنے شکار پور کے دیکھا کہ شہر شکار پور نہایت خوب با اسلوب آباد، رعیت سب آسودہ اور مہاجن مال دار اور قوم بہت اشراف اس میں رہتی ہیں بازار دلچسپ مکانات دل پسند اور دلکشا عوتیں حسین اور آدمی وہاں کے زبان ہندوستانی بولتے ہیں۔''[11]

شہر کابل جنت نشان کی رونقیں ملاحظہ کیجیے:

''دیکھنے سے شہر کابل کے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے بہشت دوسرا اوپر زمین کے بنایا ہے۔ چار بازار پختہ بہت تحفہ چھتہ پٹا ہوا اور باغات بے نہایت اندر اور باہر شہر کے بہت آبادی، سرسبزی شادابی اور پانی کی افراط بدرجہ کمال، ایک طرف شاہ باغ بہت بڑا اور ایک طرف روضہ جناب سیدالشہدا شاہ مرداں۔''[12]

قندھار کا ذکر کرتے ہوئے وہاں کے باشندوں کے عقائد اور مقامات مقدسہ کے احوال پر بھی ایک نظر ڈال لیتے ہیں:

''شہر نہایت اچھا اور آبادی بہت مگر مرد و زن نہایت کثیف میلے کپڑے، رنگ کے گورے، نقشہ بدزشت، خو مردم آزار، دغاباز، مگر دو مولوی صاحب فاضل اور عالم ایک کا نام مولوی محمد عبداللہ، دوسرے محمد طاہر کہ ہر جمعہ کو مجلس سیدالشہدا ان کے ہاں ہوتی ہے... ایک خانقاہ احمد شاہ درانی کی بہت خوب روضہ بنا ہوا موافق مقبرہ کے اور ایک مسجد اسی خانقاہ میں بہت اچھی اور چار دروازہ شہر کے ہیں اور قلعہ اوپر پہاڑ کے ہے کہ قومِ عاد نے بنایا تھا اور نیچے قلعے کے تمام زیارات ہیں اولیاء اللہ کی اور قلعے میں چار سرنگ بنی ہیں''[13]

فدا حسین نے اپنے سفرنامے میں جو کچھ بیان کیا ہے، ظاہر ہے کہ وہ سب کچھ اپنے بڑے بھائی کی فرمائش پر کیا ہے تاکہ جن شہروں اور علاقوں سے اس کا گزر ہوا ہے اس کا آنکھوں دیکھا حال اپنے بھائی کو بتا سکے، اور وہ اس میں کافی حد تک کامیاب بھی ہوا۔ کہا جاسکتا ہے کہ آج سے تقریباً دو سو سال پہلے کے جن شہروں کے حالات و واقعات کا نقشہ اس سفرنامے میں کھینچا گیا ہے ان سے اس زمانے کے مختلف شہروں، قصبوں اور گاؤں میں بسنے والی قوموں اور قبیلوں کے معاشرتی اور سماجی نظام کی صورت حال سامنے آجاتی ہے۔ فدا حسین نے ان قوموں سے تعلق رکھنے والی تمام تر ضروری معلومات اپنے قارئین تک پہنچانے کی کوشش کی ہے جن سے پڑھنے والوں کو کسی بھی نئے ملک، نئے شہر اور وہاں کے باشندوں کے احوال و کوائف سے پوری طرح واقفیت ہو جائے۔ مثال کے طور پر قوم قزلباش جو اس وقت کابل کے جوار میں بستی تھی جس کے چار محلے تھے، ہر محلے کا ایک سردار تھا، ان کے سماجی اور معاشرتی نظام سے واقف کراتے ہوئے سید فدا حسین لکھتے ہیں:

''چاروں محلّہ ایک صلاح اور ایک بات رکھتے ہیں طاقت کسی کی نہیں کہ اندرونِ محلّہ بے اجازت جاوے۔ بازار اور سب لوازمہ ان کا جدا ہے، ان محلوں میں عمل شاہ یا انگریز کا نہیں بہت سا بندوبست ہے۔ پانچ تلنگی لشکر سے ہمارے روبرو محلّہ چندول میں از راہِ حرامزادہ گی دیکھنے کو گئے تھے، ان کو جان سے مار کر نہر میں ڈال دیا.. کوئی آدمی محتاج اور فقیر نہیں اور ہر ایک گھر میں بہت تحفہ خانہ باغ اور نہر پانی کی جاری اور مکانات دلچسپ کہ نام گرمی کا اور دھوپ کا نہیں ہوتا۔ قوم قزلباش مغل کے غلام خانہ اور پارسیاں مشہور ہیں۔ بول چال ان کی فارسی اور اکثروں کی ترکی اور سبیل نیاز حضرت امام حسینؑ کا رسم اور ایک امام باڑہ بہت تحفہ اور علم حضرت عباس کا بیچ مراد خانی کے اور ایک امام باڑہ اور مسجد عالی چندول میں اور پنجشنبہ کو مجلس اور کتاب ہوتی ہے اور ماتم آٹھویں دن ایسا ہوتا ہے کہ بیاں سے باہر ہے اور زیارات بے شمار ہیں۔''[14]

اسی طرح بت بامیان کی وجہ تسمیہ اور وہاں کے جَو کی خصوصیات کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''بت بامیان کہ کابل سے سو کوس ہے وہ شہر بہت بڑا طرف بلخ کے کہ کھیتی جو کی وہاں ہوتی ہے اور جو وہاں

کی گیہوں سے خوب ہے کہ خوشہ میں اس کے بھوسی نہیں ہوتی اور بت بامیان اس کو اس واسطے کہتے ہیں کہ بیچ شہر کے تین بت بلند کہ قد ہر ایک کا چار سو ہاتھ اونچا۔''[15]

چاری گار کی خوبصورتی اور وہاں کے پھلوں کے اوصاف کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''تیسرے دن داخل مقام چاری گار ہوئے۔ وہ مقام بسبب افراط آبشار و نہر خوشگوار اور میوہ گونا گوں ایک بہشت کا نمونہ ہے انگور مانند لیموں اور سب چکوترہ (ایک قسم کا درختی پھل جو خربوزے سے بڑا ہوتا ہے، جس کا وزن تقریباً آدھا کیلو ہوتا ہے) کے برابر خربوزہ اور سردہ نارنج چار سیر کا اور ارزاں۔ سرد اس قدر کہ پھانک (قاش) کھانے کی طاقت نہیں ہوتی گویا دانت گر پڑیں گے اور زرد شفتالو اور ناشپاتی انار ترنج ہر ایک خوب۔''[16]

کہا جاسکتا ہے کہ اردو سفرناموں میں یوں تو مختلف ملکوں اور شہروں کے تاریخی، جغرافیائی اور تہذیبی حالات کی عکاسی کی جاتی ہے، جس کے سبب ہمارے سفرنامے معلومات کا ایک اہم سرچشمہ بھی قرار دیے جاتے ہیں لیکن ان قدیم سفرناموں سے لسانی ارتقا کا بھی علم ہوتا ہے۔ لسانی ارتقا کے اعتبار سے اگر جنگ نامہ کابل/ تاریخ افغانستان کا مطالعہ کیا جائے تو اس کے ذریعے انیسویں صدی کے چوتھے دہے میں اردو زبان کی بڑھتی ہوئی ترقی کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اس زمانے تک عوام و خواص کی علمی زبان اگرچہ فارسی تھی، لیکن عام بول چال کی زبان میں اردو کا چلن کافی تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ سید فدا حسین نے جسے 'ہندوستانی' زبان کہا ہے وہ دراصل یہی اردو ہے جو اس وقت ہندوستان کے مختلف شہروں میں بولی جانے والی عام زبان تھی۔ سفرنامہ نگار نے اپنے اس سفرنامے میں جس طرز کی انشا اور املا کا استعمال کیا ہے وہ اس دور کی انشا اور املا کے عین مطابق کہے جاسکتے ہیں۔ اس دور کی نمایاں لسانی خصوصیات کے پیش نظر مذکورہ سفرنامے کی انشا اور املا پر ایک نظر ڈال لیتے ہیں:

الف: یائے معروف اور یائے مجہول میں فرق نہ ہونا

جیسے: ''دو دن اور ایک رات گزری پانی نہ ملا سپاہی گھبرا گئی وقت دوپہر کی صاحب نی توپوں کو درابیوں پر رکھا اور سپاہی اور سواروں سی کھچوا کی اوپر پہاڑ کی کہ راہ میں بایل (حائل) تھا جانی کا قصد کیا۔''[17]

ب: دو یا زیادہ الفاظ کو ملا کر لکھنا جیسے: علیخان، بھائیصاحب، جسوقت، بولچال، محمد خانکی، دیکھکر (دیکھ کر)، باغمیں باغ میں) وغیرہ۔

ج: ہائے مخلوط کی بجائے ہائے کہنی دار کا عمومی استعمال جیسے: گہوڑے، (گھوڑے)، بہر (بھر)، کہڑی (کھڑی)، تہا (تھا)، دیکہنے (دیکھنے)، رکہنا (رکھنا)، دہوپ (دھوپ) وغیرہ۔

د: املا کی قدیم طرز جواب متروک ہوچکی ہے۔ مثلاً: باروت (بارود)، اوس (اُس)، دیرہ (ڈیرہ)، بایل (حائل) اور 'گ' کو 'ک' کی صورت لکھنا۔ وغیرہ۔

ہ: جملے کی نحوی ساخت میں بھی آج کی بہ نسبت اس دور کی تحریروں میں کافی فرق ملتا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیں: ''اور جوڑی قاصدوں کی آئی زبانی ان کی معلوم ہوا کہ قندھار سے ایک پلٹن بادشاہی اور پانچ سو سوار کرسٹن صاحب کی ہندوستانی اور چھ ضرب توپ قلات کی طرف کہ چالیس کوس طرف کابل کے ہے آتے تھے۔''[18]

آیئے آخر میں فدا حسین کے سفرنامے سے واپسی کے حالات کو ایک نظر دیکھ لیتے ہیں:

''بعد تھوڑے دن کے کرنال میں آئے اور بخوبی تمام آرام کیا داخل چھاونی کے ہوئے اور یہ عاجز وہاں سے رخصت ہو کر انگلسی لے کر بخیریت تمام شاہجہاں آباد میں آیا اور زیارات بزرگوں کی کر کے مغفرت اپنی کی دعا مانگی۔ غرض بیچ خدمت جمیع سامعانِ کتاب کے یہ ہے کہ ساٹھ ہزار فوج تمیں ہزار بنگال حاطہ کی اور تمیں ہزار بمبئی حاطہ کی لڑائی پر گئی تھی، سب ماری گئی۔ سات ہزار آدمی وہاں سے بچ کر زندہ آئے اور باقی وہیں مدفون ہوئے۔''[19]

واضح ہو کہ اس سفرنامے میں تقریباً ایک سو پچاس اشخاص، تمیں سے زیادہ مقامات، تمیں سے زائد جنگی اصطلاحات اور دس ندیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ دوست محمد خان، اس کے بھائیوں اور اس کے ساتھیوں کی جانبازی کے ساتھ افغانستان کی مختلف قوموں اور قبیلوں کی بہادری اور ان کی جانبازی کو خصوصیت سے پیش کیا گیا ہے جو انگریزی فوجوں کے مقابلے میں سامنے آئے تھے، جن میں سے بہت سوں نے لڑتے ہوئے اپنی جان کی بازی لگائی تو کچھ مقابلے کی تاب نہ لا کر راستے سے ہٹ گئے۔ دوست محمد خان چونکہ اس وقت شاہ شجاع الملک درّانی کو تخت حکومت سے ہٹا کر خود کابل و قندھار کا بادشاہ بن بیٹھا تھا، اسی شاہ شجاع الملک جس سے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کوہِ نور ہیرا حاصل کیا تھا، کی انگریزوں نے اپنے مفاد کے لیے حمایت کرتے ہوئے اسے کابل و قندھار کا دوبارہ بادشاہ بنانے کی خاطر اس جنگی مہم کا آغاز کیا تھا، تاکہ ان کے زیر نگیں حکومت کا دائرہ کابل و قندھار تک بڑھ جائے، جس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔ انھیں انگریزوں سے جنگ کرتے ہوئے دوست محمد خان نے بھی آخر میں کود کر انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ اس پورے واقعے کی تفصیل بھی ذکر کیے گئے سفرنامے 'جنگ نامہ کابل' (قلمی) اور 'تاریخ افغانستان' (مطبوعہ) میں موجود ہے۔

سفرنامہ 'جنگ نامہ کابل' کے اسلوب اور پیش کیے گئے جنگی، سماجی، تاریخی اور تہذیبی حالات و کوائف سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اگرچہ مصنف کو زبان اور طرزِ بیان پر اتنی قدرت نہیں جتنی کہ یوسف کمبل پوش کو ہے، پھر بھی زمانی تفوق اور لسانی ارتقا کے نقطۂ نظر اور سفرنامے کی تکنیک اور اس کے فنی لوازم کے پیش نظر اسے اردو کا پہلا نثری سفرنامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

حوالے:

1۔ اردو سفرناموں کی مختصر تاریخ: مرزا حامد بیگ، ص 53، لاہور 1999

2۔ اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ: پروفیسر خالد محمود، ص 107، این سی پی یو ایل 2011

3۔ اردو سفرناموں کی مختصر تاریخ: مرزا حامد بیگ، ص 53، لاہور 1999

4۔ اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، ص 107

5۔ جنگ نامۂ کابل (قلمی نسخہ): سید فدا حسین، عرف نبی بخش، ص 2، 1840 عیسوی

6۔ حیات افغان: محمد حیات خان، ص 79، مطبوعہ 1867 عیسوی۔

7۔ جنگ نامۂ کابل (قلمی نسخہ): سید فدا حسین، عرف نبی بخش، ص 16، 1840 عیسوی

8۔ ایضاً، ص 1

9۔ جنگ نامۂ کابل (قلمی نسخہ): سید فدا حسین، عرف نبی بخش، ص 3-4، 1840 عیسوی

10۔ ایضاً، ص 5

11۔ ایضاً، ص 9

12۔ ایضاً، ص 31

13۔ ایضاً، ص 19,20

14۔ ایضاً، ص 33

15۔ ایضاً، ص 34-35

16۔ ایضاً، ص 655

17۔ ایضاً، ص 52

18۔ ایضاً، ص 57

19۔ ایضاً، ص 83

نوٹ: یہ مقالہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے بین الاقوامی سمینار (12 تا 14 مارچ 2019) میں پڑھا جاچکا ہے۔

■

Dr. Ali Abbas
Asst. Prof. Dept of Urdu
Punjab University
Chandigarh - 160014
Mob.:09988371214

مہتاب جہاں

سلاطین دہلی کے علمی رجحانات

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے بہت پہلے درس وتدرس اور تعلیمی نظام کا ایک بے حد منظم طریقہ رائج تھا۔ دلی میں بھی تاریخ تعلیم بہت قدیم ہے اس کی تہذیبی تاریخ کی شروعات آریوں کی آمد سے ہوتی ہے اور ہزاروں سال پرانا آریوں کا زمانہ ویدک دور کہلاتا ہے اس دور میں سنسکرت زبان عروج پر تھی۔ اس وقت تعلیم ویدوں کے مطالعے تک محدود تھی اور بچے بچپن سے لے کر جوانی تک ویدہی پڑھا کرتے تھے یہ مطالعہ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے مکمل تصور کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں برہمن عالم علم حکمت، موسیقی، علم ہندسہ اور علم تاریخ وغیرہ ایجاد کر چکے تھے اور درس وتدریس کے لیے آشرم قائم تھے۔ جہاں طلبا رہتے تھے اور بڑی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ گرو اور چیلا یا ششیہ کی روایت تھی۔

تیسری صدی عیسوی میں پراچین ہندوستان میں تکشیلا علوم وفنون کا ایک بڑا مرکز تھا۔ بکرما جیت کے زمانے میں سنسکرت کا بہت عروج تھا۔ بدھ مت کے پیروکاروں نے تعلیم پھیلانے میں بڑا عظیم کام کیا اور نالندہ کی خانقاہ میں ایک بڑا تعلیمی مرکز قائم تھا۔ جو تمام مشرق میں سب سے بڑی یونیورسٹی سمجھی جاتی تھی، دلی میں تومر اور چوہان راجاؤں کے زمانے میں بھی تعلیم کا بڑا چلن تھا۔ بڑے بڑے مٹھوں میں پاٹھ شالائیں قائم ہوئیں جن میں مذہبی تعلیم دی جاتی تھی۔ پرتھوی راج چوہان کے مرنے کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی۔ مکتب اور مدرسہ قائم ہوئے اس وقت اہم تعلیمی مراکز پنجاب، لاہور، ملتان، سندھ، ٹھٹھہ وغیرہ تھے۔ جو بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ اسلامی ہندوستان کے شروعاتی دور میں کئی قسم کے تعلیمی ادارے یا درسگاہیں موجود تھیں۔ جیسے حکومت کی قائم کردہ، خانقاہوں سے وابستہ، مسجدوں سے ملحق، مزارات سے جڑی ہوئی اور انفرادی۔ حکومت کی قائم کی ہوئی درس گاہوں میں مدرسہ معزی اور مدرسہ ناصریہ تھا۔ جو خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ناصریہ مدرسہ ناصرالدین محمود کی یاد میں سلطان التمش نے بنوایا تھا اور منہاج السراج اس مدرسہ کے رضیہ سلطان کے عہد میں پرنسپل تھے۔ مدرسہ معزی قطب الدین ایبک نے اپنے آقا سلطان معزالدین محمد بن سام کے نام پر قائم کیا۔ اس نے دہلی میں اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لیے قصر سفید تعمیر کرایا اور جامع اور مدرسہ معزی بھی تعمیر کرائے اور یہ عمارتیں 1206 تک مکمل ہو چکی تھیں اور اس مدرسہ کے بارے میں منہاج السراج تحریر کرتے ہیں کہ مدرسہ معزی کا صدر دروازہ جامع مسجد یا کسی محل کے دروازہ کی طرح بلند وکشادہ تھا۔ یہ ایک بلند اور وسیع عمارت تھی۔

طبقات ناصری اور دوسری معاصر کتابوں میں التمش کے عہد کی بہت سی اہم عمارتوں کے بارے میں اطلاع ملتی ہے۔ سلطان رضیہ کے احوال کے ضمن میں مدرسہ ناصریہ کا ذکر آتا ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک عظیم دانشگاہ تھی۔ اور اس کے مصارف پورے کرنے کے لیے سلطان التمش نے وقف قائم کیا تھا۔ یہ مدرسہ معزی کے علاوہ الگ دوسرا مدرسہ تھا۔

سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں جب بغداد میں تاتاری حملے ہوئے تو اس علاقے کے باقی ماندہ علما بھی وہاں سے نکل کھڑے ہوئے اور بلبن نے ان عالموں کا خیر مقدم کیا اس طرح ہندوستان کی علمی دنیا کی رونق دوبالا ہوگئی اور دہلی بغداد اور قرطبہ کی ہمسری کا دعویٰ کرنے لگی۔ تاریخ فیروز شاہی میں برنی تحریر کرتا ہے:

''ہم در عصر پادشاہی سلطان بلبن چندین علما برآمدہ کہ از نوادر استاذان بودند بر سر افادت سبق می گفتند......
ہر یکی از ایشان اقلیمی را بپارایہ پیراستہ بودند۔''

اس کے علاوہ بلبن کے عہد میں تعلیم کی مقبولیت صرف اعلیٰ ذات کے لوگوں میں ہی نہیں بلکہ نچلے طبقے کے لوگوں میں بھی نظر آتی ہے۔ اس زمانے میں آج کی طرح تعلیم سرکاری ملازمت کے حصول کے لیے راستہ ہموار و مہیا کرتی تھی۔ لہٰذا دہلی شہر کے لوگ بھی اپنے بچوں کو تعلیم یافتہ بنانے میں دلچسپی لیتے تھے۔ یہ اطلاع بھی ہمیں تاریخ فیروز شاہی بلبن کے عہد کے اہم تاریخی مآخذ سے معلوم ہوتی ہے۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ کمال مہیار ایک نومسلم نچلی ذات کے غلام کا بیٹا تھا اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اگرچہ سلطان نے اس کو کم ذات کا ہونے کی وجہ سے اپنی ملازمت میں لینے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن اس کا بیٹا اعلیٰ تعلیم کی بنا پر سلطان بلبن کے پوتے اور جانشین سلطان معزالدین کیقباد کے ممتاز امرا میں شامل تھا۔ بلبن کے عہد میں دہلی میں دانشورانہ کلچر کو جلا ملی اور دہلی علم و تہذیب کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ یہاں ہندوستان کے دوسرے شہروں اور قصبوں سے ہی نہیں بلکہ دوسرے بیرونی ملکوں سے بھی لوگ علم سے فیض یاب ہونے کے لیے دہلی آیا کرتے تھے۔ یہ اہم معلومات حسن سنجری کی فوایدالفواد سے دستیاب ہوتی ہے۔ ایک اور اہم بات بلبن کے عہد کے بارے میں معلوم ہوتی ہے کہ اس کے عہد میں سلطنت کے قیام سے سلطان بلبن کے عہد تک علم معقول کی تعلیم ممنوع تھی اور اس کے فضلا اپنے علم کی اشاعت نہیں کر سکتے تھے مگر علم معقول کے حامیوں کو جلال الدین اور علاء الدین خلجی کے زمانے میں یہ آزادی فکر نصیب ہوئی اور اس علم کو بہت مقبولیت ملی۔ عقلیت پسند دانشور سلطان کے دربار سے وابستہ ہوگئے۔ مدرسوں میں طالب علم، علم معقول، منطق، فلسفہ کے مطالعے میں دلچسپی لینے لگے اور کائنات وقدرت اور انسان کے رشتوں سے متعلق افکار اور تصورات کی گونج سنائی دینے لگی۔ کئی دیگر علوم اور علمی میدانوں میں دہلی اور ہندوستان کے دانشور اس

زمانے کے یوروپ کے اسکالرز پر بھی سبقت لے چکے تھے۔اور خاص طور سے علم ہئیت اور علم طبعیات میں بہت آگے تھے۔ دہلی اپنے انھیں علماء وفضلاء اور دانشگاہوں کی وجہ سے پرانے اسلامی مراکز بخارا، سمرقند، بغداد، خوارزم، دمشق، تبریز اور اصفہان کا نعم البدل ہوگئی کیونکہ یہ تمام علمی مرکز تاتاریوں کے خون خرابے کی وجہ سے تباہ ہوچکے تھے بلبن اور خلجی حکمرانوں کے بعد تغلقوں نے بھی علمی سرگرمیوں اور اس کی فلاح و بہبودی میں خوب حصہ لیا اور ملک کے ہر حصے میں مدرسے کھل گئے ایک اندازے کے مطابق صرف دہلی ہی میں تقریباً ایک ہزار مدرسے تھے جن میں سے صرف ایک شافعی مذہب کا باقی سب حنفی مذہب کے تھے۔

عہد وسطیٰ کی دلی کا سب سے عظیم الشان و اعلیٰ قدر مدرسہ، مدرسہ فیروز شاہی یا فیروزیہ تھا۔ حوض خاص کے جنوبی کنارے پر جہاں تغلق شاہ نے وہ تاریخی جنگ لڑی تھی جس کے بعد اس کے خاندان کا اقتدار قائم ہوا۔ فیروز شاہ نے 1352 میں اس مدرسہ کی بنیاد ڈالی۔ یہاں کی علمی فضا اور صاف آب و ہوا لوگوں کو بہت پسند آئی اور ایسی اچھی لگی کہ انھوں نے اس مدرسہ کے گردونواح میں اپنے مکانات تعمیر کرنے شروع کردیے اس وجہ سے ایک طرح کا 'مدرسہ ٹاؤن' وجود میں آگیا۔ برنی کہتا ہے:

''مقیمان شہراز شیفتگی ہوای جان ربائی مدرسہ اوطان قدیم راترک می آرند و در جوار مدرسہ مذکور خانہ ھامی سازند۔''

اس مدرسہ کی عمارت دومنزلہ تھی دوسری منزل پر محرابی دالان تھے اور کھڑکیوں کے چھجے باہر نکلے ہوئے تھے۔ پوری عمارت ہندوستون اور مسلم محراب کی انتہائی دلکش آمیزش کا نمونہ تھی۔ مدرسے کے چاروں طرف باغ تھا جس میں خوبصورت روشیں اور سبزہ و گل کی ہر طرف فراوانی تھی۔ کٹرہ کا ایک شاعر 'مطہر اس زمانے میں دلی گھومنے آیا تھا۔ دہلی کی شان وشوکت دیکھ کر ایک طویل نظم 'صفتِ حضرتِ دہلی' کے عنوان سے تحریر کی جس میں اس نے بڑے مؤثر اور دلکش انداز میں اس عمارت کی بناوٹ اور تعمیری خوبصورتی کا ذکر کیا ہے۔ کہتا ہے کہ اس کی دیواریں اتنی چمکدار اور روشن تھیں کہ چہرہ صاف دکھائی دیتا تھا۔ جب عمارت کا عکس حوضِ خاص کے پانی میں پڑتا تھا تو مدرسہ کی چمک دمک سے آنکھیں خیرہ ہوجاتی تھیں وہاں کے انتظام کے بارے میں آگے اطلاع دیتا ہے کہ یہاں استادوں اور شاگردوں کے الگ الگ کمرے ہیں۔ مہمانوں کے لیے مہمان خانے ہیں۔ کمروں میں شیراز، یمن اور دمشق کے قالین بچھے ہوئے ہیں سب استاد شاہی جبہ اور مصری دستار میں ملبوس ہیں:

عالمان عربی لفظ و عراقی دانش
همه درجهٔ شامی و بر مصری دستار

مدرسہ میں قیام وطعام کا انتظام حکومت کی طرف سے ہے جس میں مرغ و ماہی کے علاوہ ہر قسم کے جانور، پھل، حلوے شامل ہیں۔ اس مدرسہ میں اقامتی زندگی پر خاص زور دیا جاتا ہے۔ اساتذہ اور شاگردوں میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔

یہ مدرسہ مشرق کی اعلیٰ ترین درسگاہوں میں شمار ہوتا تھا۔ دور دور سے لوگ اس کو دیکھنے آتے تھے۔ سیرت فیروز شاہی میں تحریر ہے:

ازپی نظاره دیدار او شرق و غرب
کارواں در کارواں و قافله در قافله

تیمور کے حملے 1399 نے شمالی ہندوستان کی خاص طور سے دہلی کی مجلسوں کو درہم برہم کردیا۔ علماء ومشائخ دہلی کو چھوڑ کر مختلف صوبوں میں چلے گئے، سکندر لودھی اور بہلول لودھی نے دوبارہ دہلی شہر کو بسایا اور اس کے کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ حاصل کیا۔ شہر میں شاندار عمارتیں تعمیر کرائیں اور پھر سے دہلی میں بیرونی ممالک سے تجار کی آمد و رفت شروع ہوئی اور کئی دانش گاہیں قائم ہوئیں اور کئی ذی قدر علماء نے دہلی کی طرف رجوع کیا ان میں شیخ عبداللہ، شیخ عبدالعزیز، مولانا رفیع الدین صفوی شیرازی اور مولانا جمال نے لودھیوں کے زمانہ میں بیشتر ممالک کی سیاحت کی۔ اس کے بعد ہندوستان واپس آئے اور مشائخِ ہند کے حالات پر سیر العارفین تصنیف کی۔ اس کے علاوہ شیخ عبدالوہاب بخاری ملتان کے مشہور عالم سکندر لودھی کے زمانے میں دہلی آئے۔ سلطان کو ان سے بڑی عقیدت تھی انھوں نے ایک تفسیر لکھی تھی۔ لودھیوں کے زمانے میں چونکہ سرکاری زبان فارسی تھی۔ سکندر لودھی نے ہندوؤں کو بھی فارسی سیکھنے کی ترغیب دی مگر شروع میں صرف کائستھوں کے سوا اور کسی نے بادشاہ کی بات نہ مانی مگر آہستہ آہستہ ہندوؤں نے بھی فارسی سیکھنی شروع کردی اور مسلمانوں نے ہندی شاعری اور ادب میں بڑا نام کمایا۔

دھلی اپنے انھیں علماء و فضلاء اور دانشگاھوں کی وجه سے پرانے اسلامی مراکز بخارا، سمرقند، بغداد، خوارزم، دمشق، تبریزاور اصفھان کا نعم البدل ھوگئی کیونکه یه تمام علمی مرکز تاتاریوں کے خون خرابے کی وجه سے تباہ ھوچکے تھے بلبن اور خلجی حکمرانوں کے بعدتغلقوں نے بھی علمی سرگرمیوں اور اس کی فلاح و بھبودی میں خوب حصه لیا اور ملک کے ھر حصے میں مدرسے کھل گئے ایک اندازے کے مطابق صرف دھلی ھی میں تقریباً ایک ھزار مدرسے تھے جن میں سے صرف ایک شافعی مذھب کا باقی سب حنفی مذھب کے تھے۔

دہلی میں موٹھ کی مسجد لودھیوں کے عہد کی اپنی طرز کی ایک عمدہ عمارت ہے اس مسجد کے بارے میں کئی قیاس آرائیاں ہیں کہ کسی شخص نے موٹھ کے دانے کو پاکر اسے بار بار بوتے ہوئے اتنا پیسہ اکٹھا کرلیا کہ اس سے ایک مسجد تعمیر کرائی۔ اس لیے اس مسجد کا نام موٹھ کی مسجد پڑا مگر بقول پرفیسر اقتدار حسین صدیقی ''یہ صرف مقامی روایات ہیں اصل تعمیر کرنے والا سکندر لودھی کا وزیر مسند عالی میاں بہلول تھا۔ اور اس سے ملحق ایک مدرسہ بھی بنوایا تھا۔ مصارف پورا کرنے کے سلسلے میں وقف بھی قائم کیا گیا۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی صابر چشتی کو مسجد اور مدرسہ کو چلانے کی ذمے داری سونپی گئی تھی یہ اطلاع مکتوبات قدوسی سے فراہم ہوتی ہے۔

سلاطین دہلی کے بعد مغلوں نے بھی علم کی فلاح و بہبودی میں بے شمار نمایاں کام انجام دیے اور ان کے زمانے میں ہندوستان بھر میں علمی دانشگاہوں کا ایک جال سا بچھ گیا۔ بادشاہ، وزیر، امرا، نوابین ہر ایک نے اس علمی کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور دلی کی ہر گلی میں ایک مدرسہ قائم ہوگیا۔ آج وہ مدرسے رہے نہ ان کے مدرّس مگر وہ دلی کی گلیاں آج بھی ان مدرسوں کے نام سے جانی پہچانی جاتی ہیں۔

منابع:

1۔ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات: خلیق احمد نظامی، ادارۂ ادبیات دلی 1958

2۔ اوراق مصور: خلیق احمد نظامی مطبع جمال پرنٹنگ پریس دہلی 1972

3۔ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی: خلیق احمد نظامی، ندوۃ المصنفین، اردو بازار دہلی 1964

4۔ عالم میں انتخاب: دلی: مہیشور دیال، ناشر اردو اکادمی، دلی، 2015

5۔ بزم مملوکیہ: سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مطبع معارف اعظم گڑھ 1981

6۔ ویژہ نامہ فرہنگ فارسی در ہند: ناشر دانشگاہی دہلی 1997

7۔ تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں: ایس۔ ایم۔ جعفر، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی 1980

8۔ ہندوستان کی قدیم تعلیمی درسگاہیں: ابوالحسنات اعظم گڑھ، 1936

■

Dr. Mehtab Jahan
Dept of Persian
Delhi University
Delhi - 110007
Mob.:9717412946

امتیاز وحید

نہال چند لاہوری اور مذہب عشق

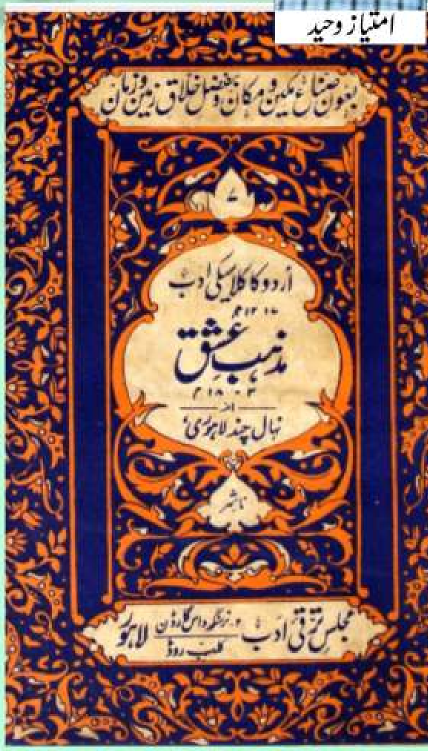

نہال چند لاہوری کی سیرت اور شخصیت کے گرد نامعلوم حقائق کا ہالہ ہے۔ سوائے اس کے کہ نہال چند لاہوری کا مولد و مسکن میر امن دہلوی کی شہرۂ آفاق دہلی ہے اور ان کے آبا و اجداد شاہ جہان آباد کے باسی تھے، سب کچھ پردۂ اخفا میں ہے۔ نہ تاریخِ پیدائش ملتی ہے، نہ تاریخِ وفات اور نہ ہی شجرۂ نسب۔ کہا جاتا ہے کہ دہلی کی طوائف الملوکی کے سیلاب میں اس عہد کے تمام بیش قیمتی حقائق بہہ گئے۔ شرفائے شہر اور اہلِ علموں کو جب نئی جائے اماں کی تلاش ہوئی تو نہال چند لاہوری عروس البلاد لاہور کی پناہ میں آگئے اور اسی نسبت سے 'لاہوری' کہلائے۔ نہال چند لاہوری کی تعلیم و تربیت کہاں ہوئی؟، کس ماحول میں ہوئی؟، افتادِ طبع کیسی تھی؟، کن اساتذہ کے ہاتھوں فارسی اور ریختہ میں صیقل ہوئے تھے، ہنوز وقت کی گرد میں گم ہیں۔ نہال چند کے لاحقے 'لاہوری' کی بھی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں ملتی۔ بذاتِ خود انھوں نے اپنے سوانحی حالات میں کہیں بھی 'لاہوری' کی وضاحت نہیں کی اور نہ ہی قیامِ لاہور کی اطلاع دی ہے۔ ممکن ہے یہ بدعت ان کے تذکرہ نگاروں کی ہو، جنھوں نے دہلی کی طوائف الملوکی سے پیدا شدہ حالات میں لکھنؤ، عظیم آباد اور دکن کی جانب اہلِ کمال کی مہاجرت کے پس منظر میں 'لاہوری' لاحقے کی مناسبت سے احتمالاً یہ نتیجہ مستنبط کرلیا ہو کہ دہلی کے بعد لاہور اُن کا دوسرا مستقر ٹھہرا۔ البتہ اتنی بات تو طے ہے کہ فکرِ معاش نے انھیں 1802 میں کلکتہ پہنچایا اور پھر یہیں 'مذہبِ عشق' کے ترجمے و تالیف کے سبب انھیں شہرتِ دوام حاصل ہوئی۔

نہال چند لاہوری لاہور سے کلکتہ کیسے پہنچے، یہ درمیانی کڑیاں بھی غائب ہیں۔ البتہ یہ سبھی جانتے ہیں کہ ایک دیرینہ واقف کار انگریز ڈیوڈ روبرٹسن کے توسل سے لاہوری ڈاکٹر گل کرسٹ کے حلقۂ اعتماد میں آئے اور بقول سید محمد صاحب ''فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ تالیف و تراجم میں ملازم رکھ لیے گئے''[1] تاہم یہ امر بھی اختلاف سے مبرّا نہیں، ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے نہال چند کو سرے سے فورٹ ولیم کالج کا ملازم تسلیم نہیں کیا اور لکھا ہے کہ ''نہال چند شعبۂ ہندوستانی کے باضابطہ ملازم نہیں تھے''[2]۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم کے موقف کی توثیق 9/ستمبر 1803 میں کالج کونسل کو بھیجی گئی گل کرسٹ کی اس رپورٹ سے بھی ہوتی ہے، جس میں کالج کے غیر تنخواہ دار مصنفین کی کتب پر انعام کی سفارش کی گئی تھی۔ اس طرح نہال چند کے شخصی احوال و کوائف کا باب خاصا اختلافی بلکہ بڑی حد تک نزاعی ہے۔ ان شرربار، شکستہ بلکہ گم شدہ کڑیوں کے باوجود نہال چند کا نام اردو نثر کی تاریخ کا نشانِ راہ بنا ہوا ہے۔ ان کی بنیادی حیثیت ایک مشاق مترجم اور سلیس نثر نگاری کے رجحان کی پرورش کرنے والے کی بنتی ہے۔ ''گل بکاؤلی مسمّٰی بہ 'مذہبِ عشق'۔ نثر بہ زبانِ ہندی۔ قصہ'' ان کا نثری کارنامہ ہے، جس پر نہال چند کی ناموری کی پوری عمارت ایستادہ ہے۔

ہندوستان کی لوک کہانیوں میں گل بکاؤلی نے بڑی شہرت پائی۔ شیخ عزت اللہ بنگالی نے اسے فارسی میں لکھا تھا۔ نہال چند نے اسے فارسی سے اردو میں منتقل کیا اور 'مذہبِ عشق' سے موسوم کیا۔ یہی نثری قصہ بعد میں پنڈت دیا شنکر کول نسیم کے ہاتھوں مثنوی گلزارِ نسیم کی شکل میں پیش ہوا۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے لاہوری کا 'مذہبِ عشق' بنگالی اور نسیم دونوں سے جداگانہ حیثیت کا حامل ہے۔ یہ نہ تو فارسی ہے اور نہ منظوم اردو بلکہ اس کا خمیر وقت کی عوامی اور رابطے کے طور پر ابھرتی ہوئی زبان اردو سے اٹھایا گیا ہے۔ وہ عوامی زبان جس پر بدیسی حکومت کی نگاہیں مرکوز تھیں اور جسے حاکم وقت اپنی استعماری سطوت اور تفکیری میلانات کی توسیع اور نفاذ کی خاطر ایک حربے (Tool) کے بطور ترقی دینا چاہتا تھا۔ یہاں یہ دیکھنا بھی دلچسپی کا باعث ہے کہ گل بکاؤلی کی کہانی سے سروکار رکھنے والے متون کس طرح لحہ بہ لحہ تیزی سے ایک دوسرے متن کی مقبولیت پر خاک ڈال کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ گل بکاؤلی کی لوک کتھا اولاً فارسی زبان میں ضبطِ تحریر میں لائی گئی مگر لاہوری کے اردو پیراہن نے اصل فارسی متن یا ماخذ کو حاشیے پر ڈال دیا، اس طرح کہ عزت اللہ بنگالی اپنے کارنامے کے ساتھ ذہنوں سے تقریباً اوجھل ہوگئے۔ نسیم کی مثنوی کی بدولت کچھ ایسا ہی حشر نہال چند لاہوری کے 'مذہبِ عشق' کا بھی ہوا۔ سالک لکھنوی کے بقول: ''نسیم لکھنوی کی مثنوی اتنی مقبول ہوئی کہ نہال چند لاہوری کا ترجمہ ماند پڑ گیا، لوگ نہال

چند کا نام بھول گئے۔ یاد رہا تو صرف گل بکاؤلی کا قصہ''3

'مذہبِ عشق' کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) کی لائبریری میں موجود ہے۔ انٹرنیٹ پر ایک نسخہ 4 مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے حوالے سے موجود ہے، جس کے صفحات کی تعداد: 102 ہے اور یہ نسخہ باتصویر ہے، اس میں کل 12 تصاویر ہیں۔ ایک صفحے پر عموماً 19 سطور ہیں۔ اس کا سنہ اشاعت 1873 مندرج ہے۔ یہ خطِ نستعلیق میں ہے۔ انٹرنیٹ پر دستیاب 'ریختہ کتب' کے ذخائر میں 'مذہبِ عشق'5 کا جو نسخہ موجود ہے، اس پر سنہ اشاعت 1803 درج ہے۔ یہ خلیل الرحمٰن داؤدی کا مرتب کردہ نسخہ ہے۔ اس کی طباعت قدیم کانٹے دار ٹائپ میں ہوئی ہے۔ عام طور پر اس کے صفحات پر 26 لائنیں ہیں۔ یہ مجلسِ ادب لاہور سے شائع ہوا ہے۔ اصل قصہ کل 154 صفحات پر مبنی ہے، داؤدی کا مقدمہ 16 صفحے اور اخیر کے 8 صفحات اغلاط نامے کے لیے مختص ہیں؛ اس طرح اس نسخے میں کل 203 صفحات ہیں۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) والے قلمی نسخے میں سرورق پر فورٹ ولیم کالج کی مہر کے ساتھ 'گل بکاؤلی مسمّٰی بہ مذہبِ عشق'۔ نثر بہ زبانِ ہندی۔ قصہ' مندرج ہے، یہ خطِ نستعلیق میں ہے، صفحات کی تعداد 103، نسخے کا حجم 19x26 سینٹی میٹر ہے، پہلے صفحہ کی سات سطروں کے علاوہ بقیہ تمام صفحات پر تیرہ سطور پائی جاتی ہیں۔

دیباچے میں فراہم کردہ اطلاع کے مطابق شیخ عزت اللہ بنگالی نے یہ قصہ اپنے معشوق نذر محمد کو کسی دن خلوت میں سنایا تھا، اس کی خواہش پر اسے فارسی میں لکھنا شروع کیا لیکن 1123 ہجری میں دوست کی ناگہانی موت نے بنگالی کو اس حد تک مایوس کر دیا کہ وہ اس مسودے کو چاک کرنے کے درپے ہو گیا، لیکن احباب کے منع کرنے پر ایسا نہ کیا اور آدھے قصے کو فارسی میں منتقل کیا اور آدھے کو 'جوں کا توں' رکھا۔ شیخ عزت اللہ بنگالی نے نذر محمد کو یہ قصہ زبانی سنایا، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اس عہد کا معلوم قصہ تھا۔ تحریری شکل بعد میں دی گئی تاہم اس بین حقیقت کے علی الرغم ایشیاٹک سوسائٹی والے نسخے کی فہرست میں صفحہ 134 پر اس پریشان کن عبارت پر نظر پڑتی ہے:

"Gul-e-Bakawali,-A love story of Tajul Muluk and Bakawali, transted from Hindustani into Persian.ca. 1134/1722 by Izzalullah Bengali"

اسی نوعیت کی ایک دوسری عبارت (بحوالہ فہرست کتب ٹرکش، ہندوستان پشتو جلد دوم) درج کرتے ہوئے عبیدہ بیگم نے سخت تحقیقی گرفت اور جائزے سے کام لیا ہے اور اس مفروضے یا فاش غلطی کی نشاندہی کی ہے۔ نہال چند کے ذریعے عزت اللہ بنگالی کے دیباچے کے ترجمے میں بھی— ''بحکم ضرورت آدھے کو فارسی میں کیا اور آدھا جوں کا توں رکھا'' بطورِ خاص ''جوں کا توں رکھا'' سے خاصے کنفیوژن کو راہ ملی اور شبہ پیدا ہوا کہ انھوں نے اوّلاً یہ قصہ کسی اور زبان میں لکھا ہوگا بعد میں اسے فارسی کا قالب عطا کیا، وہ بھی آدھے ہی قصے کو فارسی میں منتقل کیا اور پتہ نہیں آدھے کے ساتھ کیا معاملہ رہا۔ تاہم اسی دیباچے سے اس غلط فہمی کا ازالہ بھی ہوتا ہے۔

گل بکاؤلی کی کہانی سے سروکار رکھنے والے متون کس طرح لمحہ بہ لمحہ تیزی سے ایک دوسرے متن کی مقبولیت پر خاک ڈال کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ گل بکاؤلی کی لوک کتھا اولاً فارسی زبان میں ضبط تحریر میں لائی گئی مگر لاہوری کے اردو پیراہن نے اصل فارسی متن یا ماخذ کو حاشیے پر ڈال دیا، اس طرح کہ عزت اللہ بنگالی اپنے کارنامے کے ساتھ ذہنوں سے تقریباً اوجھل ہوگئے۔ نسیم کی مثنوی کی بدولت کچھ ایسا ہی حشر نہال چند لاہوری کے 'مذہب عشق' کا بھی ہوا۔ سالک لکھنوی کے بقول: ''نسیم لکھنوی کی مثنوی اتنی مقبول ہوئی کہ نہال چند لاہوری کا ترجمہ ماند پڑ گیا، لوگ نہال چند کا نام بھول گئے۔ یاد رہا تو صرف گل بکاؤلی کا قصّہ۔

قصۂ گل بکاؤلی کی تکمیل کب ہوئی، قطعیت کے ساتھ اس کا علم نہیں ہو پاتا۔ اب تک عزت اللہ بنگالی کے محبوب نذر محمد کی تاریخ وفات کو اس قصے کی تکمیل کا سنہ قرار دیا جاتا رہا ہے۔ کریم الدین، رام بابو سکسینہ نے سالِ تکمیل 1124 ہجری درج کیا ہے، جو لاہوری کے مطابق نذر محمد کے انتقال کا سال ہے۔ باڈلین لائبریری کے فہرست ساز ایتھے کے مطابق قصے کا سنہ تصنیف 1134ھ / 1722 بنتا ہے۔ اسے ڈاکٹر گیان چند جین کی تائید و توثیق بھی حاصل ہے۔ بہر کیف یہ قصہ گل کرسٹ کی فرمائش پر نہال چند نے اردو میں منتقل کیا۔ لارڈ ولزلی کے عہد میں یہ ترجمہ 'مذہبِ عشق' سے موسوم ہوا۔ مترجم کے مطابق لفظی ترجمہ کے بجائے کہیں کہیں عبارت میں حسبِ ضرورت تبدیلی کی گئی اور کہیں کہیں قلم انداز بھی کیا گیا ہے۔ 'مذہب عشق' 1217ھ/ 1803 میں مکمل ہوئی۔ 1804 میں یہ کتاب پہلی بار کلکتے سے منظرِ عام پر آئی۔ خاتمۃ الکتاب پر نہال چند کے قطعاتِ تاریخ سے بھی اس کی صراحت ہوتی ہے۔

(تاریخ سال ہجری)

یہ قصہ ہوا جب بخوبی تمام
تو پھر فکرِ تاریخ تھی صبح و شام
اچانک سنی میں نے آوازِ غیب
کہ ہے مذہبِ عشق تاریخ و نام

(تاریخ سال عیسوی)

ہوئی جب یہ خواہش کروں اب عیاں
یہاں عیسوی سال کو بھی بیاں
تو پھر ہاتفِ غیب نے دی صدا
کہ اس مذہبِ عشق میں کوئی آ
کرے مشربِ جام گر اختیار
تو رازِ نہاں اس پہ ہو آشکار

'مذہب عشق' کا شمار اپنے عہد کی مشہور تصانیف میں ہوتا ہے۔ قصے کی روح میں ہندستان کے داستانوی عہد کی خوشبو ہے تاہم گوپی چند نارنگ نے اس کے مزاج کی نشاندہی کرتے ہوئے اسے ہند ایرانی تہذیب کا زائیدہ بتایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''دراصل یہ ایک مخلوط قصہ ہے جس کی تشکیل قصے کہانیوں کی ملی جلی ہند ایرانی روایتوں سے ہوئی ہے۔ ہندو مسلمانوں کے اختلاط سے ہندستان کی لوک کتھاؤں یا داستانوں پر جو اثرات پڑے، یہ قصہ ان کی دلچسپ مثال ہے''۔

'مذہب عشق' ایک داستانوی قصہ ہے، جو اپنے زمانے کے مطابق انھی خصائص اور عناصر سے مملو ہے جو داستان کے تکوینی عناصر خیال کیے جاتے ہیں۔ بادشاہ، شاہزادے، دیو، پریاں اور تخیلات کی استخواں بندی وغیرہ تاہم یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ لاہوری کے مذہبِ عشق کے تناظر میں 'گل بکاؤلی' کی تاریخی اصلیت کو بھی ٹٹولنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی طرف 'گلدستۂ حیرت معروف بہ تواریخ بکاؤلی' میں غالباً محمد یعقوب ابن اکبر خاں لکھنوی نے توجہ مبذول کی ہے۔ مطبع گلزارِ محمدی، لکھنؤ سے 1293 ہجری میں شائع ایک قصے کے مطابق دکن میں کرن جوت نام کا ایک راجہ تھا، شاستر جوگ اور راج بھوج اس کے دو بیٹے تھے۔ چھوٹے بیٹے کے گھر ایک خوبصورت لڑکی پیدا ہوئی، راجکماری کو پھولوں کا بہت

شوق تھا۔ سوہن بھدر نامی ایک جوگی اس پر عاشق ہوگیا۔ جوگی نے راجکماری کے لیے ایک ایسا درخت لانے کا وعدہ کیا جو رنگت اور خوشبو میں بے مثال ہو تاہم شرط یہ رکھی کہ راجکماری کو ساری عمر کنواری رہنا ہوگا۔ جوگی کے اس درخت کا نام بکاؤلی تھا، اس رعایت سے راجکماری بکاؤلی کے نام سے معروف ہوگئی۔ محمد یعقوب نے تاریخی شواہد کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ بکاؤلی کا قلعہ اور باغ کے آثار ناگپور کمشنری کی تحصیل رام گڑھ میں آج بھی امر کنٹک جنگل کے اندر موجود ہے۔

'مذہبِ عشق' کی ابتدا حمد وثنا، نعت اور ایک منقبت سے ہوتی ہے۔ وجہ تصنیف کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے۔ داؤدی کے مرتب کردہ نسخے میں پورے قصے کو چھبیس مختلف ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔ ہر باب میں مذکور قصے کی رعایت سے عناوین قائم کیے گئے ہیں۔ مذہبِ عشق میں مندرج تاج الملوک اور گل بکاؤلی کی عشقیہ داستان کی تفصیل میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں تاہم اس میں مستعمل زبان واسلوب اور اندازِ پیش کش، داستانوی عناصر، قصہ پن، کردار، دلچسپی، تمثیل اور علامات سے کام لینے کی لاہوری کے ادبی حربوں کی تفہیم کے لیے مذہبِ عشق کے چند اقتباسات پر غور وخوض دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

بکاؤلی کے حسن کا بیان ملاحظہ ہو:

''اس کے رنگ روپ کی جوت سے زمین وآسمان نورانی اور اس کی چشمِ مست سے نرگس کو ہمیشہ حیرانی۔ لبِ نازک کے رشک سے لالہ خون میں غلطاں، ابرو کی چاہ سے ہلال زار و ناتواں ہے۔ معلم بہار اس کے غنچۂ دہن سے کوئی حرف نہ سنے تو اطفال شگوفہ کو پھولنے کا سبق نہ دے سکے۔ اگر زنگیِ شب اس کی زلفِ مشکیں کے سائے میں نہ آئے تو آفتاب کی تیغِ شعاع سے مارا جائے''

اب اس مرصع اور سجی دھجی عبارت کے بعد سادگی سے مملو ایک دوسری عبارت دیکھیے:

''چاروں طرف سے لڑکوں نے آکر گھیرا کہ بابا ہمارے واسطے کیا لایا ہے۔ شاہزادہ چپکا ایک ایک کا منہ تکنے لگا۔ اتنے میں اس چڑیل نے ایک کلہاڑی لا، تاج الملوک کے ہاتھ میں دی کہ جا لکڑیاں کاٹ لا، شاہزادہ اس فرصت کو غنیمت سمجھا۔ جنگل میں گیا لیکن اس طلسماتِ عجیب کے حالات سے حیران تھا''

فارسی سے ترجمہ ہونے کے سبب 'مذہبِ عشق' میں قائم کردہ عناوین فارسی انداز اور طرز پر رکھے گئے ہیں۔ زبان کی سطح پر سادگی اور سلاست نظر نہیں آتی۔ حسنِ صورت کا بیان ہو کہ عیش طرب کا، سادگی سے عاری ہیں۔ عبارت فارسی کے سحر سے کلیتہً آزاد نہیں، تاہم بناؤ سنگار والی نثر کے بیچ جگہ جگہ سادگی اور عام بول چال سے قریب زبان توانائی کے ساتھ نظر آتی ہے، جو یقیناً فورٹ ولیم کالج کا مطلوب ومقصود تھا۔ مذہب عشق میں نسائی کردار کی کمی نہیں لیکن نسوانی زبان ومحاورے کی قلت ہے۔ فارسی اثرات اور اسلوب کے مابین ہندی کے نرم اور شیریں الفاظ کالبرق فی الدجیٰ کا درجہ رکھتے ہیں اور بھلے محسوس ہوتے ہیں۔ معاشرتی مرقعوں پر نظر پڑتی ہے، تمثیلی اندازِ بیان، پند ونصائح اور قرآن وحدیث کے حوالوں سے قصے کے تسلسل اور روانی میں کمی کا احساس گزرتا ہے۔ کردار نگاری کی سطح پر محض دو نمائندے کرداروں 'تاج الملوک اور گل بکاؤلی کی اجارہ داری نظر آتی ہے۔ معاون کرداروں کی لو مدھم ہے تو کہیں اور مدھم جبکہ عام داستانوں کی طرح مرکزی کرداروں کا عشقیہ کمٹمنٹ دیدنی ہے۔ داستان میں طلسمات اور فوق فطری عناصر کے بیان میں تخیلات کی مدد سے تراشے گئے چھوٹی بڑی معاون اشیا، حوض، درخت، ہیرے جواہرات، حشرات الارض جیسے سانپ، کشف وکرامات سے مملو انجانی محافظ قوتیں، روح فرسا دیو کے ذکر سے داستانوی ماحول سازی میں مدد لی گئی ہے۔ یہ بھی پہلو عمدہ ہیں— ہندستانی عناصر کی افزودگی سے داستان پر ہندستانی فضا یا ہندوستانیت کی گہری چھاپ ہے۔ مندر، سرسوں کا تیل، رسوم ورواج اور نشست وبرخاست کے اظہار میں ہندستانیت کے واضح اثرات دیکھے جاسکتے ہیں البتہ بعض مقامات اور اسما کے بیان میں ہندایرانی روایات کو ملحوظ رکھا گیا ہے جیسے شہر شرقستان، فردوس، رضوان شاہ وغیرہ

'مذہبِ عشق' کے متعدد ایڈیشنوں کی اشاعت سے اس کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ سرابراہم گرسن نے لنگوئسٹک سروے آف انڈیا میں اس کے مختلف ایڈیشنوں کی طویل تفصیل دی ہے۔ اس کی معنویت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ اسے آر پی انڈرسن نے انگریزی میں ترجمہ کیا، جو 1851 میں دہلی سے شائع ہوا۔ اس سے قبل ٹی بی مینول نے بھی اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا جسے گارساں دتاسی نے 1858 میں پیرس سے شائع کیا۔ اس کی اہمیت اس سے بھی واضح ہوتی ہے کہ 9ر ستمبر 1803 میں کالج کونسل سے گل کرسٹ نے فورٹ ولیم کالج کے غیر ملازم مصنفین کی کتب پر انعام کی جو سفارش کی تھی، اس میں قصہ گل بکاؤلی (مذہبِ عشق) پر 150 روپے انعام کی تجویز پیش کی گئی تھے۔6

فورٹ ولیم میں اردو نثر کے بیک وقت تین روپ— فارسی اور عربی مزاج، دوسرا خالص ہندی مزاج اور تیسرا ہندی، عربی، فارسی، مقامی زبانوں اور روزمرہ کے امتزاج سے مرتب کردہ نثر کو متحرک رکھنے کی کوشش۔ مذہبِ عشق کو فورٹ ولیم کالج کے 'باغ وبہار' جیسا کامیاب بلکہ فائز المرام نثر کی حیثیت سے تو نہیں دیکھا جاسکتا تاہم عوامی دلچسپی کے قصے اور کہانیوں کی راہ سے برطانوی اقتدار کی توسیع پسندانہ آئیڈیالوجی اور اس کے منشا کو بڑی حد تک پورا کرنے والی نثر کی حیثیت سے اسے ضرور دیکھا جاسکتا ہے۔ کولونیل مقاصد کے تحت فورٹ ولیم کالج میں ابھرنے والی اردو نثر نے فارسی کی حاکمیت (Establishment) اور رائج ثقافتی محور پر اصرار کرنے والے رویے سے ذہنی اور فکری انحراف کی راہ پیدا کی تو نہال چند لاہوری کے 'مذہبِ عشق' کو اس قافلے میں شامل ایک توانا آواز کی حیثیت سے ضرور یاد کیا جائے گا۔

حوالے

(1) اربابِ اردو نثر، مولوی سید محمد صاحب، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 1977، ص 277

(2) فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، ڈاکٹر عبیدہ بیگم، نصرت پبلشرز، لکھنؤ، ص 211

(3) بنگال میں اردو نثر کی تاریخ، سالک لکھنوی، مغربی بنگال اردو اکادمی، 1998، ص 91

4. https://archive.org/details/in.ernet .dli .2015. 440176

5. httphttps://www.rekhta.org/ebooks/for t-william-college-ki-adabi-khidmaat-dr-ubaida-begam-ebooks

6. reporting of the college of fort william vol. 559, p. 297-289

■

Imteyaz Waheed
Calcutta University Teachers' Quarter
P1/7, CIT Scheme, VII-M
Kankurgach, Maniktala
Kolkata-70054
Mobile 85838708

'مذہبِ عشق' کے متعدد ایڈیشنوں کی اشاعت سے اس کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ سرابراہم گرسن نے لنگوئسٹک سروے آف انڈیا میں اس کے مختلف ایڈیشنوں کی طویل تفصیل دی ہے۔ اس کی معنویت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ اسے آر پی انڈرسن نے انگریزی میں ترجمہ کیا، جو 1851 میں دہلی سے شائع ہوا۔ اس سے قبل ٹی بی مینول نے بھی اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا جسے گارساں دتاسی نے 1858 میں پیرس سے شائع کیا۔

ندیم احمد انصاری

الٰہی بخش نشاط کاندھلوی اور ان کی 'بکٹ کہانی'

مفتی الٰہی بخش کاندھلوی شاہ عبدالعزیز دہلوی کے ممتاز شاگرد، خاتمِ مثنوی معنوی، عربی، فارسی اور اردو زبان میں سیکڑوں کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ اپنے وقت کے جلیل القدر علما اور باکمال اولیا میں سے نیز تبلیغی جماعت کے بانی مولانا محمد الیاس کاندھلوی کے جدِ امجد ہیں۔ الٰہی نے الٰہی بخش کو ادب کا لطیف وعمدہ ذوق بھی بخشا تھا، جس کا ثمرہ یہ ظاہر ہوا کہ عربی، فارسی اور اردو ہر سہ زبانوں میں آپ نے کمالِ فن کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ آپ کا تخلص نشاط ہے۔ تینوں زبانوں میں متعدد منظوم ترجمے، قصیدے اور منظومات وغیرہ پر وقیع کلام آپ سے یادگار ہے۔ کریم الدین پانی پتی صاحبِ 'طبقاتِ شعرائے ہند' رقم طراز ہیں:

مفتی الٰہی بخش جو بڑا عالم گزرا ہے، اس کی تصنیف سے اردو میں بہت سے رسالے مشہور ہیں۔[1]

درس وتدریس اور ارشاد وتبلیغ کے علاوہ مفتی صاحب نے تصنیف وتالیف کی طرف خصوصی توجہ مرکوز رکھی اور عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں متنوع موضوعات پر کثیر کتب تصنیف کیں۔ اس وقت تک ان کی ایک سو پانچ تالیفات وتصنیفات دریافت ہو چکی ہیں، جن میں سے سینتیس (37) عربی میں، انسٹھ (59) فارسی میں اور آٹھ (8) اردو زبان میں ہیں، جب کہ ان کی متعدد تالیفات و تراجم ضائع ہو چکے ہیں۔

سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

مفتی الٰہی بخش شاہ عبدالعزیزؒ کے ممتاز شاگرد اور مرید تھے۔ بڑے فقیہ، طبیب، شاعر اور مصنف تھے۔ اکثر تصانیف تصنیف کرنے کے بعد اپنے شاگردوں کو عنایت فرما دیتے تھے، اس لیے بہت کم تصانیف محفوظ رہیں۔ عربی، فارسی، اردو پر یکساں عبور تھا۔ قصیدہ 'بانت سعاد' کی عربی میں شرح لکھی، جس میں ہر شعر کا عربی، فارسی اور اُردو میں منظوم ترجمہ ہے۔ مثنوی مولانا روم کا تکملہ لکھا، جو مطبوع ومشہور ہے۔[2]

مفتی صاحب کی طرح آپ کے صاحب زادے؛ مولوی ابوالقاسم اور مولوی ابوالحسن بھی قادرالکلام شاعر تھے، جن سے ایک طویل تصنیف 'بحرِ حقیقت' اور اس کا ایک مستقل حصہ بنام 'گلزارِ ابراہیم' یادگار ہے۔ 'گلزارِ ابراہیم' کے نام سے اردو زبان میں ایک تذکرہ بھی موسوم ہے، جو 'علی ابراہیم' کا مصنفہ ہے۔

مفتی الٰہی بخش شاہ عبد العزیزؒ کے ممتاز شاگرد اور مرید تھے۔ بڑے فقیہ، طبیب، شاعر اور مصنف تھے۔ اکثر تصانیف تصنیف کرنے کے بعد اپنے شاگردوں کو عنایت فرما دیتے تھے، اس لیے بہت کم تصانیف محفوظ رہیں۔ عربی، فارسی، اردو پر یکساں عبور تھا۔ قصیدہ 'بانت سعاد' کی عربی میں شرح لکھی، جس میں ہر شعر کا عربی، فارسی اور اُردو میں منظوم ترجمہ ہے۔ مثنوی مولانا روم کا تکملہ لکھا، جو مطبوع و مشہور ہے۔

مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کی صحیح تاریخِ ولادت تو معلوم نہ ہو سکی، البتہ 1162ھ (1746-48) میں قصبۂ کاندھلہ، ضلع مظفر نگر کے ایک قدیم علمی خانوادے میں آپ پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ تک پہنچتا ہے۔ سر سید احمد خان لکھتے ہیں:

یہ خاندان حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، خلیفۂ اول رسولِ اکرمؐ کی نسل میں ہے۔ اب سے پانچ سو برس گذرے، بہ عہدِ سلطنتِ فیروز شاہ تغلق یہ خاندان ہندستان کے اس حصے میں آ کر آباد ہوا۔[3]

بچپن وطن میں گذرا، والدین کے سایے میں پرورش وتربیت پائی۔ قرآن پاک حفظ کیا اور فارسی، عربی کی ابتدائی کتابیں متوسطات تک والد ماجد سے اخذ کیں۔ متوسطات کی تعلیم کے بعد دہلی کا سفر ہوا۔ آگے کے تمام مراحل یہیں طے کیے۔ تقریباً چودہ سال کی عمر میں دہلی تشریف لے گئے تھے۔ یہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا آخری زمانہ تھا۔ ان سے اکتساب کے شواہد تو دست یاب نہیں، البتہ ان کی وفات کے بعد شاہ عبدالعزیز دہلوی جب مسندِ درس پر رونق افروز ہوئے تو ان کے ابتدائی پانچ شاگردوں میں سے ایک آں موصوف بھی تھے۔

آپ کے تذکرہ نگار کا کہنا ہے:

یہ شاہ ولی اللہ کی زندگی کے آخری ایام تھے، اس لیے حضرت شاہ صاحب سے تعلیم وتلمذ کا موقع نہیں ملا، ممکن ہے تبرکاً کچھ پڑھا ہو، لیکن مفتی صاحب کے زمانۂ طالبِ علمی کی لکھی ہوئی وہ بیاضیں جن میں اس دور کے احوال و متعلقات درج ہیں، میری نظر سے نہیں گذری۔ مفتی صاحب کی جو تحریریں اس وقت تک میری نظر سے گذری ہیں، ان میں شاہ ولی اللہ سے براہِ راست تلمذ کا کوئی اشارہ نہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ کی وفات 29 محرم 1176ھ کے بعد شاہ عبدالعزیز نے مسندِ درس وافادے کو زینت بخشی اور سب سے پہلے جو چار پانچ طالب علم شاہ عبدالعزیز کے حلقۂ درس سے فیض یاب ہوئے، اس میں مفتی الٰہی بخش شامل تھے۔4

یہاں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبد القادر جیسے جبالِ علم آپ کے ہم جماعت رہے۔ قرآن مجید کا اولین اُردو ترجمہ انھیں حضرات نے کیا۔ جیسا کہ ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا ہے:

اردو میں قرآن شریف کا پہلا ترجمہ مولانا شاہ رفیع الدین نے کیا۔ یہ ترجمہ لفظی تھا یعنی قرآن شریف کے ہر لفظ کا اس طرح ترجمہ کیا گیا کہ اردو فقروں کی ساخت بالکل بدل گئی۔ اس ترجمے میں سلاست اور روانی نہ ہونے کی وجہ سے اصل مفہوم سمجھنا مشکل تھا۔ شاہ رفیع الدین نے یہ ترجمہ 1776 میں کیا تھا۔ تقریباً نو سال بعد یعنی 1795 میں شاہ رفیع الدین کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر نے بھی قرآن شریف کا اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ پہلے ترجمے کے مقابلے میں زیادہ سلیس، شگفتہ اور آسانی سے سمجھ میں آنے والا تھا۔5

اس اقتباس کو یہاں نقل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قارئین کے پیشِ نظر یہ بات رہنی چاہیے کہ مفتی صاحب کو کن کبار علما کے ساتھ کی رفاقتِ درس کا موقع ملا اور یہ بھی کہ وہ زمانہ اردو کے ارتقائی دور کا تھا، جس میں سلیس وشگفتہ اردو کا عام رواج نہ تھا۔ یہ غالب سے بھی قبل میر کا زمانہ ہے۔

مفتی صاحب نے شاہ عبد العزیز صاحب سے ظاہری علوم کے ساتھ باطنی علوم کی تعلیم حاصل کی اور اجازت وخلافت سے نوازے گئے۔ علاوہ ازیں آپ سید احمد شہید بریلوی اور اپنے چھوٹے بھائی مولانا کمال الدین سے بیعت ہوئے، جس سے آپ کی کسرنفسی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان دونوں حضرات نے بھی آپ کو خلافت واجازت سے سرفراز فرمایا۔ جیسا کہ ' کاروانِ ایمان وعزیمت ' میں مرقوم ہے:

1234ھ کے ماہِ ربیع الاول میں سید صاحب کی ملاقات و بیعت سے مشرّف ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر بہتر سال اور سید صاحب کی عمر چونتیس سال تھی۔ ایک ایسے شخص سے بیعت ہونا جو عمر میں اڑتیس سال چھوٹا اور رسمی طور پر عالم نہیں تھا، آپ کی للّٰہیت، بے نفسی اور خلوص کی دلیل ہے۔6

تعلیم سے فراغت کے بعد مفتی صاحب نے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز اپنے استاذ و شیخ شاہ عبدالعزیز دہلوی کے حکم واجازت پر نواب 'ضابطہ خاں' خلف نواب نجیب الدولہ کے مرکزِ حکومت غوث گڑھ سے کیا، جہاں

مفتی صاحب کو شعر و سخن کا خصوصی ذوق تھا۔اس سلسلے میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ اختتام مثنوی مولانا روم ہے، جو مولانا روم کی وفات (672) کے تقریباً ساڑھے پانچ سو سال کے بعد کی تصنیف ہے۔جس کا واقعہ یہ ہے کہ مولانا روم نے اپنی مثنوی معنوی کے چھٹے دفتر کو ایک قصہ بیان کرتے کرتے اس کا مقصد اور انجام ذکر کیے بغیر شیخ بہاوالدین کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کہہ کر اچانک ختم کر دیا تھا کہ اس داستان کا بقیہ حصہ ایسے شخص کی زبان و قلم سے پورا ہوگا جو زندہ اور بیدار دل رکھتا ہوگا اور معرفت میں کامل و مکمل ہوگا۔

آپ صدر مفتی کے عہدے پر فائز رہے۔ یہیں سے آپ کے نام کے ساتھ 'مفتی' کا سابقہ ہمیشہ کے لیے لاحق ہو گیا۔ ایک عرصے یہاں خدمات انجام دینے کے بعد کوٹہ، راجستھان، بھوپال اور سہارنپور وغیرہ میں مختلف دینی و علمی خدمات انجام دیں اور عمر کے آخری دور (تقریباً 1230ھ، 1815) میں مفتی صاحب نے اپنے وطن میں اقامت اختیار فرمائی اور تاوفات تعلیم و تدریس، ارشاد و تبلیغ، تصنیف و تالیف، وعظ و تلقین وغیرہ میں مشغول رہے۔ اسی مشغولیت میں اتوار کی شام 15 جمادی الاخریٰ 1245ھ (13 دسمبر 1829) کو مغرب کے وقت اس دارِ فانی سے کوچ کیا اور اگلے دن کاندھلہ کی موجودہ عیدگاہ سے ملحق اپنے خاندانی قبرستان میں سپردِ خاک کیے گئے۔

1857 سے قبل اور بعد جنگِ آزادی اور دین کی بقا میں کارہائے نمایاں انجام دینے والوں میں سے اکثر علما حضرات مفتی صاحب کے شاگرد یا شاگردوں کے شاگرد ہیں۔ مع ان کے مولانا سید محمد قلندر جلال آبادی، مولانا عبدالرزاق جھنجھانوی، مولانا مملوک العلی نانوتوی، مولانا احمد علی محدث سہارن پوری، مولانا محمد قاسم نانوتوی (بانی دارالعلوم دیوبند)، مولانا رشید احمد گنگوہی (سرپرست دارالعلوم دیوبند)، مولانا محمود الحسن گنگوہی (صدر مدرس دارالعلوم دیوبند) وغیرہ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

مفتی صاحب کو شعروسخن کا خصوصی ذوق تھا۔ اس سلسلے میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ اختتام مثنوی مولانا روم ہے، جو مولانا روم کی وفات (672) کے تقریباً ساڑھے پانچ سو سال کے بعد کی تصنیف ہے۔ جس کا واقعہ یہ ہے کہ مولانا روم نے اپنی مثنویِ معنوی کے چھٹے دفتر کو ایک قصہ بیان کرتے کرتے اس کا مقصد اور انجام ذکر کیے بغیر شیخ بہاوالدین کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کہہ کر اچانک ختم کر دیا تھا کہ اس داستان کا بقیہ حصہ ایسے شخص کی زبان وقلم سے پورا ہوگا جو زندہ اور بیدار دل رکھتا ہوگا اور معرفت میں کامل و مکمل ہوگا۔ اسی پیشین گوئی کی تکمیل مفتی صاحب نے مثنوی معنوی کا اختتام لکھ کر کی، جو زمانۂ تصنیف سے آج تک برابر شائع ہو رہی ہے۔

وقتِ رحلت آمد و جستن زجو
کل شیء هالك الا وجهه
باقیِ ایں گفتہ آید بے زباں
دردِ دل آں کس کہ دارد نورِ جاں

یعنی دنیا سے رحلت کا میرا وقت قریب آ گیا ہے، اللہ کی پاک ذات کے سوا ہر شئے کو فنا ہے۔ یہ باقی داستان ایسے شخص کی زبانی مکمل ہوگی، جس کا دل زندہ و بے دار ہوگا۔

نورالحسن راشد کاندھلوی کے بقول اردو شعروزبان پر غیر معمولی قدرت کا گواہ ترجمہ مثنوی مولانا روم ہے۔ اس کا اسلوب تمام تر مثنوی مولانا روم کا اسلوب ہے۔ اس کی لَے اتنی دھیمی، الفاظ کا تناسب اتنا حسین اور معانی کا تموج ایسا پُر شور ہے کہ قاری کو مکمل طور سے اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ افسوس ہے کہ مفتی صاحب نے اس گراں مایہ کارنامے کو مکمل کرنے کی فرصت نہ پائی، مگر مولانا ابوالحسن نے جو الولد سر لابیہ کے مصداق تھے اس کو اسی رنگ، اسی انداز سے اختتام تک پہنچا دیا۔ اس کے علاوہ اردو کلام کا ایک مستقل دیوان ہے۔ ایک دیوان اور تھا جس کو حضرت شاہ عبدالعزیز نے لفظ بہ لفظ ملاحظہ فرمایا تھا اور اس پر منظوم تقریظ بھی تحریر فرمائی تھی۔ افسوس کہ متاعِ گراں مایہ بے قدری کی نذر ہو گئی۔ اس کے علاوہ مفتی صاحب نے متعدد دینی، فقہی موضوعات اور عقائد نیز سنت و بدعت کے مسائل کو بھی اختصار سے مختلف نظموں اور قطعات میں نظم کیا ہے۔ یہی حال فارسی شعرو

ادب کا ہے۔ فارسی اور اردو کی طرح عربی ادب میں نثر نویسی اور شعر کا ذوق (بھی) اسی معیار کا ہے۔ مفتی صاحب کے ممتاز معاصرین اور تذکرہ نگار اس کمالِ فن کے قائل اور معترف ہیں۔7

مفتی صاحب کا ایک کمال یہ ہے کہ ان کا زمانہ فارسی کے عام رواج اور اردو کا ارتقائی دور ہونے کے باوجود انھیں تغیرِ زمانہ کے احساس نے اردو زبان میں طبع آزمائی کرنے پر آمادہ کیا، یہ اور بات ہے کہ اردو نثر میں ان کا کوئی معتبر نمونہ دست یاب نہیں، البتہ منظومات میں جیسا کہ مذکور ہوا کافی سرمایہ ان سے یادگار ہے۔ دو دیوان، ترجمۂ مثنوی اور متعدد نظموں کے علاوہ ایک بارہ ماسہ بنام ' بکٹ کہانی' بھی ان کی تصنیف ہے۔

'بارہ ماسہ' مثنوی کے فارم میں لکھی جانے والی وہ صنفِ شاعری ہے جس میں بارہ مہینوں کی داستانِ ہجر ایک عورت کی زبان میں بیان کی جاتی ہے۔اس میں عورت مخاطب اور مرد گویا بُتِ خاموش ہوتا ہے اور عشق اور غمِ عشق کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ایک عورت سال بھر ہر ماہ موسم کے اعتبار سے جس کرب وغم سے گزرتی ہے، اس صنف میں اُس کی آپ بیتی کوسوز وگداز کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔سال کے مہینوں کا بیان بکرم سمبت کے مطابق ہوتا ہے۔ اردو زبان میں سب سے مشہور بارہ ماسہ 'افضل جھنجھانوی' کی 'بکٹ کہانی' ہے۔ جس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں:

سنو سکھیو بکٹ موری کہانی
بھئی ہوں عشق کے غم سوں دیوانی
نہ مجھ کو بھوک دن نہ نیند راتا
برہ کے درد سوں سینہ پراتا

مفتی صاحب نے بھی اسی طرز پر ایک بارہ ماسہ کہا، جس میں تقریباً 456اشعار ہیں۔ اس کا مخطوطہ ' مخزونہ انڈیا آفس لائبریری، لندن' میں محفوظ ہے۔اس کے کیٹ لاگ میں بلوم ہارٹ نے درج کیا ہے:

An other poem on the same subject and hanving the same title written by Ilahi Bakhsh of Kandhla has been published at Delhi in 1868 and at Lucknow in 1881 end.

یہ اطلاعات تنویر احمد علوی کی فراہم کردہ ہے۔8 ان کا کہنا ہے کہ جس بکٹ کہانی کا ذکر الٰہی بخش آف کاندھلہ کے تعلق سے کیا گیا ہے، وہ مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلوی کی تصنیف ہے۔ جو افضل کی بکٹ کہانی سے تحریک پا کر ہی لکھی گئی۔ جیسا کہ مصنف نے خاتمے میں کہا ہے۔9

سنی ہوگی تم نے بکٹ کہانی
سب اوس کے خامہ کی آتش فشانی
ولیکن میں جو دیکھا اوس کو سارا
طبیعت نے مری اک جوش مارا
یہ آیا دل میں کہیے اک کہانی
بیاں ہو جس میں سوزِ دل نہانی

نیز 'حکایتِ حال' سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔10

کہوں قصہ میں اپنے درد و غم کا
جو کچھ ہیگا لکھا اپنے کرم کا
حقیقی تک نہ تھا درجہ میرا ری
مجازی عشق کا دکھڑا پڑا ری
مرا اک سانورے کے ساتھ دل مل
ہوا مانند گل خوش وقت کھل کھل
رہی میں رات دن اوس ساتھ خوش حال
لیا میں اپنے جی کو ایسا جنجال
اگر چلنے کا پھر تم نام لوگے
تو میرا جیوڑا ہاتھوں سے دوگے
اگر دل میں تھی کرنی یہ جدائی
تو ظالم پہلے ہی کیوں پیت پلائی

تنویر احمد علوی نے اس کا لسانی تجزیہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس بکٹ کہانی کی زبان کا مطالعہ ہمیں کھڑی بولی کے اس روپ کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے جو اردو کی اصل روپ ریکھا ہے۔اس پر ہریانوی اور برج کا بھی اثر ہے اور پنجابی ومیواتی کا بھی۔ لیکن اس کا رنگ روپ، اس کا آکار پرکار اپنا ہے۔

'بارہ ماسہ' مثنوی کے فارم میں لکھی جانے والی وہ صنف شاعری ہے جس میں بارہ مہینوں کی داستانِ ہجر ایک عورت کی زبان میں بیان کی جاتی ہے۔اس میں عورت مخاطب اور مرد گویا بُت خاموش ہوتا ہے اور عشق اور غمِ عشق کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ ایک عورت سال بھر ہر ماہ موسم کے اعتبار سے جس کرب و غم سے گزرتی ہے، اس صنف میں اُس کی آپ بیتی کوسوز و گداز کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔سال کے مہینوں کا بیان بکرم سمبت کے مطابق ہوتا ہے۔ اردو زبان میں سب سے مشہور بارہ ماسہ 'افضل جھنجھانوی' کی 'بکٹ کہانی' ہے۔

تنویر احمد علوی افضل جھنجھانوی کی بکٹ کہانی سے اس کا تقابل کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں:

اس کے یہ معنی نہیں کہ پہلی روایت کے مقابلے میں دوسری روایت محض نقلِ روایت ہے۔ موضوع اور مواد کے اشتراک نے دونوں میں ہم آہنگی اور ہم رنگی ضرور پیدا کر دی ہے، لیکن پہلی روایت کے مقابلے میں دوسری روایت کچھ زیادہ نکھر اور سنور کر سامنے آئی ہے۔ جس سے مفتی صاحب کی تخلیقی اور ادبی صلاحیتوں کا پتا چلتا ہے اور اسے اردو کے اس انداز کے شعری سرمایے میں ایک گراں قدر اضافہ کہا جا سکتا ہے۔11

اس لیے ضرورت ہے کہ مفتی صاحب کے تمام ادبی سرمایے کی باز قرأت کی جائے اور ان میں ادبی جواہر تلاش کیے جائیں۔

حوالہ جات:

1. طبقات شعرائے ہند،ص: 393، بحوالہ مختصر تذکرہ حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی،نورالحسن راشد کاندھلوی، مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، کاندھلہ، 2015ء،ص:50
2. کاروانِ ایمان وعزیمت،سید ابوالحسن علی ندوی،سید احمد شہید اکیڈمی، لاہور، 1980ء: 1/83
3. مختصر تذکرہ حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی،نورالحسن راشد کاندھلوی، مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، کاندھلہ، 2015ء،ص:16
4. مختصر تذکرہ حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی،نورالحسن راشد کاندھلوی، مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، کاندھلہ، 2015، ص: 34-35، ملخصاً
5. فنِ ترجمہ نگاری، مرتبہ خلیق انجم، 1996، انجمن ترقی اردو، دہلی،ص:12
6. کاروانِ ایمان وعزیمت،سید ابوالحسن علی ندوی،سید احمد شہید اکیڈمی، لاہور، 1980: 1/84
7. مختصر تذکرہ حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی،نورالحسن راشد کاندھلوی، مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، کاندھلہ، 2015، ص: 52-53 ملخصاً
8. دیکھیے اردو میں بارہ ماسے کی روایت،تنویر احمد علوی،اردو اکادمی، دہلی، 1988،ص:94
9. بکٹ کہانی، مفتی الٰہی بخش کاندھلوی، مطبع نامی، منشی نول کشور، 15
10. بکٹ کہانی، مفتی الٰہی بخش کاندھلوی، مطبع نامی، منشی نول کشور،ص:3
11. اردو میں بارہ ماسے کی روایت،تنویر احمد علوی،اردو اکادمی، دہلی، 1988،ص:101

■

Nadeem Ahmed Ansari
403, Mangaldarshan,Turner rd,
Bandra (w), Mumbai - 400050. (MS)
Mobile : 9022278319
Emai:nadeem@afif.in

محمد نہال افروز

1980 کے بعد کی اردو اور ہندی کہانیوں کا تقابلی مطالعہ

ہندوستان میں اردو افسانہ اور ہندی کہانی دونوں ہی کی ابتدا مغرب کی ایک صنف Short Story کے زیر اثر ہوئی۔ اردو اور ہندی کہانیوں کے ابتدائی نقوش کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو دونوں ہی زبانوں میں اس صنف کے موجد ہونے کا حق پریم چند کو حاصل ہے۔ پریم چند سے پہلے اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں جو بھی کہانیاں تھیں وہ دوسری زبانوں سے ترجمہ شدہ تھیں یا پھر جو طبع زاد کہانیاں لکھی بھی گئی تھیں وہ فنی نقطۂ نظر سے کافی کمزور تھیں۔ پریم چند نے پہلی بار اپنے افسانوں میں دیہی زندگی کو موضوع بنایا، جس میں راجا مہاراجہ کے بجائے غریب، مزدور، مظلوم، کسان اور بے بس انسانوں کو جگہ دی۔ یہ اردو اور ہندی دونوں زبان کے لیے ایک نیا موضوع تھا۔

پریم چند کے بعد دو بڑے کہانی کار، اردو میں کرشن چندر اور ہندی میں جے شنکر پرساد کے نام سامنے آتے ہیں۔ جنہوں نے اپنے افسانوی دور کا آغاز رومانوی افسانے سے کیا۔ کرشن چندر نے اردو میں 'زندگی کے موڑ پر' اور 'بالکونی' جیسی بہترین رومانی افسانے لکھے تو جے شنکر پرساد نے بھی ہندی میں 'آکاش دیپ' اور 'بنجارا اور چوڑی والی' جیسی کامیاب رومانی کہانیاں لکھیں۔

1936 کے آس پاس خالص حقیقت نگاری کا دور شروع ہوتا ہے۔ اسی زمانے میں پریم چند نے مشہور افسانہ 'کفن' لکھا۔ اس سے پہلے بھونیشور نے ایک کہانی 'بھیڑیے' لکھی، جس سے ہندی کی نئی کہانی کے امکانات کافی بڑھ گئے۔ اسی طرح عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کو موضوع بنا کر اردو میں راجندر سنگھ بیدی اور ہندی میں وشمبھر ناتھ شرما کوشک نے بہترین کہانیاں لکھی۔ دونوں کہانی کار ایک ہی دور سے تعلق رکھتے ہیں اور دونوں نے اس وقت کے سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کو بہت قریب سے دیکھا اور انھیں اپنی کہانیوں میں فنکارانہ طریقے سے پیش کیا۔ بیدی نے بھولا، 'گرم کوٹ، لاجونتی اور اپنے دکھ مجھے دے دو جیسے بہترین افسانے لکھے تو وشمبھر ناتھ شرما کوشک نے بھی ماتا کا ہردے، پرتی شودھ، کھویا بیٹا اور پھانسی جیسی مشہور کہانیاں قلمبند کیں۔ اس کے بعد سعادت حسن منٹو اور بے چین شرما اُگر نے طوائف کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔ اس ضمن میں منٹو کی کالی شلوار، ٹھنڈا گوشت، ہتک، بو اور بے چین شرما اُگر کی ودھوا، بلاتکار، چاکلیٹ، چنگاریاں وغیرہ کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایسی کہانیاں ہیں، جو طوائف کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بیان کرتی ہیں۔

آزادی کے بعد اردو اور ہندی کہانیوں میں حقیقت نگاری کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اس دور میں تخلیق کاروں کی ایک لمبی فہرست ابھر کر سامنے آئی۔ ان تخلیق کاروں میں بھی موضوعات کی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی اور یش پال کے ہم عصر کہانی کاروں نے اپنی کہانیوں میں دیہی مسائل کے ساتھ ساتھ سماجی بدعنوانیوں کو بھی موضوع بنایا۔ احمد ندیم قاسمی کا افسانہ 'جوتا' اعظم کریوی کا 'اقرار جرم' اوپیندر ناتھ اشک کا 'ناسور' یش پال کی کہانی 'دھرم یودھ' وشنو پربھاکر کی 'دھرتی اب بھی گھوم رہی ہے' جیسے اور بہت سے افسانوں اور کہانیوں کے نام گنائے جا سکتے ہیں۔

اسی دور میں ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ تقسیم کا اثر اردو اور ہندی کہانی کاروں پر یکساں پڑتا ہے۔ اس دور کے کہانی کاروں میں تقسیم کا درد اور ہجرت کا کرب نمایاں طور پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ اردو میں کرشن چندر کا افسانہ پیشاور ایکسپریس، راجندر سنگھ بیدی کا لاجونتی، منٹو کا ٹوبہ ٹیک سنگھ، عصمت چغتائی کا جڑیں، غلام عباس کا آنندی، خواجہ احمد عباس کا سردار جی، حیات اللہ انصاری کا شکر گزار آنکھیں، خدیجہ مستور کا اپنے آنگن سے دور اور ہندی میں اگیہ کی کہانی بدلا، بے چین شرما اگر کی ایشور دور ہے، موہن راکیش کی ملبے کا مالک، اپیندر ناتھ اشک کی چارہ کاٹنے کی مشین بھیشم ساہنی کی امرت سر آ گیا ہے، وشنو پربھاکر کی میرا وطن کرشنا سوبتی کی سکہ بدل گیا، راجی سیٹھ کی باہری لوگ جیسی کہانیاں لکھی گئیں۔ اس دور میں اردو اور ہندی کہانیاں ساتھ ساتھ چلتی نظر آتی ہیں۔

1955-60 کے قریب جدیدیت کا دور شروع ہوتا

ہے۔اس دور میں اردو اور ہندی کہانیوں میں ایک نیا موڑ آتا ہے، جس میں کہانی کے موضوع پر زیادہ زور نہ دے کرفن پر پوری توانائی صرف کی جانے لگی۔ جدیدیت میں سماج کی جگہ فرد کو اہمیت دی گئی۔اس دور کے افسانوں میں کردار بہت کم نظر آتے ہیں۔ افسانہ نگار اور کہانی کار واقعات کی جگہ محسوسات سے کام لینے لگے۔ جدیدیت کے دور کے افسانہ نگاروں نے بیانیہ کے ساتھ ساتھ ڈکشن پر زیادہ زور دیا اور افسانے کو علامتی اور تجریدی انداز میں پیش کیا۔اس دور کی ہندی کہانی اردو افسانے سے الگ کھڑی نظر آتی ہے، کیونکہ ہندی کا ڈکشن بہت پاورفل نہیں ہے۔اس وجہ سے ہندی میں جدیدیت کے تحت لکھی گئی کہانیاں قاری پر اپنا اثر نہیں چھوڑ پائیں۔ جدیدیت کا اثر ہندی کے واحد کہانی کار 'نرمل ورما' کی کہانیوں میں نظر آتا ہے۔ان کی کہانی 'پرندے' اس کی بہترین مثال ہے، جب کہ اردو میں جدیدیت کے تحت لکھنے والے کامیاب افسانہ نگاروں میں انتظار حسین، انور سجاد، سریندر پرکاش، بلراج مین را، دیوندر اسر، غیاث احمد گدی، نیر مسعود، اقبال مجید جیسے کئی تخلیق کاروں کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ آگے چل کر ہندی میں نرمل ورما کی طرز پر کملیشور، موہن راکیش، راجندر یادو وغیرہ نے لکھنے کی کوشش کی، لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ یہیں سے اردو اور ہندی کہانیوں میں فنی سطح پر واضح فرق نظر آنے لگتا ہے اور اردو ہندی کہانیاں ایک دوسرے سے دور ہو جاتی ہیں۔

اس طرح سے ہم دیکھتے ہیں کہ اردو اور ہندی کہانیوں میں ابتدا سے 1980 تک موضوع کی سطح پر بڑی حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے، لیکن اس دور کی اردو اور ہندی کہانیوں میں فنی سطح پر نمایاں فرق دیکھنے کو ملتا ہے۔ اردو اور ہندی کہانی کا بنیادی فرق یہی ہے کہ اردو افسانے کا زور فن پر ہوتا ہے اور ہندی کہانی کا موضوع پر۔

مذکورہ بالا وجوہات کی بنا پر یہ ضروری تھا کہ اردو اور ہندی کہانیوں کا تقابلی تجزیہ کیا جائے، لیکن اس سے پہلے یہ جاننا بھی اہم ہے کہ خود تقابلی تجزیہ یا تقابلی مطالعہ کیا ہے؟

تقابلی مطالعہ دو ادب کے درمیان پائے جانے والے اشتراکات و افتراقات کا تجزیہ کرنے کا عمل ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے ذریعے مختلف ادب کے موضوعات اور فن کی مماثلت یا تضاد کی نشاندہی بھی کی جاتی ہے۔ آج کل عالمی سطح پر تقابلی مطالعہ کو کافی اہمیت دی جا رہی ہے۔ اس کی ابتدا 1848 میں انگریزی کے مشہور و معروف شاعر 'میتھو آرنالڈ' نے اپنے ایک خط میں کی، جس میں انھوں نے 'Comparative Literature' لفظ کا استعمال کیا، جس کا اردو معنی تقابلی ادب ہے۔ آگے چل کر تقابلی ادب کے کئی اسکول قائم کیے گئے، جس میں فرانس و جرمن اور امریکی اسکولوں کو کافی اہمیت حاصل رہی، جنھوں نے اپنے اپنے طور پر تقابلی ادب کی تعریف بیان کی ہے۔

تقابلی مطالعہ دو یا دو سے زائد زبانوں کی ادبیات، تہذیب وثقافت، سماج و سیاست، معیشت، مذہب وغیرہ کے ساتھ ساتھ ادبیات کی جمالیات اور خصوصیات کا بیرونی و باطنی سطح پر مطالعہ کرنا ہی تقابلی مطالعہ ہے، بشرطیکہ کہ ان دونوں ادب میں کوئی ایک یا ایک سے زائد باتیں قدرے مشترک ہونی چاہیے، مثلاً دونوں ادب کی زبان ایک ہو یا صنف ایک ہو، موضوع ایک ہو، تکنیک ایک ہو، دونوں کسی تحریک و رجحان کے زیر اثر تخلیق کیے گئے ہوں، دونوں کا ماخذ ایک ہو؛ وغیرہ وغیرہ۔ ایسی تخلیقات کا باہم مطالعہ کرنا ہی تقابلی مطالعہ ہوگا۔ انہیں باتوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اردو اور ہندی کہانیوں کا تقابلی تجزیہ کیا گیا ہے۔

فرقہ وارانہ اور اقلیتی مسائل پر لکھی گئی اردو اور ہندی کہانیوں کا تقابلی مطالعہ کرنے سے بہت ساری مماثلتیں سامنے آتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف اردو افسانوں کے موضوعات کا محور قتل و غارت گری، انسانی اقدار کی پامالی، اغوا، آبروریزی، قربانی کا جذبہ، دہشت گردی، حکومت پر عوام کا عدم تحفظ، لاقانونیت، علاقائیت، مذہبی و مسلکی تعصب اور نفسیاتی کشمکش جیسے مسائل ہیں، وہیں دوسری طرف ہندی میں بھی یہی سارے مسائل صرف لفظوں کی تبدیلی کے ساتھ نظر آتے ہیں۔

فرقہ وارانہ فسادات اور اقلیتی مسائل پر 1947 ہی سے اردو اور ہندی میں کہانیاں ملتی ہیں، لیکن 1980 کے بعد فرقہ وارانہ فسادات اور اقلیتی مسائل پر لکھی گئی اردو اور ہندی کہانیوں میں ایک طرف اگر مماثلت نظر آتی ہے تو وہیں دوسری طرف ان کہانیوں میں نمایاں فرق بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

ایک طرف اردو میں 1984 میں ہوئے سکھ فساد کو موضوع بنا کر غضنفر نے افسانہ 'پہچان' لکھا تو دوسری طرف ہندی میں اس کو موضوع بنا کر مرڈلا گرگ نے کہانی 'اگلی صبح' لکھی۔ ان دونوں کہانیوں میں فساد کے بعد سکھ قوم اپنی تہذیبی شناخت بچانے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ غضنفر کا کردار 'بلونت' اپنی جان بچانے کے لیے اپنی پہچان بدل دیتا ہے اور اپنی داڑھی اور سر کے بال منڈوا دیتا ہے۔ اسی طرح مرڈلا گرگ کی کہانی 'اگلی صبح' کے سکھ کردار اپنی جان بچانے کے لیے اپنی پگڑی اتار کر سر اور داڑھی کے بال منڈوا دیتے ہیں۔

اسی طرح سلام بن رزاق کے افسانے 'چہرہ'، حسین الحق کے افسانے 'نیو کی اینٹ' اور بیگ احساس کے افسانے 'آسمان بھی تماشائی' میں سانحہ بابری مسجد کے بعد ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ساجد رشید کے افسانے 'ایک چھوٹا سا جہنم' میں ممبئی کا فرقہ وارانہ فساد، طارق چھتاری کے افسانے 'لکیر' میں ہندو مسلم فرقہ وارانہ فساد اور مشرف عالم ذوقی کے افسانے 'احمد آباد 203 میل' میں گجرات کے فرقہ وارانہ فساد کو موضوع بنایا گیا ہے۔اسی طرح ہندی کہانیوں میں اصغر وجاہت کی کہانی 'میں ہندو ہوں' بھی فرقہ وارانہ ذہنیت کو بنیاد بنا کر لکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ راجی سیٹھ کی کہانی 'رکو انتظار حسین، عبدل بسم اللہ کی کہانی 'دنگائی'، سوریہ بالا کی کہانی 'شہر کی سب سے دردناک کہانی'، انور سہیل کی کہانی 'گیارہ ستمبر کے بعد' اور ناصرہ شرما کی کہانی 'سرحد کے اس پار' میں فرقہ وارانہ فسادات بالخصوص ہندو مسلم فسادات کو موضوع بنایا گیا ہے۔

ان کہانیوں کا تقابلی مطالعہ کرنے سے ان کے درمیان تفریق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ان کہانیوں میں جو ایک فرق دیکھنے کو ملتا ہے وہ افسانہ نگاروں اور کہانی کاروں کا ہے۔ ہندی میں فرقہ وارانہ مسائل پر لکھنے والے کہانی کار زیادہ تر مسلم ہیں اور ان کے کردار بھی مسلم ہیں۔ ان کہانیوں میں جو غیر مسلم کردار آئے بھی ہیں تو وہ فرقہ وارانہ فسادات سے متاثر نظر نہیں آتے۔اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ 1980 کے بعد جو بھی فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ہیں، ان میں سب سے زیادہ متاثر مسلم قوم ہی ہوئی ہے۔

دلت مسائل پر لکھی گئی اردو اور ہندی کہانیوں کا تقابل کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں زبان کے کہانی کاروں نے بہت فنکاری کے ساتھ اپنی کہانیوں میں دلت مسائل کو پیش کیا ہے۔ان کہانیوں میں دلتوں کے اندر انسانیت کا جذبہ، ان کے روزگار کے مسائل، ان کی اپنی سماجی شناخت، محنت کے بدلے مزدوری کا مطالبہ، انتقام کا جذبہ، تعلیمی مسائل اور سماجی برابری کو بطور خاص موضوع بنایا گیا ہے۔

نورالحسنین کے افسانے 'بدذات' میں یہ دکھایا گیا ہے کہ دلت افراد کا کام مزدوری کرنا اور غلاظت صاف کرنا ہوتا ہے۔ انھیں انسانیت کی کوئی سمجھ نہیں ہوتی ہے۔ جب کہ اس افسانے کے کردار 'چمپا' نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ دلتوں کے سینے میں بھی دل ہوتا ہے اور ان کے اندر بھی انسانیت ہوتی ہے۔ جب بھی انہیں موقع ملتا ہے۔ وہ اپنا سب کچھ دوسروں پر نچھاور کر دیتے ہیں۔ اسی طرح

ہندی کہانی کار اوم پرکاش والمیکی نے اپنی کہانی 'سلام' میں بھی دلت کردار کو انسانیت کا حامی بنا کر پیش کیا ہے۔

اس کے علاوہ طارق چھتاری کے افسانے 'دس بیگھے کھیت' میں دلتوں کے بنیادی مسائل روٹی، کپڑا اور مکان کو موضوع بنایا گیا ہے۔ سلام بن رزاق کے افسانے 'یک لویہ کا انگوٹھا' میں ہزراوں سال پہلے کی کہانی یک لویہ اور درونا چاریہ کو عہد حاضر کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ ہزاروں سال پہلے ہی کی طرح درونا چاریہ نے آج بھی اپنے شاگرد سے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا مانگا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سماج کے اعلیٰ طبقے کی سوچ ابھی وہی ہے، جب کہ یک لویہ انگوٹھا گرو دکشنا میں دے کر شاگرد کا دھرم بھی نبھاتا ہے اور ڈاکٹری کا پیشہ اپنا کر ایک بڑا سرجن بھی بن کر دکھاتا ہے۔ یعنی کہ آج کا دلت سماج عہد حاضر میں برہمن وادی سماج سے زیادہ ذہین بھی ہے اور تعلیم یافتہ بھی۔ چونکہ یک لویہ درونا چاریہ سے بڑا سرجن بن چکا ہے۔

ذکیہ مشہدی کے افسانے 'گڑ روئی' میں دلت اپنی مزدوری نہ ملنے پر احتجاج کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اقبال مجید کے افسانے 'آگ کے پاس بیٹھی عورت' میں دلت عورت سروڑوں سے انتقام لیتی ہوئی دیکھی جا سکتی ہے۔ اسی طرح اسرار گاندھی کے افسانے 'وہ جو راستے میں کھوئی گئی' میں ایک دلت عورت 'کلبسیا' پر ٹھاکروں کے ظلم کو موضوع بنایا گیا ہے۔ قمر جمالی کی کہانی 'جنگ' میں ایک دلت کردار 'چندن' کی جدوجہد کو موضوع بنایا گیا ہے۔ چندن ایک ہریجن ہونے کے باوجود اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے لکچرر کی نوکری کرتا ہے اور اعلیٰ ذات یعنی کہ پنڈت شاستری کی لڑکی کویتا سے شادی بھی کرتا ہے۔

اسی طرح ہندی میں جے پرکاش کردم کی کہانی 'تلاش' کا کردار 'رام ویر سنگھ' سروڑوں کے ظلم کو برداشت نہیں کرتا بلکہ ان کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ عبدل بسم اللہ کی کہانی 'کھال کھینچنے والے' میں ایک مجبور دلت کی بے بسی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اصغر وجاہت نے اپنی کہانی 'اُوسر میں ببول' میں 'سرھکو' اور 'مرھکو' کے ذریعے دلتوں پر ہو رہے ظلم اور ان کا احتجاج دونوں کو دکھایا گیا ہے۔ سوشیلا ٹاک بھورے کی کہانی 'سنگھرش' میں ایک دلت بچے کو کردار بنایا گیا ہے، جو خود کو دلت سماج سے اوپر اٹھانے کے لیے لگاتار سنگھرش کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح انور سہیل کی کہانی 'سن آف بدھن' میں بدھن پڑھ لکھ کر ایل۔ کمار بن جاتا ہے، لیکن اس کے نام سے بدھن نکل نہیں پاتا ہے جب کہ وہ اپنے نام میں سے بدھن کو ہٹانے کی بہت کوشش کرتا ہے۔ موہن داس نیمیش رائے کی کہانی 'اپنا گاؤں' میں بنیادی مسائل اسکول، اسپتال، سڑک وغیرہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس گاؤں کے دلت شہر جا کر تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو وہاں کے ٹھاکران پر ظلم کرتے ہیں اور انہیں تعلیم حاصل نہیں کرنے دیتے۔ ٹھاکروں کے ظلم سے دلت طبقے کے لوگ اس گاؤں سے نکل کر اپنا ایک الگ گاؤں بسا لیتے ہیں۔

دلت مسائل پر لکھی گئی اردو اور ہندی کہانیوں میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ 1980 کے بعد کا دلت کردار پہلے کی طرح سروڑوں کے ظلم کو برداشت نہیں کرتا ہے، بلکہ اپنے حق کے لیے لڑتا ہے اور اپنا حق نہ ملنے پر احتجاج کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اتنا ہی نہیں آج کا دلت تعلیم حاصل کر کے سماج کے Mainstreem میں شامل ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے۔

نسائی مسائل پر لکھی گئی اردو اور ہندی کہانیوں میں بہت زیادہ فرق دیکھنے کو نہیں ملتا۔ اور فرق ہوگا بھی نہیں، کیونکہ عورتوں کے تمام مسائل ایک جیسے ہی ہیں۔ زبان کے بدل جانے سے مسائل نہیں بدلتے۔ اردو اور ہندی کا تعلق جس معاشرے سے ہے، اس کے مسائل دونوں زبانوں کے تخلیق کاروں کے لیے یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ عورتوں کے سماجی اور معاشرتی مسائل پر اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں بہت ساری کہانیاں لکھی گئی ہیں۔

اردو افسانہ نگار ذکیہ مشہدی کے افسانے 'ایک تھکی ہوئی عورت' اور ہندی کہانی کار مہرالنسا پرویز کی کہانی 'قیامت آ گئی ہے' میں عورتوں کے ایک ایسے مسئلے کو موضوع بنایا گیا ہے، جس میں شادی سے پہلے مرد عورت کا پوری طرح سے خیال رکھتا ہوا نظر آ رہا ہے، لیکن شادی کے بعد مرد کے پیار میں کمی آ جاتی ہے۔ اسی طرح نگار عظیم کے افسانے 'روشنی' اور مرڈلا گرگ کی کہانی 'وہ میں ہی تھی' میں یہ دکھایا گیا ہے کہ لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکوں کو زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ اسرار گاندھی کے افسانے 'ایک جھوٹی کہانی کا سچ' اور راجی سیٹھ کی کہانی 'اپنے دائرے' میں جنسی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ شوہر بیوی کا رشتہ جنسی ضرورتوں کے لیے ہی بنتا ہے۔ ترنم ریاض کی کہانی 'ناخدا' اور ناصرہ شرما کی کہانی 'نئی حکومت' میں اس بات پر زیادہ زور دیا گیا ہے کہ ایک لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ شادی سے پہلے دونوں میں بہت پیار ہوتا ہے، لیکن شادی کے بعد مرد کے پیار میں کمی آنے لگتی ہے۔ اسی طرح مشرف عالم ذوقی کے افسانے 'شاہی گلدان' اور عبدل بسم اللہ کی کہانی 'طلاق کے بعد' میں عورتوں کے ایک بڑے مسئلے یعنی طلاق کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ابن کنول کے افسانے 'خواب' میں جنسی زیادتی اور سماج میں گھناؤنے جرائم جیسے مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ سدھا اروڑا کی کہانی 'رہو گی تم وہی' میں گھریلو عورت کے کئی مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔ گھر میں رہنے والی عورتیں اپنے شوہر کا ہر صورت میں خیال رکھتی ہیں، لیکن ان کا شوہر ان سے کبھی خوش نہیں رہتا۔ اسے ان کے ہر کام میں خامی نظر آتی ہے۔ اسی طرح غزال ضیغم کے افسانے 'نیک پروین' اور سبھاش نیرو کی کہانی 'عورت ہونے کا گناہ' میں عورتوں کے کئی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کہانیوں میں ایک لڑکی کی پیدائش سے لے کر اس کی آخری عمر تک کے تمام مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ ایک لڑکی، ایک عورت کس طرح اپنی پوری زندگی نیک بننے کی خواہش میں گزار دیتی ہے۔ اس کی بہترین مثال یہ دو کہانیاں ہیں۔

اس طرح سے دیکھا جائے تو یہ کہانیاں عورت کی زندگی میں پیش آنے والے مختلف مسائل کو بیان کرتی ہیں۔ کہیں پر معصوم لڑکیاں ظلم و زیادتی کا شکار ہوتی ہیں۔ کہیں پر عورتیں، عورتوں پر ظلم کرتی ہوئی نظر آ رہی ہیں۔ کہیں بیٹا ماں کی زندگی اجاڑتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ کہیں عورتیں مرد کے عشق و محبت پر بھروسہ کر کے ظلم کا شکار ہو رہی ہیں۔ کہیں پر شوہر نے اپنی بیوی کو غلام بنا کر رکھا ہے۔ انھیں سارے مسائل کو موضوع بنا کر دور حاضر کے اردو اور ہندی کے کہانی کاروں نے بے شمار افسانے اور کہانیاں قلم بند کی ہیں۔

دیہی مسائل پر لکھی گئی اردو اور ہندی کی منتخب کہانیوں کا تجزیہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آزادی کے تقریباً ستر سال بعد بھی ہندوستان کے دیہاتوں میں بجلی، پانی، اسکول اسپتال وغیرہ کا معقول انتظام نہیں ہو پایا ہے۔ یعنی کہ ہندوستان کا دیہات آج بھی ان بنیادی چیزوں سے محروم ہے۔ اردو افسانہ نگار شفق کے افسانے 'دیوار گریہ' اور ہندی کہانی کار رویندر کالیا کی کہانی 'چکیا نیم' میں ایسی بستیوں کے بنیادی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے، جہاں آج بھی پانی، بجلی اور اسکول کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ ایک طرف صنعتی ترقیاں آسمان چھو رہی ہیں اور دوسری طرف ان بستیوں میں ان کا ہلکا سا بھی اثر نہیں دکھائی دے رہا ہے۔ اسی طرح غزال ضیغم کے افسانے 'اجیل پاک اندھیرا پاک' میں تعلیمی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس افسانے کا کردار چندنیا تعلیم سے بے بہرہ ہے اور اپنے شوہر کے آنے کا انتظار اجالے اور اندھیرے کے سہارے کرتی ہے۔ عبدل بسم اللہ کی کہانی 'گرام سدھار'

میں ایسے گاؤں کو موضوع بنایا گیا ہے، جو ہندوستان کے نقشے ہی میں نہیں ہے۔ احمد رشید کے افسانے 'کرما' میں پنچایتی راج کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ابن کنول کے افسانے 'کنیا دان' میں توہم پرستی اور کسانوں کی بے بسی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ قمر جمالی کے افسانے 'مائی کا قرض' میں ایک گاؤں کے تنازعے کی داستان کو پیش کیا گیا ہے۔ اوم پرکاش والمیکی کی کہانی 'گئو ہتیا' میں زمینداری کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ آج بھی گاؤں میں سرپنچ اور مکھیا غریبوں، مظلوموں اور اپنے نوکروں پر ظلم کرتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ گنگا پرساد وِمل کی کہانی 'بچہ' میں گاؤں میں رہنے والے امیر اور غریب کے بھید بھاؤ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ سندیپ میل کی کہانی 'قسطوں کی موت' دیہی مسائل پر لکھی گئی بہترین کہانی ہے۔ اس گاؤں میں آج بھی تعلیم، بجلی پانی اور سڑک کا انتظام نہیں ہے اور لوگ توہم پرستی میں یقین رکھتے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں اردو افسانہ نگاروں نے گاؤں کے بنیادی مسائل کو پیش کیا ہے وہیں ہندی کہانی کاروں نے بھی انہیں مسائل کو زیادہ اہمیت دی ہے۔

شہری مسائل پر کہانی کے ابتدائی دور ہی سے اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں کہانیاں لکھی جا رہی ہیں۔ شہری مسائل پر لکھی گئی اردو اور ہندی کہانیوں کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں زبان کی کہانیوں میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ اردو افسانہ نگار ساجد رشید کے افسانے 'اوپر سے گرتا اندھیرا' میں بے حسی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ انجم عثمانی کے افسانے 'شہر گریہ کا مکیں' میں شہری بدعنوانیوں کو پیش کیا گیا ہے۔ ترنم ریاض کے افسانے 'شہر' میں شہر کی اونچی اونچی عمارتوں میں رہنے کے مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ شفق کے افسانے 'شہر ستم' میں شہر کے نئے مسائل اور اغوا جیسے گھناؤنے جرائم کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ابن کنول کے افسانے 'سویٹ ہوم' میں شہر میں کرائے پر رہنے والوں کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اسی طرح ہندی کہانی کاروں میں گوبند مشر کی کہانی 'سمندوں کی کھولی' میں ممبئی جیسے شہر میں رہائش کے مسئلے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ رویندر کالیا کی کہانی 'چال' میں رہائشی مسئلے کے ساتھ ساتھ روزگار کے مسئلے کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ سدھا اروڑا کی کہانی 'تیرہویں مالے سے زندگی' میں بھی اونچی بلڈنگ میں رہائش سے پیدا ہونے والے کئی مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔ الکا پرمود کی کہانی 'خوف' میں یہ دکھایا گیا ہے کہ شہر میں بے روزگاری کے سبب نوجوان کس طرح غلط راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شہری مسائل پر لکھی گئی اردو اور ہندی کہانیوں میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ کیونکہ اردو اور ہندی کے کہانی کار اپنا موضوع اسی معاشرے سے منتخب کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ آج ہندی اور اردو کا تہذیبی مزاج مختلف ہے، لیکن شہر میں رہنے والے عوام کے مسائل یکساں ہیں۔ اس لیے شہری مسائل پر لکھی گئی ان کہانیوں میں بہت واضح فرق نہیں ہے۔

فنی نقطۂ نظر سے اردو اور ہندی کہانیوں کا تقابلی مطالعہ کرنے سے واضح فرق محسوس ہوتا ہے۔ افسانے کا پہلا جزو پلاٹ ہوتا ہے۔ افسانے میں پلاٹ سے مراد واقعات کی منطقی وفنی ترتیب سے ہے۔ افسانے میں جو کچھ واقعات کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے، اس میں ترتیب کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ کہانی اسی ترتیب سے آگے بڑھتی ہے۔ کہانی میں جو واقعات پیش کیے جائیں ان کی تنظیم اور ترتیب اس طرح سے ہو کہ اس میں دلچسپی کا عنصر پیدا ہو جائے۔ واقعات میں پہلے سے ترتیب قائم کر لی جائے تو کہانی کار اِدھر اُدھر بھٹکنے سے بچا رہتا ہے اور مرکزی خیال پر اس کی نظر ٹکی ہوئی ہوتی ہے۔ اس طرح غیر ضروری تفصیلات کہانی میں رکاوٹ نہیں بن پاتی ہیں۔

اردو اور ہندی کہانیوں میں پلاٹ کی اہمیت مسلم ہے۔ کہانیوں میں پلاٹ مختلف قسم کے ہوتے ہیں، جن میں سادہ پلاٹ، مربوط پلاٹ، پیچیدہ پلاٹ، گتھا ہوا یا منظم پلاٹ اور مجہول پلاٹ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کہانیوں میں کئی اور قسم کے پلاٹ ہوتے ہیں، جن کا تعین کہانیوں کے موضوع اور پیش کش سے کیا جا سکتا ہے۔ پلاٹ کے لحاظ سے اردو افسانے ہندی کہانیوں سے قدرے بہتر ہیں۔

کہانی میں کردار پلاٹ سے کم اہمیت نہیں رکھتے۔ کہانی میں جو واقعات پیش آتے ہیں وہ کرداروں کے سہارے ہی آگے بڑھتے ہیں۔ اس لیے کہانی میں کردار نگاری کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ کرداروں پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی جاتی ہے، لیکن کہانی کا کینوس محدود ہوتا ہے، اسی وجہ سے کہانی کار کردار کا مکمل رخ پیش نہیں کر سکتا۔ وہ کسی ایک زاویے سے روشنی ڈال کر اس کا کوئی ایک اہم پہلو اجاگر کرتا ہے۔

کرداروں کا جامد ہونا فطرتِ انسانی کے خلاف ہے۔ اچھا کردار وہی ہے جو حالات کے ساتھ تبدیل ہوتا رہے اور اس کا ارتقا جاری رہے۔ یہ بھی نہ ہو کہ کردار صرف خامیوں وخرابیوں کا مجموعہ ہو۔ اسی کردار کو کامیاب کہا جاتا ہے جو دنیاوی کردار کی طرح حقیقی اور اصلی ہو۔ اردو اور ہندی کہانیوں میں کردار نگاری پر خاص توجہ دی گئی ہے۔

تکنیک نثری ادب کی کسی صنف کو مواد کے ذریعے ہیئت کی تشکیل میں لانے کا ہنر ہے۔ ادبی تکنیکیں صنف کی مرضی کے مطابق تشکیل نہیں پاتی بلکہ کسی موضوع کے مواد کے مطابق تشکیل پاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کہانی میں تکنیکی تنوع پایا جاتا ہے۔ بدلتے ہوئے رجحانات اور ادبی تحریکات کے حوالے سے کہانی کی تکنیک میں تبدیلی آتی ہے۔ ہر کہانی کی تکنیک مختلف ہوتی ہے جو موضوع اور مواد کے اعتبار سے اپنا رنگ پکڑتی ہے۔ تکنیک دراصل ایک ذریعہ ہے، ایک وسیلہ ہے، جس کے ذریعے کہانی کار اپنا مقصد، اپنا نقطۂ نظر قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اردو افسانوں میں تکنیکی تنوع دیکھنے کو ملتا ہے، لیکن ہندی میں تکنیکی تجربات بہت کم ہوئے ہیں۔ ہندی میں فلیش فارورڈ اور بیانیہ تکنیک پر زیادہ کہانیاں لکھی گئی ہیں۔

کوئی بھی واقعہ بہرحال ایک خاص جگہ اور خاص وقت ہی میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس لیے تخلیق کار کہانی لکھنے کے لیے کینوس کے انتخاب میں زماں و مکاں کا خاص خیال رکھتا ہے۔ میری فہم کے مطابق آفاقیت کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ موضوع کی اہمیت عالمی سطح پر یکساں ہو۔ دوسری یہ کہ وہ موضوع جو اپنے عہد کے بعد بھی باقی رہے، لیکن اس کا تعین ایک وقت گزرنے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ایسے بہت سے موضوعات پر کہانیاں لکھی گئیں ہیں جن میں عالمی مسائل کا ذکر ہے اور ان موضوعات پر بھی قلم اٹھائے گئے ہیں، جن کی اہمیت ماضی میں بھی تھی اور آج بھی ہے۔

ہر فن کار کا کوئی نہ کوئی نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کی پیش کش کے لیے فن کار اپنی تخلیق کو جنم دیتا ہے۔ مثلاً ترقی پسندوں کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ادب کو معاشرتی تبدیلی کے لیے استعمال کیا جائے۔ اس کے برعکس کسی کا نقطۂ نظر تاریخی بھی ہوتا ہے، جو تاریخ کے حوالے سے اپنی تخلیق کو جنم دیتا ہے تاکہ سماج کو عظمت رفتہ کی یاد دلا کر اس میں ہمت و حوصلہ پیدا کیا جا سکے۔ ہر انسان اپنا نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ فنکار حساس ہونے کے ساتھ ساتھ مشاہدے کی وسعت سے مالا مال ہوتا ہے۔ فن کار کا کمال اس میں ہے کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کو زیادہ نمایاں نہ ہونے دے، بلکہ فن کے دبیز پردے میں اپنے نقطۂ نظر کو ملفوف کر کے پیش کرے۔ بڑا کہانی کار وہی ہوتا ہے جو عنوان اور نقطۂ نظر کے مابین باریک سے باریک رشتے کو بھی اجاگر کر دے۔

موجودہ دور کی بیشتر کہانیوں میں عنوان اور نقطۂ نظر میں رشتہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کے واضح اشارے 1980 کے بعد کی کہانیوں کے عنوانات اور موضوع کی باہمی مطابقت سے ملتے ہیں، لیکن موجودہ دور کی زیادہ تر کہانیوں میں چاہے وہ اردو کی ہوں یا ہندی کی، دونوں زبانوں کی کہانیوں میں عنوان کا رشتہ کہانی کے کسی ایک واقعے سے رہتا ہے۔ کہانی کے تمام واقعات ایک دوسرے واقعے سے مربوط ضرور ہوتے ہیں، لیکن پوری کہانی میں عنوان کا رشتہ کسی ایک ہی واقعے سے ہوتا ہے۔ جب کہ ابتدائی دور کی اردو اور ہندی کہانیوں کے عنوان اور نقطۂ نظر میں گہرا رشتہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ مثال کے طور پر اردو میں پریم چند کی کہانی 'نجات'، کرشن چندر کی 'کالو بھنگی'، راجندر سنگھ بیدی کی 'اپنے دکھ مجھے دے دو' منٹو کی 'کھول دو' اور ہندی میں چندر دھر شرما گلیری کی 'اس نے کہا تھا'، جے شنکر پرشاد کی 'آکاش دیپ'، بچن شرما اُگر کی 'چنگاریاں'، یشپال کی 'پردہ' وغیرہ پیش کی جا سکتی ہیں۔

لفظ کسی بھی زبان کی میراث نہیں ہوتا۔ ہر لفظ میں اتنی وسعت ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی زبان میں استعمال ہو سکتا ہے۔ بشرط یہ کہ جو لفظ جس زبان میں استعمال کیا جا رہا ہے وہ اسی زبان کے قواعد اور اصول کے مطابق کیا جانا چاہیے۔ چونکہ ہر زبان کی اپنا ایک مخصوص قواعد ہوتی ہے۔ اس لیے لفظ کے استعمال کے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ہم جس زبان میں کسی دوسری زبان کے لفظ کو استعمال کر رہے ہیں اس زبان کے قاعدے کے مطابق استعمال کریں نہ کہ جس زبان کا لفظ ہے اس کے اصول و قواعد کے مطابق استعمال کریں۔

اردو میں تو یہ اصول پابندی کے ساتھ برتا گیا ہے، لیکن ہندی زبان میں ایسا نہیں ہے۔ ہندی کہانی کار ہمیشہ سے اردو زبان کے الفاظ کثرت سے استعمال کرتے آئے ہیں۔ چونکہ اردو اور ہندی دونوں زبانیں ہندوستان ہی میں پیدا ہوئی ہیں اور دونوں ہی لسانی و تہذیبی طور پر ایک دوسرے کے بہت قریب بھی ہیں، لیکن دونوں زبان تلفظ، جنس اور املا میں بہت فرق ہے۔ زبان کے لحاظ سے ہندی کہانی کاروں میں ایک اور کمی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہندی کہانی کار اردو الفاظ سے تو واقف نظر آتے ہیں، لیکن اردو لفظ کے محل استعمال سے واقف نظر نہیں آتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ہندی کے مشہور کہانی کار یشپال کی کہانی 'پردہ' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ان شاء اللہ، چودھری صاحب کے کنبے میں برکت ہوئی۔ چودھری فضل قربان ریلوے میں کام کرتے تھے۔ اللہ نے انہیں چار بیٹے اور تین بیٹیاں دیں۔''

(یشپال، پردہ)

محولہ بالا اقتباس میں استعمال شدہ لفظ 'ان شاء اللہ' کسی بھی طرح سے مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ ان شاء اللہ ہمیشہ مستقبل کے لیے استعمال ہوتا ہے اور یہاں پر بات ماضی کی ہو رہی ہے۔ یہ غلطی محل استعمال کے نہ جاننے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اسی طرح جے پرکاش کردم کی کہانی 'تلاش' کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''اوپر کی منزل پر دو کمرے، رسوئی، غسل خانہ اور شوچالیہ تھا۔'' (جے پرکاش کردم، تلاش)

اس جملے میں پانچ الفاظ ہیں۔ منزل، کمرہ، رسوئی، غسل خانہ اور شوچالیہ۔ اس میں 'منزل' عربی زبان کا لفظ ہے اور اردو میں اپنی اصل صورت میں استعمال ہوتا ہے۔ 'کمرہ' مقامی یعنی ہندوستانی زبان کا لفظ ہے، جو اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں اپنی اصل صورت میں استعمال ہوتا ہے۔ 'رسوئی' خالص سنسکرت زبان کا لفظ ہے اور ہندی میں بھی اسی صورت میں استعمال ہوتا ہے۔ 'غسل خانہ' فارسی زبان کا مرکب لفظ ہے اور اردو میں اسی صورت میں استعمال کیا جاتا ہے اور 'شوچالیہ' ہندی زبان کا لفظ ہے۔ صاف لگ رہا ہے کہ کہانی کار الفاظ کے محل استعمال سے زیادہ واقف نہیں ہے۔ جب کہ اردو میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ذکیہ مشہدی کے افسانے 'گڑ روٹی' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''اوپر پوری منزل اس طرح اٹھائی تھی کہ دو دو کمروں اور ملحقہ غسل خانوں کے ساتھ ایسے مکمل یونٹ تیار ہو جائیں کہ دو کنبے آرام سے رہ سکیں۔ بھابی باورچی خانے اور غسل خانے میں ٹائلز لگوانا چاہتی تھیں۔''

(ذکیہ مشہدی، گڑ روٹی)

اردو میں بھی زبان کے لحاظ سے کہیں کہیں کمی دیکھنے کو ملتی ہے۔ جب اردو افسانہ نگار ہندی تہذیب و ثقافت اور مذہب کا ذکر اپنی کہانیوں میں کرتا ہے تو اس سے غلطی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر طارق چھتاری کے افسانے 'لکیر' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''مندر میں جمع لوگ کیرتن ختم کر کے برت کھولنے کے لیے جل سے بھرے پیتل کے لوٹے میں لونگ، بتاشے اور پھول ڈالتے ہیں۔'' (طارق چھتاری، لکیر)

درج بالا اقتباس میں لفظ 'برت کھولنا' استعمال کیا گیا ہے، جب کہ صحیح لفظ 'برت توڑنا' ہے۔ برت کھولا نہیں توڑا جاتا ہے۔ روزہ کھولا جاتا ہے۔ دراصل افسانہ نگار نے یہاں پر ہندو تہذیب کو مسلم تہذیب سے جوڑ کر دیکھنے کی کوشش کیا ہے۔ اس نے برت کو روزہ تصور کر لیا ہے۔ اس لیے افسانہ نگار سے یہ غلطی ہوئی ہے۔

المختصر یہ کہ 1980 کے بعد کی ہندی کہانیاں موضوعاتی سطح پر بہت کامیاب ہیں۔ ان میں اردو افسانوں کے مقابلے میں زیادہ گہرائی و گیرائی ہے۔ اس دور کی ہندی کہانیوں کا سماج سے بہت گہرا رشتہ ہے۔ جب کہ اردو افسانوں میں موضوعات کا تنوع تو ہے، لیکن سماج سے اس کا رشتہ اتنا گہرا نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو افسانے کو ابتدائی دور ہی میں پریم چند، کرشن چندر، منٹو، بیدی، عصمت اور قرۃ العین حیدر جیسے بڑے افسانہ نگار مل گئے اور انہوں نے سماجی مسائل، سیاسی شعور اور عوام سے جڑے ہوئے تمام مسائل پر بے شمار کہانیاں لکھیں۔ ہندی کہانی کے ابتدائی دور میں اتنے بڑے کہانی کار نہیں ملے۔ یہی وجہ ہے کہ 1980 کے بعد ہندی کہانی کاروں کے پاس موضوعاتی سطح پر کافی گنجائش تھی اور انھوں نے اس پر بہترین کہانیاں تخلیق کی۔ اس کے برعکس اردو افسانہ نگاروں نے موضوعات سے زیادہ فن پر توجہ دی اور پلاٹ، کردار نگاری، تکنیک اور زبان و بیان کی سطح پر خوب تجربے کیے، جس سے اردو افسانے میں فنی سطح پر بہترین اضافہ ہوا۔ بقول اظہار احمد:

''آج کی ہندی کہانی جہاں افسانویت، رومانیت، تکنیک اور لب و لہجہ کے اعتبار سے اردو سے کافی پیچھے ہے وہیں اپنی مقصدیت اور حق شناسی و حق پرستی میں اردو کے مقابلے میں کہیں زیادہ تیکھی، تیز اور دھار دار نظر آتی ہے۔ سماج سے اس کا رشتہ زیادہ گہرا اور وسیع ہے۔''

(اظہار احمد، مشمولات: طارق چھتاری، جدید افسانہ اردو ہندی، براؤن بکس پبلی کیشنز، دہلی، 2015، ص 184)

اظہار احمد کی باتوں سے اتفاق کیا جا سکتا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب قطعی نہیں ہے کہ اردو افسانوں میں موضوعاتی تنوع نہیں ہے۔ 1980 کے بعد اردو میں بہت سے نت نئے موضوعات پر افسانے لکھے گئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہندی کہانیوں کے مقابلے میں اردو افسانوں میں اتنی گہرائی و گیرائی نہیں ہے، جتنی کہ ہندی کہانیوں میں ہے، لیکن فنی سطح پر ہندی کہانیاں اردو افسانوں سے بہت پیچھے ہیں۔

■

Md Nehal Afroz
Research Scholar, Dept of Urdu
Maulana Azad National Urdu University
Gachbowali,Hyderabad - 500032 (Tel)
Mob: 9032815440
Email:nehalmd6788@gmail.com

اردو زبان و ادب کے مسائل

(صوبہ گجرات کے حوالے سے)

عبدالرحمن فیصل

ہر انسانی معاشرہ اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے لسان/ زبان کا ایک نظام تشکیل دیتا ہے اور اسی کے ذریعہ اپنے جذبات و کیفیات و معمولات کا بیان کرتا ہے۔ گویا ایک انسانی معاشرہ میں سب سے پہلے زبان کا وجود ہوتا ہے یہاں زبان سے مراد وہ پہلی شکل ہے جسے بولی کہتے ہیں۔ آہستہ آہستہ زبان اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی ادب کی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بولی اور ادب کا ایک دوسرے سے لازمی رشتہ ہے۔

ہر معاشرے کی اپنی ایک زبان اور تہذیب ہوتی ہے۔ ادب ان دونوں کا مرکب اور مظہر ہے۔ چونکہ ادب انسان کے ذریعے تشکیل دیا جاتا ہے اور انسان ایک معاشرتی مخلوق ہے اس طرح ادب ایک انسانی معاشرہ اوراس کی تہذیب کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

فن پارہ یعنی ادب صرف کسی ادیب یا شاعر کی داخلی کیفیات و تجربات کا بیان نہیں ہوتا بلکہ ساتھ ہی وہ اپنے عہد کے اجتماعی تجربات، نظام اقدار و تصورات اور عام انسانی معتقدات کا بھی مظہر ہوتا ہے۔

کسی بھی زبان کا وجود انسان کی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کے لیے عمل میں آتا ہے۔ علاوہ ازیں اگر زبان کو پاسبانوں کا ساتھ اور حکومت کی سرپرستی حاصل ہو جائے تو وہ مخالفین کی تمام تر کوششوں کے باوجود بھی نشو و نما پاتی اور قوم کی تعمیر و ترقی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ زمانے کے نئے تقاضے جتنے اردو کے لیے اہم ہیں اتنے ہی دوسری زبانوں کے لیے بھی اہم ہیں۔

جہاں تک گجرات میں اردو زبان و ادب کی موجودہ صورت حال کا تعلق ہے وہ تشویش ناک تو ہو سکتی ہے لیکن مایوس کن نہیں۔ عہد حاضر میں دنیا کے سو سے زائد ممالک میں کسی نہ کسی مقام پر کوئی نہ کوئی اردو بولنے، لکھنے اور پڑھنے والا موجود ہے۔ گویا اردو زبان کسی نہ کسی صورت پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی اعراض نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی بھی زبان اُس وقت تک ہی زندہ رہ سکتی ہے، جب تک اُس کے بولنے، لکھنے اور پڑھنے والے باقی ہوں۔

اس خیال کو ذہن میں رکھتے ہوئے صوبۂ گجرات پر نظر ڈالی جائے تو کیا اردو زبان کی صورتِ حال بہتر معلوم ہوتی ہے۔ یقیناً جواب نفی میں ہوگا۔ زبانیں ہمیشہ اپنے بولنے والوں کے ذریعہ بقا حاصل کرتی ہیں اور ترقی کے منازل طے کرتی ہیں۔

صوبۂ گجرات کی مقامی بولی گجراتی ہے اور عالمی مقبولیت رکھنے والی انگریزی زبان حکومتوں و سرکاری دفتروں وغیرہ میں مستعمل ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسے حالات اور معاشرے میں اردو زبان کس طرح اپنا وجود قائم رکھے اور ترقی بھی کرتی رہے۔ ان مسائل پر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو ایسا نہیں ہے کہ ان کا حل ممکن نہیں۔

اردو کی کتابوں پر نظر ڈالی جائے تو ان کی اشاعت میں ہر سال بتدریج اضافے ہو رہے ہیں لیکن قارئین کی تعداد میں مسلسل کمی واقع ہو رہی ہے۔ مادہ پرستی سے لے کر ذرائع ابلاغ مثلاً ریڈیو، ٹی وی چینلز تک اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ چند مسئلوں پر روشنی ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

1۔ گجرات ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان کا اگر ہم جائزہ لیں تو خود ہمارے اردو داں حضرات ادیب و شاعر کی ہی اولادیں نہ صرف اردو سے نا آشنا ہیں بلکہ انہیں اس زبان

سے کچھ رغبت بھی نہیں ہے ہمیں اس قول کو ذہن نشین کر لینا چاہیے اور یاد رکھنا چاہیے کہ ''اصلاح کی شروعات خود اپنی ذات اور اپنے گھر سے کرنی چاہیے۔''

2۔ اردو کا ایک مسئلہ تعلیم و تدریس کا ہے۔ میرے پاس پورے گجرات صوبے کا اعداد و شمار تو نہیں ہے لیکن جو کچھ اب تک دیکھا اور سنا ہے ایسے اسکولوں کی تعداد بہت کم ہے جن میں اردو زبان بحیثیت نصاب پرائمری سے لے کر سینئر سیکنڈری اسکول تک ہو۔ اس لیے تعلیم و تدریس کو اولین اہمیت دینا، خصوصاً ایسے معاشرے میں جہاں رابطے کی زبان مخصوص مقامی بولی ہو، ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اردو کی تعلیم کے سلسلے میں بڑودہ کے سلیمانی بوہرہ طیب جی کے اسکول محمڈن ایجوکیشنل سوسائٹی کی گراں قدر خدمات کا ذکر یہاں ضروری ہے جو قابلِ مبارکباد تو ہے ہی لیکن دیگر صاحبان قوم جو ثروت مند ہیں ان کے لیے باعثِ عبرت بھی ہے۔ اس سوسائٹی کے چار اسکول ہیں اور چاروں میں اردو بحیثیت نصاب پرائمری درجہ سے لے کر سینئر سیکنڈری تک پڑھائی جاتی ہے۔ پورے صوبۂ گجرات میں اردو کے اعلیٰ تعلیمی مراکز صرف تین ہیں بڑودہ کا مہاراجہ سیاجی راؤ یونیورسٹی، گجرات کالج اور گجرات یونیورسٹی۔

اس سلسلے میں مدارس کو بھی پہل کرنی چاہیے اور اپنی نصابی کتابوں کی تدریس میں اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانا چاہیے۔ مزید ایک مسئلہ کی جانب اور توجہ دلاتا چلوں کہ مدارس کو چاہیے کہ وہ ایک ایسا بورڈ بھی قائم کریں کہ ان کے یہاں سے فارغ طلبا کی سندیں گجرات حکومت کے سینئر سکنڈری کی سند کے مساوی ہوں، تا کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے طلبا براہِ راست یونیورسٹیوں اور کالجوں میں داخلہ لے کر اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں۔ اس سلسلے میں گجرات اردو اکادمی کو بھی غور کرنا چاہیے اور ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔

3۔ اردو زبان کا ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ بعض لوگ اسے مذہب کے ساتھ جوڑتے ہیں۔ اردو ایک زبان ہے اور زبان عوام کی ملکیت ہوتی ہے کسی کی جاگیر نہیں۔ یہ نظریہ کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے، سراسر غلط ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستان کی اس محبوب زبان کی نشو و نما میں ملک کے تمام مذاہب کے لوگ ہندو مسلم، سکھ عیسائی غرض کہ فرنگیوں نے بھی بلا امتیاز مذہب و ملت اس کی ترقی میں اپنی خدمات انجام دی ہیں۔ یہ ہر اس فرد کی زبان ہے جو اسے اپناتا ہے۔ جس طرح اس زبان میں دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنے اندر جذب کر لینے کی صلاحیت ہے، اسی طرح اس نے نہ صرف مُحبّان اردو کو قبول کیا ہے بلکہ عزت بھی بخشی ہے۔ میر و غالب ہوں یا دیاشنکر نسیم و رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، سعادت حسن منٹو و قرۃ العین حیدر ہوں یا کرشن چندر و راجیندر سنگھ بیدی، شمس الرحمٰن فاروقی ہوں یا گوپی چند نارنگ، ہر کسی نے اردو زبان و ادب کی خدمت کی ہے اور اردو نے بھی انھیں وہ عزت و وقار عطا کیا ہے، جس کے وہ مستحق تھے۔ آل احمد سرور نے لکھا ہے کہ:

''اردو کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ نہ تو یہ صرف ایک یا دو ریاستوں کی حدود میں مقید ہے نہ ایک مذہبی گروہ کے ماننے والوں میں۔ بلکہ خدا کے گھر کی طرح اس کی بہت سی ریاستوں میں بستیاں ہیں اور اس کے بولنے والے یا اس کے سمجھنے والے کشمیر سے کنیا کماری اور کلکتے سے کچھ تک پھیلے ہوئے ہیں۔''

(پہچان اور پرکھ، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، 2012، ص 48)

4۔ اگر اردو زبان کو صرف بولی جانے والی زبان کے طور پر دیکھیں تو پورے ہندوستان میں رابطے کے طور پر تھوڑی بہت تفریق کے ساتھ اسی زبان کا استعمال سب سے زیادہ کیا جاتا ہے۔ تقسیم برِ صغیر کے بعد ہندوستان میں دیوناگری رسم الخط کو رائج کرنے کے لیے اردو، ہندی تنازعہ پیدا ہوا۔ رسم الخط صرف تحریری نشان نہیں ہوتا بلکہ ہر زبان کے رسم الخط کا اپنا ایک تہذیبی و ثقافتی پس منظر ہوتا ہے جو اپنے اندر آہنگ، لہجہ، ایک مخصوص تلفظ اور تہذیبی شناخت رکھتا ہے۔ جو لوگ بھی اسے بدلنے کی بات کرتے ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر بالکل منفی ہے۔ انھیں شاید اس کا فوری نقصان نظر نہیں آتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ غیر اردو داں طبقہ جو اسے سراہتا ہے اور اس پر زور دیتا ہے کہ اس کا رسم الخط بدل کر اردو کے حلقے کو وسیع کیا جائے۔ یہ مفروضہ سراسر غلط ہے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے جو اردو داں نصیب ہوں گے ان کا تلفظ جس طرز کا ہوگا یہ سوچ کر ہی خوف آتا ہے۔ اس کی جھلک آج کل کے سمیناروں اور مشاعروں میں ہمیں نظر آجاتی ہے۔

اگر اردو زبان کو صرف بولی جانے والی زبان کے طور پر دیکھیں تو پورے ہندوستان میں رابطے کے طور پر تھوڑی بہت تفریق کے ساتھ اسی زبان کا استعمال سب سے زیادہ کیا جاتا ہے۔ تقسیم برِ صغیر کے بعد ہندوستان میں دیوناگری رسم الخط کو رائج کرنے کے لیے اردو، ہندی تنازعہ پیدا ہوا۔ رسم الخط صرف تحریری نشان نہیں ہوتا بلکہ ہر زبان کے رسم الخط کا اپنا ایک تہذیبی و ثقافتی پس منظر ہوتا ہے جو اپنے اندر آہنگ، لہجہ، ایک مخصوص تلفظ اور تہذیبی شناخت رکھتا ہے۔ جو لوگ بھی اسے بدلنے کی بات کرتے ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر بالکل منفی ہے۔ انہیں شاید اس کا فوری نقصان نظر نہیں آتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ غیر اردو داں طبقہ جو اسے سراہتا ہے اور اس پر زور دیتا ہے کہ اس کا رسم الخط بدل کر اردو کے حلقے کو وسیع کیا جائے۔ یہ مفروضہ سراسر غلط ہے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے جو اردو داں نصیب ہوں گے ان کا تلفظ جس طرز کا ہوگا یہ سوچ کر ہی خوف آتا ہے۔ اس کی جھلک آج کل کے سمیناروں اور مشاعروں میں ہمیں نظر آ جاتی ہے۔

واضح رہے کہ غیر اردو داں طبقہ جو اس زبان کے الفاظ و محاورات سے متاثر ہیں، وہ اردو زبان کے دیگر لوازمات کے ساتھ ہی اس کا انداز اور درست تلفظ ہی ہے۔ جو صرف اردو رسم الخط ہی میں ممکن ہے۔ اردو کی شناخت اس کے اصل رسم الخط میں ہی پنہاں ہے کیونکہ اس کے ساتھ اس کا پورا ثقافتی پس منظر جڑا ہوا ہے۔

زبان و ادب کو فروغ دینے میں صحافت اور رسائل بھی اہم کردار نبھاتے ہیں۔ اکیسویں صدی میں شاید ہی گجرات میں کوئی اردو اخبار نکلتا ہو۔ زبان کے فروغ میں اخبار ایک اہم کردار ادا کرتا ہے کیونکہ اخبار روز مرّہ ہونے والے واقعات و حادثات کا بیان ہوتا ہے جو انسان کی دلچسپی کا ایک بہترین وسیلہ ہے۔

اسی طرح رسالہ کی اشاعت، ادبی ذوق اور ادب کے فروغ میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ رسالہ نہ صرف تخلیقی اصناف کو لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے بلکہ اہلِ علم کے مضامین ہمارے لکھنے والوں کے نقطۂ نظر کی رہنمائی بھی کرتے ہیں۔ 'سابرنامہ' گجرات اکادمی سے شائع ہونے والا ایک قدیم ادبی رسالہ ہے۔ اس کے علاوہ اس صوبے سے کوئی اور اردو رسالہ شائع ہوتا ہے اس کی اطلاع راقم کے پاس نہیں۔ جب وسائل ہی موجود نہ ہوں تو نتیجے کی امید بھی بے معنی ہے۔

○

تاریخ شاہد ہے کہ گجرات کی بندرگاہیں تقریباً دو ہزار قبل مسیح سے لے کر اٹھارویں صدی تک تاجروں، صوفیائے کرام، علما و ادبا، ملکی و غیر ملکی حکمرانوں کی آماجگاہ بنی رہیں۔ درحقیقت اردو پندرہویں صدی کے نصف آخر

میں ادبی شکل اختیار کر چکی تھی۔ کیوں کہ سولہویں صدی کی شروعات میں باقاعدہ تصانیف پائی جاتی ہیں۔ ابتدائی دور کے شعرا و علما میں شاہ باجن، قاضی محمود دریائی، شاہ علی الحسینی جیو گاؤں دھنی، خوب محمد چشتی اور محمد امین کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی تصنیفات زیورِ طبع سے آراستہ ہوئیں۔ زیادہ تر محققین کا اس پر اتفاق بھی ہے کہ اردو زبان کو ادبی شکل سب سے پہلے صوبۂ گجرات میں ہی ملی۔ جن لوگوں نے اس روایت کو فروغ بخشا ان میں ولی گجراتی، عزلت سورتی، میاں سجھو، میاں داد خاں سیاح وفدا جیسی شخصیتیں قابلِ ذکر ہیں۔

ادبی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو گجرات میں شعری و نثری ادب کے فروغ کا سلسلہ انیسویں صدی کے اواخر تک پروان چڑھتا رہا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز اور اس کے بعد گجرات میں اردو ادب کو قعرِ گمنامی نصیب ہوئی، یہ بات کس حد تک درست ہے بغیر تحقیق کے کوئی فیصلہ نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ گجرات میں اردو ادب کے نام پر جو کچھ ہمارے سامنے آرہا ہے وہ صرف شاعری تک ہی محدود ہے۔ سخنوران گجرات (1981) اور گجرات میں اردو غزل (1995) کے مطالعے سے اس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بیسویں صدی تک تو گجرات کے شعری ادب کو ایک حد تک وقیع کہا جا سکتا ہے کہ رحمت امروہوی، سرشار بلند شہری، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ محمد علوی، عادل منصوری، رشید افروز، جمال قریشی، خلش بڑودوی، ابہام رشید جیسے شعرا کا تعلق بھی اسی گجرات سے رہا ہے لیکن اکیسویں صدی میں گجرات کا شعری ادب کیسا ہوگا یہ کہنا مشکل ہے۔ کیونکہ اچھا ادب ہمیشہ ایک اچھے قاری کو ذہن میں رکھ کر لکھا جاتا ہے۔ جب عوام ہی اس کے اہل نہ ہوں تو بڑے ادب کی تخلیق بھی ناممکن ہے۔ اکیسویں صدی کے شعرا کے کچھ نام میرے سامنے ہیں جن کا مجموعہ کلام 2000 کے بعد شائع ہوا ہے۔ ان میں کچھ تو 20ویں صدی کے ہی شعرا ہیں جو باحیات ہیں اور ادب کی خدمت کر رہے ہیں مثلاً ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ جینت پرمار (پینسل اور دوسری نظمیں 2006، مانند 2008)، خلیل دھن تیجوی (مجموعہ دھیرے بول 2005)، عباس دانا (موسم 2005، شیش محل 2009، جگنو 2014) وغیرہ، ان کے علاوہ عارف شیخ بڑودہ (عشرت 2003، آفرین 2010)، انور بڑودوی (مجموعہ تجلیات انور 2009)، ظہیر صبا قادری بڑودہ (مجموعہ سب رنگ 2014)، عقیل شاطر (ابھی زندہ ہوں میں 2010)، شبیر ہاشمی (لفظوں کا لہو 2013)، شبنم انصاری (آئینۂ احساس 2018)، اکرم ناگنوی (اعتبارِ قلم 2013)، روشن خان گرگٹ (میٹھا لہجہ کڑوا سچ 2014) وغیرہ ہیں جن کے مجموعہ کلام اب تک شائع ہو چکے ہیں۔

شعری ادب کے مسائل کے تعلق سے دیکھیں تو مشاعرہ جسے ہمارے یہاں کبھی ادبی حیثیت حاصل تھی اور نئے شعرا کی تربیت گاہیں ہوا کرتی تھیں۔ آج اس کی صورت حال ادب کے سنجیدہ سامعین اور قارئین سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ اس غم کا احساس ہمارے بزرگوں نے جا بجا اپنی تحریروں میں کیا ہے۔ وارث علوی کا یہ بیان ملاحظہ کریں جس میں ان کا غصہ صاف نظر آتا ہے:

تاریخ شاهد هے که گجرات کی بندرگاهیں تقریباً دو هزار قبل مسیح سے لے کر اٹھارویں صدی تک تاجروں، صوفیائے کرام، علما و ادبا، ملکی و غیر ملکی حکمرانوں کی آماجگاه بنی رهیں۔ درحقیقت اردو پندرهویں صدی کے نصف آخر میں ادبی شکل اختیار کر چکی تهی۔ کیوں که سولهویں صدی کی شروعات میں باقاعده تصانیف پائی جاتی هیں۔ ابتدائی دور کے شعرا و علما میں شاه باجن، قاضی محمود دریائی، شاه علی الحسینی جیو گاؤ ں دهنی، خوب محمد چشتی اور محمد امین کے نام لیے جا سکتے هیں۔یه وه لوگ هیں جن کی تصنیفات زیور طبع سے آراسته هوئیں۔ زیاده تر محققین کا اس پر اتفاق بهی هے که اردو زبان کو ادبی شکل سب سے پهلے صوبهٔ گجرات میں هی ملی۔ جن لوگوں نے اس روایت کو فروغ بخشا ان میں ولی گجراتی، عزلت سورتی، میاں سمجهو، میاں داد خاں سیاح و فدا جیسی شخصیتیں قابل ذکر هیں۔

''ادبی جلسوں میں سامعین کی تعداد آپ کو بتا دے گی کہ لوگوں کو ادب سے کتنی دلچسپی ہے۔ جم غفیر اگر آپ کو دیکھنا ہو تو مشاعروں میں جائیے..... مشاعروں نے شاعروں کی ایک ایسی نسل پیدا کی ہے جو صرف مشاعروں میں چہچہاتی ہے اور مشاعروں کے باہر کہیں نظر نہیں آتی۔ مشاعرہ باز شاعروں کو ادب، شاعری، زبان، فن اور زندگی کے مسائل سے کچھ لینا دینا نہیں ہوتا۔ وہ جو صرف جاہل عوام کی مدح وستائش پر جیتے ہیں اور جن کی ادبی عمر صرف مشاعروں کی چند جگمگاتی راتیں ہوتی ہیں وہ فی الحقیقت بورژوا سماج کی تفریحی منصوبہ بندی میں ادنیٰ دل لگی کے سامان سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔''

(اے پیارے لوگو، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی، اکتوبر 1981، ص 47-49)

اب تک میرے مطالعے میں شعرا کے علاوہ گجرات میں جو ادبی شخصیتیں نظر آئی ہیں جنھوں نے ادب کی دوسری اصناف میں اپنی خدمات انجام دی ہیں ان کا شمار انگلیوں پر کیا جا سکتا ہے۔ ان میں پروفیسر وارث علوی، سید ظہیر الدین مدنی اور بڑودہ یونیورسٹی کے سابق پروفیسر ڈاکٹر انور ظہیر انصاری کا نام قابلِ ذکر ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور نام ڈاکٹر محمد زبیر قریشی کا بھی لیا جا سکتا ہے۔ ہمارے لیے یہ حضرات اس لیے بھی اہم ہیں کہ انھوں نے ہمیں ادب فہمی کا سلیقہ سکھایا ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ایک اچھا ادیب، تخلیق کار یا شاعر بننے کے لیے اچھا ادب فہم ہونا ضروری ہے۔ ورنہ ادب کا جو حال ہوگا وہ ہماری نظروں سے پوشیدہ نہیں ہے۔

گجرات کے ان بزرگوں کا ذکر کرنا بھی یہاں ضروری ہے جنھوں نے اردو ادب کی خدمت دیوانوں کی طرح کی ہے اور مزید ایسے لوگ ابھی زندہ ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں، جو اپنے بزرگوں کے ادبی کارناموں کو منظرِ عام پر لانا چاہتے تھے۔ اس تحریک میں ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی، گجرات اکادمی کے سابق چیرمین مرحوم پروفیسر وارث علوی، احمد آباد کی پیر محمد شاہ لائبریری کے ڈائریکٹر پروفیسر محی الدین بومبے والا صاحب کے نام قابل ذکر ہیں۔

پروفیسر محی الدین بومبے والا نے اس لائبریری کے زیرِ اہتمام بہت سے ادبی سیمناروں کا انعقاد کیا ہے اور متعدد کتابیں بھی شائع کی ہیں۔ اس سلسلے میں گجرات اردو اکادمی نے جو پہل کی ہے وہ بھی قابل ستائش ہے۔ اکادمی نے نادر ونایاب مخطوطات کو کتابی شکل میں شائع کر کے اردو ادب کی روایت کو مستحکم کیا ہے۔ شبیر ہاشمی اور مولانا مظفر حسین کا ذکر بھی اس حوالے سے ضروری ہے کہ وہ گجرات اکادمی کے تعاون سے ادبی پروگراموں کا انعقاد کر کے لوگوں میں اس زبان و ادب کے تئیں دلچسپی پیدا کر رہے رہیں۔ اس گفتگو کا اختتام اردو کے تابناک ماضی کی یاد میں، داغ کے اس شعر سے ہوتا ہے:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

■

Dr. Abdurrahman Faisal
Dept of Persian, Arabic and Urdu
The Maharaja Sayajirao University of Vadodara
Pratapgunj
Vadodara-390002 (Gujarat)

محمد عظمت الحق

غیر افسانوی اصنافِ ادب

ساری دنیا میں لفظی اظہار و بیان کے ہمیشہ سے دو طریقے رہے ہیں: (1) نظم اور (2) نثر۔ اس طرح ادب دو حصوں میں منقسم ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ 'نظم' اور 'نثر' اگرچہ ادب کی دو شاخیں ضرور ہیں لیکن ہر منظوم تحریر ادب میں شامل نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ قدیم زمانے میں علمی، فنی طبی اور صرف ونحو کی کتابیں بھی نظم میں لکھی گئی ہیں۔ اسی طرح ہر نثری تحریر بھی ادب میں داخل نہیں ہوسکتی۔ موضوع اور ہیئت کے لحاظ سے نظم ونثر کی مختلف اصناف ہیں۔ نثری اصناف کو پھر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ 'افسانوی نثر' اور 'غیر افسانوی نثر' اسی کو 'افسانوی ادب' اور 'غیر افسانوی ادب' سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

افسانوی نثر یا افسانوی ادب میں داستان، ناول، ناولٹ، افسانہ اور ڈراما شامل ہیں۔ ان تمام اصناف میں قصہ یا کہانی قدرے مشترک ہے یعنی ان اصناف کی بنیاد کہانی یا قصے پر ہوتی ہے۔ اس کے لیے فنکار اپنی غیر معمولی قوتِ متخیّلہ، سماجی وسیاسی بصیرت اور تجربے ومشاہدے سے کام لے کے غیر حقیقی واقعات کو حقیقت کے لباس میں پیش کرتا ہے۔

غیر افسانوی نثر یا غیر افسانوی ادب میں ہم جن اصناف کو شامل کر سکتے ہیں وہ یہ ہیں: (1) مضمون (2) انشائیہ (3) مقالہ (4) مکتوب (5) سفر نامہ (6) سوانح نگاری (7) خودنوشت سوانح (8) آپ بیتی (9) خاکہ (10) رپورتاژ (11) روزنامچہ (12) دیباچہ (13) مقدمہ (14) تقریظ (15) تنقید (16) تبصرہ (17) تحقیق (18) تذکرہ۔

اردو نظم کی طرح اردو نثر کا آغاز بھی دکن سے ہوتا ہے۔ اردو زبان پر عرصۂ دراز تک افسانوی ادب کا غلبہ رہا جس کی مثال ہمارا وسیع اور وقیع داستانی ادب ہے۔ اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو میں غیر افسانوی ادب یا نثر کے ابتدائی نقوش بھی ہمیں دکنی زبان میں تحریر کیے گئے رسائل اور ملفوظات میں نظر آتے ہیں۔ صوفیائے کرام نے بندگانِ خدا کی تعلیم اور ان کی اخلاقی تربیت کے لیے اسلامی تعلیمات پر مشتمل کئی چھوٹے چھوٹے رسائل تحریر کیے۔ ان رسائل میں اسلامی تعلیم، شرعی احکامات، فقہی مسائل، عقائد اور تصوف کے رموز ونکات کی تشریح وتوضیح کی جاتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ ان میں تمدنی اور مجلسی زندگی گزارنے کے طور طریقے بھی بتائے جاتے تھے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد، ان کے باضابطہ قبضے اور قیامِ حکومت کے بعد جب مختلف علوم وفنون کو فروغ دینے کی کوششوں کا آغاز ہوا تو غیر افسانوی ادب کی ترویج واشاعت کی راہیں بھی ہموار ہوئیں۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قیام اور انگریزی زبان و ادب کے زیرِ اثر اردو میں سب سے پہلے جس غیر افسانوی صنف کو فروغ حاصل ہوا وہ 'مضمون' ہے۔ اس لیے سب سے پہلے اسی صنف کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

مضمون:

کسی طے شدہ عنوان پر تفصیلی اور مستند معلومات جمع کر کے، اس کے ممکنہ ذیلی موضوعات کا احاطہ کرتے ہوئے ترتیب وتسلسل اور جامعیت کے ساتھ پیش کرنے کا نام مضمون نگاری ہے۔ مضمون نگاری انشا پردازی کا ایک اہم حصہ ہے۔ کسی بھی موضوع یا عنوان پر دو چار صفحے یوں ہی بے ترتیب لکھ دینا مضمون نہیں کہلاتا۔ بلکہ اپنے خیالات واحساسات، تجربات ومشاہدات اور معلومات اور تاثرات کو مربوط اور مرتّب شکل میں موثر اسلوبِ نگارش کے ساتھ اس طرح پیش کرنا کہ ایک طرف لکھنے کا مقصد بھی پورا ہو جائے اور دوسری طرف پڑھنے والے کو بھی وہ تمام باتیں سمجھ میں آجائیں، مضمون کہلاتا ہے۔ مضمون نگاری کے لیے کسی خاص موضوع کی شرط نہیں۔ ادبی، مذہبی، علمی، سائنسی، سماجی، سیاسی، تعلیمی، تاریخی، شخصی غرض حیات وکائنات سے متعلق کسی بھی موضوع پر مضمون قلمبند کیا جاسکتا ہے۔ ترتیب وتسلسل، روانی، اختصار میں جامعیت اور دلچسپ اور موثر پیرایۂ اظہار ایک اچھے مضمون کی خصوصیات ہوتی ہیں۔

اردو میں مضمون نگاری کی ابتدا دلی کالج کے قیام (1825) کے ساتھ ہوئی۔ دلی کالج کے طالبِ علم ماسٹر رام چندر کو اردو مضمون نگاری کا بانی خیال کیا جاتا ہے۔ سر سید احمد خاں اور ان کے رفقا نے بعد میں اس روایت کو آگے بڑھایا۔ اخبارات اور رسائل کے ذریعے مضمون نگاری کو زبردست فروغ حاصل ہوا۔ آج غیر افسانوی نثری صنف میں مضمون کو جو مقبولیت اور اہمیت حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

مضمون کی ضرورت، اہمیت اور افادیت مسلّم ہے۔ جو لوگ کسی موضوع پر کوئی مستقل کتاب نہیں پڑھ سکتے یا انھیں ایسی کتاب پڑھنے کا وقت نہیں ہوتا وہ لوگ ایک مختصر مضمون کے ذریعے اس موضوع سے متعلق چند بنیادی اور اہم ترین باتوں سے واقف ہوجاتے ہیں۔ جب قارئین کسی موضوع پر مختصر، جامع اور دلچسپ مضامین پڑھتے ہیں تو ان کے اندر موضوع سے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ یہ شوق انھیں متعلقہ موضوع کی کتب تک لے جاتا ہے اور وہ کتب بینی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک چھوٹا سا مضمون قارئین کے ذوقِ مطالعہ کی آبیاری کرتا ہے۔ مضمون، کم سے کم

وقت میں معلومات کی ترسیل وابلاغ اور حصول کا ایک اہم اور موثر ذریعہ ہے۔ چنانچہ اس کی ضرورت، اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

انشائیہ:

ایک ایسا ہلکا پھلکا مضمون جس میں بے ساختگی اور بے تکلفی کے ساتھ نہایت دلچسپ اور شگفتہ اسلوب میں کسی موضوع پر اظہارِ خیال کیا جائے، انشائیہ کہلا تا ہے۔ ایسے مضمون کو انگریزی میں Light Essay کہا جاتا ہے۔ Essay فرانسیسی لفظ Essai سے مشتق ہے۔ بعض ماہرینِ لسانیات اور علمائے ادب کا خیال ہے کہ خود Essai عربی زبان کے لفظ 'السعی' سے ماخوذ یا اس کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ فرانسیسی زبان میں اس کے معنی 'کچھ کہنے کی کوشش' کے ہیں۔ یہ معنی 'السعی' کے معنی سے بہت قریب ہیں۔ عربی میں 'سعی' کے معنی بھی کوشش کے ہیں۔ انگریزی ادب کے معروف ادیب بیکن نے Light Essay کو ایسی ہلکی پھلکی اور مختصر تحریر کہا ہے جس میں بغیر کسی کھوج اور تجسس کے حقیقت کا اظہار ہو۔ اردو میں اس قسم کے مضامین کے لیے 'انشائیہ' کا لفظ وضع کرلیا گیا ہے۔

اردو میں انشائیہ نگاری کا آغاز بھی انگریزی زبان کے زیرِ اثر ہوا۔ ابتدا میں مضمون اور انشائیہ میں فرق نہیں سمجھا گیا اور دونوں کو Essay کے نام ہی سے موسوم کیا گیا۔ بعد میں دونوں کے حدود، فنی محاسن اور اندازِ نگارش کی روشنی میں انھیں دو الگ الگ اصناف قرار دیا گیا۔ آج مضمون اور انشائیہ دو جداگانہ نثری اصناف کی حیثیت سے اردو کے غیر افسانوی ادب میں معروف اور مقبول ہیں۔ سنجیدگی، ترتیب وتسلسل اور جامعیت مضمون کی جان اور حسن ہے۔ جبکہ انشائیہ میں بے ترتیب اور بے تکلف گفتگو کا انداز پایا جاتا ہے اور یہ بے ترتیبی ہی اس کا حسن ہے۔ انشائیہ میں انشائیہ نگار اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات کو نہایت دلچسپ، ہلکے پھلکے اور بے حد شگفتہ اسلوب میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ قاری اس سے ذہنی تلذذ اور لطف وانبساط حاصل کرتا ہے۔ ماہرین ادب کے نزدیک انشائیہ کا بنیادی مقصد مسرت بہم پہنچانا ہے۔ علمائے ادب نے یہ بھی کہا ہے کہ انشائیہ گہری علمیت، قواعد وضوابط اور سنجیدگی کا بوجھ برداشت نہیں کرسکتا۔ وہ ایک طرف قاری کو دعوتِ غور وفکر دیتا ہے تو دوسری طرف نشاط وفرحت اور کیف وسُرور بھی عطا کرتا ہے۔

کہا گیا ہے کہ انشائیہ کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اس کی کوئی شرط نہیں جو کہو اس طرح کہو کہ پڑھ کر جی خوش ہو جائے اور پڑھنے والے کے ذہن میں گدگدی سی ہونے لگے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ انشائیہ میں حکمت وحماقت اور مقصدیت اور بے مقصدیت اس طرح آپس میں گتھ جاتے ہیں کہ ان کا الگ کرنا ناممکن ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد، مولوی عبدالحلیم شرر، خواجہ حسن نظامی، مرزا فرحت اللہ بیگ، ملا رموزی، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، کنھیا لال کپور، ابنِ انشا، مشتاق احمد یوسفی اور مجتبیٰ حسین وغیرہم نے اردو میں انشائیہ کے فن کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

مقالہ:

مقالہ بھی مضمون ہی کی ایک شکل ہے۔ ادب کی اصطلاح میں مقالے کا اطلاق ایسے طویل اور بسیط مضمون پر ہوتا ہے جس میں عالمانہ افکار وخیالات کو دلائل وبراہین کے ساتھ پیش کیا گیا ہو اور جس میں تحقیق اور تدقیق کے رنگ کے ساتھ مقالہ نگار کی تنقیدی بصیرت بھی نمایاں ہو۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر کے بقول:

مقالہ عام طور پر اس طویل اور بسیط مضمون کو کہتے ہیں جس میں کسی موضوع پر عالمانہ انداز میں مفصل روشنی ڈالی جائے۔ مقالہ اپنی استدلالی صلاحیت اور گہرائی کی وجہ سے ہلکے پھلکے مضامین سے خاصا مختلف ہوتا ہے۔[1]

پروفیسر گیان چند کے مطابق:

تحقیقی مقالہ وہ تحریر ہے جس میں زیرِ تحقیق موضوع کے متعلق جملہ مواد کو پیش کیا جاتا ہے، پرکھا جاتا ہے اور اس کے بعد مناسب نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔[2]

دراصل مقالہ اعلیٰ درجے کے تحقیقی مضمون کو کہا جاتا ہے جس میں مقالہ نگار کسی موضوع پر تحقیق کر کے اس موضوع سے متعلق کچھ نئے انکشافات کرتا ہے یا پرانے انکشافات کی توثیق یا تردید کرتا ہے۔ مقالہ نگار کسی بات کی توثیق کرے یا تردید، ہر دو صورتوں میں اسے مضبوط دلائل اور حوالوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ ایسے مقالوں میں تنقیدی اور تجزیاتی پہلو بھی ہوتا ہے۔ مقالہ نگار اپنی تنقیدی بصیرت اور تجزیاتی صلاحیت سے کام لے کر حقائق کو پیش کرتا ہے۔ عام طور پر ایسے مقالے طویل اور بسیط ہوتے ہیں جن کی تحریر اور تکمیل کے لیے بڑی کدو کاوش، چھان بین، عرق ریزی اور تحقیق وتدقیق کی ضرورت ہوتی ہے۔ مقالہ بے حد سنجیدہ، علمیت سے معمور اور معروضی ہوتا ہے۔

مقالے کی زبان بے حد سنجیدہ اور علمی ہوتی ہے۔ تخلیقی زبان مقالے کے لیے نامناسب ہے۔ ایسی زبان تخلیقی ادب کے لیے مناسب بلکہ احسن سمجھی جاتی ہے۔ ابہام اور رنگین بیانی مقالے کے عیوب میں شمار ہوتے ہیں۔

مکتوب:

مکتوب (خط) بھی غیر افسانوی ادب کی اہم صنف ہے۔ مکتوب یا خط دو اشخاص کے درمیان رابطے اور ترسیلِ خیال کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ آج سے چند برس پہلے تک بھی دور دراز رہنے والے دو افراد کے مابین رابطے اور تبادلۂ خیال کا سب سے اہم ذریعہ مکتوب ہی تھا۔ آج ٹیلی فون اور موبائل فون کی وجہ سے راست بات چیت کرنے کی سہولت میسر ہے لیکن پہلے ایسا نہیں تھا۔ لوگ اپنے دوست واحباب اور عزیز واقارب سے مکتوب کے ذریعے ہی رابطہ قائم کرتے تھے۔ عربی زبان میں ایک کہاوت ہے 'المکتوب نصف الملاقات'۔ یعنی خط آدھی ملاقات ہے۔ مکتوب غیر افسانوی نثر کی ایسی صنف ہے جس میں مکتوب نگار اپنے ذاتی حالات اور کوائف، ضروریات اور خواہشات کا بے ساختہ اظہار کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ دوسروں کے حالات وکوائف کو جاننے کا متمنی بھی ہوتا ہے۔

مکتوب، مکتوب نگار کی شخصیت اور اس کی فکر ونظر کا عکاس ہوتا ہے۔ مکتوب میں مکتوب نگار کی شخصیت پورے حسن وقبح کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ کسی شخصیت کی زندگی کے بعض ایسے پہلو جو کسی اور جگہ نمایاں نہیں ہوتے وہ اس کے مکاتیب میں نمایاں ہوجاتے ہیں۔ یہ وہ صنفِ ادب ہے جس کے ذریعے مکتوب نگار کی تہدار اور پیچیدہ شخصیت، اس کے عادات واطوار اور سیرت وکردار کی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ دوسری شخصیات سے متعلق مکتوب نگار کی کچھ ایسی رائیں بھی سامنے آتی ہیں جنھیں وہ کسی مصلحت کے پیشِ نظر کسی مضمون یا کتاب میں ظاہر نہ کرسکا ہو۔ علاوہ ازیں مکاتیب میں اس عہد کی معاشی، معاشرتی، سیاسی، سماجی، مذہبی اور تمدنی حالات کی عکاسی بھی ہوتی ہے جس عہد میں وہ مکاتیب لکھے گئے ہیں۔ اس طرح مکاتیب ہم عصر تہذیب وتاریخ کے ترجمان بھی بن جاتے ہیں۔

اردو میں غالب، حالی، شبلی، اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد کے مکاتیب علمی اور ادبی لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ غالب اور مولانا آزاد کے مکاتیب اپنے اپنے انفرادی اسلوب کے اعتبار سے اردو ادب میں امتیازی شان کے حامل ہیں۔

سفر نامہ:

سفرنامہ، غیر افسانوی ادب کی ایک اہم صنف ہے۔ نقلِ مکانی اور مختلف دِیار واَمصار کا سفر کرنا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ یہ نقلِ مکانی اور سفر کبھی تجارت کی غرض سے ہوتا ہے تو کبھی حصولِ علم کے لیے ہوتا ہے۔ ایک کہاوت ہے 'سفر وسیلۂ ظفر' یعنی سفر کامیابی کا

وسیلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی 'سیروفی الارض' کہہ کر سیر وسیاحت کے ذریعے اللہ کی نشانیوں پر غور وتدبر کرنے کا حکم دیا ہے۔ کسی کا مشہور شعر ہے۔

سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں
زندگانی ہو بھی تو پھر نوجوانی پھر کہاں

کبھی کبھی زندگی کی یکسانیت سے اکتا کر محض سیر وتفریح کی خاطر رخت سفر باندھا جاتا ہے۔ بعض لوگ مہم جو واقع ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ نئے مقامات کی کھوج، نئی دنیاؤں کی تلاش اور نئی نئی چیزوں کی دریافت کی غرض سے دریاؤں، سمندروں، پہاڑوں اور جنگلات کے خطرناک سفر پر نکل پڑتے ہیں۔ نئے مقامات کی سیر وتفریح اور نئے نئے خوشنما مناظر کو دیکھنے سے انسان کے جمالیاتی ذوق کی تسکین ہوتی ہے۔

سفر تو تقریباً ہر انسان کرتا ہے لیکن جو قلم کار ہوتے ہیں ان میں سے بعض حضرات اپنے سفر کی روداد پُرلطف اور دلچسپ انداز میں قلمبند کرتے ہیں۔ کسی سفر کی روداد نہایت دلچسپ اور ادبی زبان اور دلکش اسلوب میں تحریر کی جاتی ہے تو وہ سفرنامہ کہلاتا ہے۔

سفرنامہ ایسی غیر افسانوی صنف ادب ہے جس کے مطالعے سے ہمیں مختلف مقامات، ملکوں، شہروں، قوموں اور قبیلوں کی تہذیب وثقافت، سماجی وسیاسی صورتِ حال، مذاہب اور عقائد، ادبی اور علمی زندگی، معاشی اور تعلیمی ترقی یا پس ماندگی کا علم ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان مقامات کے جغرافیائی حالات، موسم اور آب وہوا کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ان گوناگوں فوائد کے پیش نظر سفرناموں کی اہمیت سے شاید ہی کسی کو انکار کر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ سفرنامہ مختلف زبانوں کے ادب میں خاص مقام کا حامل ہے۔

دنیا میں سفرنامہ نگاری کی شروعات کس نے کی یہ بتا نا مشکل ہے۔ ماہرین کا ماننا ہے کہ یونانی سیاح ہیروڈوٹس دنیا کا پہلا سفرنامہ نگار ہے۔ اردو کا پہلا سفرنامہ 'تاریخِ یوسفی' ہے جس کے مصنف یوسف خاں کمبل پوش ہیں۔ یہ سفرنامہ 'عجائباتِ فرنگ' کے نام سے بھی مشہور ہے۔

سوانح :

'سوانح' سانحہ کی جمع ہے۔ سانحہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں: پیش ہونے والا، یا ظاہر ہونے والا وقوعہ، ماجرا۔ کسی فرد کی زندگی کے تمام حالات، کوائف، واقعات اور نشیب وفراز کو زمانی ترتیب کے ساتھ قلمبند کرنے کو سوانح نگاری کہتے ہیں۔ انگریزی میں اسے Biography کہا جاتا ہے۔ Bio کے معنی ہیں حیات اور Graphy کے معنی ہیں لکھنا۔ اس طرح اس کے معنی ہوئے حیات نگاری۔ بادی النظر میں سوانح نگاری کا سیدھا تعلق اس مخصوص فرد سے ہوتا ہے جس کی سوانح لکھی جارہی ہوتی ہے۔ لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو کسی فرد کی سوانح اس دور کی تاریخ بھی ہوتی ہے جس دور میں وہ فرد مصروف کار تھا۔ اس طرح سوانح نگاری کے ڈانڈے تاریخ نگاری سے بھی ملتے ہیں۔

سوانح میں کسی مشہور ومعروف شخصیت کی زندگی کے تمام حالات اور واقعات، کارناموں اور خدمات کو تاریخی ترتیب کے ساتھ تفصیل سے پیش کیا جاتا ہے۔ ایسی سوانح اچھی سمجھی جاتی ہے جس میں صاحبِ سوانح کی شخصیت کے تمام پہلو بہ حسن وخوبی اجاگر کیے گئے ہوں اور جس میں اس کی شخصی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کی خامیوں کا بھی جائزہ لیا گیا ہو۔ اچھی سوانح کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ صاحبِ سوانح کے کارناموں کو نہ صرف تفصیل سے پیش کیا جائے بلکہ مناسب اور احسن طریقے سے ان پر نقد وتبصرہ بھی کیا جائے۔ غیر مستند یا فرضی واقعات کی شمولیت اور مبالغہ آرائی کو سوانح نگاری کا سب سے بڑا عیب سمجھا جاتا ہے۔

اردو میں سوانح نگاری کی بنیاد حالی نے رکھی۔ یادگارِ غالب، حیاتِ جاوید، حیاتِ سعدی ان کی مشہور سوانحی تصانیف ہیں۔ حالی کے بعد شبلی نے اس روایت کو آگے بڑھایا اور سیرت النبیؐ، المامون، الغزالی، الفاروق، سوانح مولانا روم، شبلی کی سوانحی کتابیں ہیں۔ دیگر ادیبوں نے اس روایت کو مزید آگے بڑھایا۔ آج سوانح اردو کے غیر افسانوی ادب کا ایک اہم حصہ ہے۔

خود نوشت سوانح:

خودنوشت سوانح کسی فرد کی وہ داستانِ حیات ہے جسے خود اس نے پورے ہوش وحواس کے ساتھ اور حقائق کی روشنی میں تحریر کیا ہو۔ سادے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے حالاتِ زندگی خود قلمبند کرے تو اسے خودنوشت سوانح کہا جاتا ہے۔ انگریزی میں اسے Autobiography کہتے ہیں۔ خودنوشت سوانح کا مرکز ومحور خود مصنف کی ذات ہوتی ہے۔ دیگر افراد کا ذکر ضمنی طور پر درمیان میں آتا ہے۔ خودنوشت سوانح کے لیے بھی ضروری ہے کہ جو بھی واقعات قلمبند کیے جارہے ہوں وہ حقائق پر مبنی ہوں۔ جھوٹ اور غلط بیانی قارئین کو گمراہ کر دیتی ہے۔ خودنوشت سوانح نگار کو اپنے بچپن کے واقعات اگر پوری طرح یاد نہ ہوں تو کسی معتبر وسیلے کا سہارا لیا جاسکتا ہے۔ خودنوشت سوانح میں مصنف اپنی زندگی کے واقعات، حادثات، اور تجربات ومشاہدات کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس کی تمام جذباتی اور نفسیاتی کیفیت قاری پر اجاگر ہوتی ہے۔ خودنوشت سوانح سے صاحبِ تصنیف کے افکار ونظریات، عقائد، کسی مخصوص چیز کے متعلق اس کی رائے، اس کی ترجیحات اور خواہشات، پسند ناپسند غرض تمام باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

اب تک کی تحقیق کے مطابق محمد جعفر تھانیسری کی 'تواریخ عجیب' المعروف بہ 'کالا پانی' اردو کی پہلی خودنوشت سوانح سمجھی جاتی ہے۔ سررضا کی 'اعمال نامہ' یوسف حسین خاں کی 'یادوں کی دنیا' جوش ملیح آبادی کی 'یادوں کی برات' مشتاق احمد یوسفی کی 'زرگزشت' وغیرہ اردو کی چند اہم ترین اور مشہور خودنوشت سوانح عمریاں ہیں۔

خاکہ:

'خاکہ' کے معنی ہیں: کسی عمارت کا کچا نقشہ، کسی چیز کے خدوخال کی نقل جو اصل کے مشابہ ہو، کسی صورتِ حال یا کسی حقیقت کی مختصر کیفیت کا نقشہ۔ خاکے کی اصطلاح مصوری میں بھی مروّج ہے۔ جب مصور کسی فرد کی مکمل تصویر بناتا ہے تو اسے پورٹریٹ کہا جاتا ہے اور اگر وہ آڑھی ترچھی لکیروں کی مدد سے کسی شخص کے خدوخال نمایاں کرتا ہے تو اسے 'اسکیچ' کہتے ہیں۔ ادب کی اصطلاح میں خاکہ اس نثری صنف کو کہا جاتا ہے جس میں کسی فرد کا ناک نقشہ، خد وخال، عادات واطوار، سیرت وکردار کی لفظوں کے ذریعے تصورکشی کی جاتی ہے۔ خاکہ کے لیے اردو میں قلمی تصویر، مرقع شخصی مرقع اور چہرہ بشرہ جیسی اصطلاحات بھی استعمال کی جاتی ہیں۔ آج کل 'خاکہ' کا لفظ پوری طرح سے رائج ہوگیا ہے۔

خاکہ ایک طرح کا سوانحی مضمون ہوتا ہے لیکن اس میں تفصیل کی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہاں کسی شخص کی زندگی، عادات واطوار، سیرت وکردار کی صرف جھلکیاں دکھائی جاتی ہیں۔ بلکہ بعض وقت ان کی طرف صرف اشارے کر دیے جاتے ہیں۔ گویا خاکہ نگاری کا فن غزل اور افسانے کے فن سے مماثلت رکھتا ہے۔ کیونکہ ان دونوں اصناف میں بھی تفصیل اور وضاحت کی گنجائش نہیں ہوتی۔ خاکے میں کسی شخصیت کے چند اہم ترین اور نمایاں نقوش اس طرح پیش کیے جاتے ہیں کہ اس کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہماری نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اگرچہ خاکہ سوانحی مضمون ضرور ہے لیکن یہ سوانح سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ سوانح میں واقعات کی تفصیل ہوتی ہے جب کہ خاکے میں تاثرات غالب رہتے ہیں۔ ماہرین کے مطابق سوانح میں تو خاکے کی گنجائش نکل سکتی ہے لیکن خاکے میں سوانح کی شمولیت غیر واجبی اور نا مناسب ہے۔ دوسری اہم

بات یہ ہے کہ خاکے میں بذلہ سنجی، ظرافت، پُر لطف انداز اور شگفتہ اسلوب غالب رہتا ہے۔

اردو میں خاکہ نگاری کی ابتدائی جھلکیاں شعرائے اردو کے تذکروں میں نظر آتی ہیں، لیکن خاکہ نگاری کا باضابطہ آغاز مرزا فرحت اللہ بیگ سے ہوتا ہے جب انھوں نے 'مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی' لکھی۔ مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، شوکت تھانوی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی اور مجتبیٰ حسین اردو کے چند اہم اور مشہور خاکہ نگار ہیں۔

رپورتاژ:

'رپورتاژ' انگریزی لفظ 'رپورٹ ایج' کا فرانسیسی تلفظ ہے۔ انگریزی اور فرانسیسی زبان میں یہ لفظ اطالوی زبان کے ذریعے داخل ہوا ہے۔ رپورتاژ کے معنی ہیں کسی جلسے، کانفرنس یا واقعے کی ایسی تفصیلی رپورٹ جس میں مصنف خود شریک رہا ہو۔ یعنی اس میں کسی آنکھوں دیکھے حال کی تفصیلات بیان ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر طلعت گل نے رپورتاژ کے بارے میں انگریزی مصنف جان کیری کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

> عینی شاہد کے ذریعے ضبطِ تحریر میں لائے گئے ایسے ٹھوس حقائق ہیں جو حادثے یا واقعے کے وقوع پذیر ہونے کے بعد قلمبند کیے گئے ہوں۔ وقت اور تاریخ کا تعین اور خود مصنف کا عینی شاہد ہونا رپورتاژ کو زیادہ معتبر بنا دیتا ہے۔[3]

رپورتاژ ایک طرح کی رپورٹ ہی ہوتی ہے لیکن اخباری رپورٹ سے یہ رپورٹ یکسر مختلف ہوتی ہے۔ رپورتاژ طویل ہوتی ہے اور اس کا لکھنے والا جلسوں، کانفرنسوں اور مشاعروں کی رپورٹ تمام جزئی تفصیلات کے ساتھ ادبی پیرائے میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ قاری کے سامنے وہ سارا منظر آ جاتا ہے۔ رپورتاژ پڑھنے کے دوران قاری خود کو اس جلسے میں شریک سمجھتا ہے۔ پروفیسر احتشام حسین نے اسے کسی واقعے کی ادبی اور محاکاتی رپورٹ کہا ہے۔ رپورتاژ کا تعلق بہ یک وقت صحافت اور ادب دونوں سے ہے۔ صحافتی رپورٹ بالکل روکھی پھیکی اور سادہ ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف رپورتاژ میں ادب کی چاشنی ہوتی ہے اور اس کا اسلوب افسانوی ہوتا ہے۔ اس میں مصنف کے تاثرات اور جذبات بھی شامل ہوتے ہیں۔ رپوتاژ میں اسلوب تو افسانوی ہوتا ہے لیکن تمام واقعات اور کردار حقیقی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علی سردار جعفری نے رپورتاژ کو صحافت اور افسانے کی درمیانی کڑی کہا ہے۔

اردو میں رپورتاژ نگاری کا آغاز ترقی پسند تحریک کے زمانے میں اور خود ترقی پسند مصنّفین کے ذریعے ہوا۔ ترقی پسند مصنّفین کے ادبی جلسوں کی روداد حمید اختر نے ادبی رنگ میں لکھ کر اردو میں رپورتاژ نگاری کی بنیاد رکھی۔ یادیں (سجاد ظہیر) پودے (کرشن چندر) دلی کی پتا (شاہد احمد دہلوی) چھٹا دریا (فکر تونسوی) پو پھٹے (خدیجہ مستور) اردو کے چند اہم اور مشہور رپورتاژ ہیں۔

روزنامچہ:

'روزنامچہ' کے لغوی معنی ہیں: سیاہا۔ ہر روز کا حساب لکھنے کی بیاض۔ وہ بہی کھاتہ جس میں روز روز کا حساب کتاب یا حال احوال لکھا جائے۔ روزانہ رپورٹ۔ روزانہ اطلاع۔ وہ کتابچہ جس میں روزانہ کے تاریخ وار حالات یا حسابات لکھے جائیں۔ انگریزی میں اسے Day-book, Diary, Juornal, Daily account book کہا جاتا ہے۔

ادب کی اصطلاح میں روزنامچہ سے مراد ایسی کتاب ہوتی ہے جس میں ایک مصنف روزانہ وقوع پذیر ہونے والے واقعات اور حالات کو تاریخ وار قلمبند کرتا ہے۔ روزنامچے میں تاریخی ترتیب ہی نہیں بلکہ وقت کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے۔ یعنی جس دن جو واقعات جس ترتیب سے وقوع پذیر ہوتے ہیں اسی ترتیب سے تحریر کیے جاتے ہیں۔ روزنامچہ ایک ایسی غیر افسانوی ادبی صنف ہے جو آپ بیتی سے قربت رکھتی ہے۔ کچھ ماہرین اسے آپ بیتی کی ذیلی چیز سمجھتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ روزنامچہ کی سرحدیں آپ بیتی سے بڑی حد تک ملتی ہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو روزنامچہ اور آپ بیتی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ آپ بیتی کا مرکز محور خود مصنف کی ذات ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف روزنامچے میں دوسرے افراد بھی مرکزی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ سادے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ روزنامچہ ایسی کتاب ہوتی ہے جس میں آپ بیتی کے ساتھ جگ بیتی کا بیان بھی ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ بیتی میں تاریخی تسلسل کا ہونا ضروری نہیں۔ مصنف اس بات میں آزاد ہوتا ہے کہ وہ حال کے واقعات بیان کرتے ہوئے ماضی میں چلا جائے۔

روزنامچہ نگاری کو یاداشت نگاری بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن روزنامچہ نگاری کو یادداشت نگاری سے وسیع اور بسیط چیز سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ اس میں تسلسل ہوتا ہے اور جزئیات نگاری کی بھی گنجائش ہوتی ہے۔

اردو میں روزنامچہ نگاری کی صنف زیادہ پھلی پھولی نہیں۔ معدودے چند اہلِ قلم نے اس کی طرف توجہ دی ہے۔ اس صنف کے ایک اہم قلم کار خواجہ حسن نظامی ہیں۔ جنھوں نے روزنامچہ نگاری کو مستقل طور پر اپنایا۔ 'فرہنگ ادبیاتِ اردو' کے مولف ع۔ ج۔ واجد کے مطابق:

> اب تک دریافت روزنامچوں میں سب سے زیادہ بسیط روزنامچہ سید مظہر علی سندیلوی کا ہے۔ یہ سنہ 1867 سے 1911 تک کا احاطہ کرتا ہے اور 7799 بڑی تقطیع کے قلمی صفحات پر مشتمل ہے۔[4]

دیباچہ:

'دیباچہ' کے لغوی معنی ہیں: کسی چیز کا پہلا اور لازمی جزو۔ کسی چیز کے لیے پہلی شرط۔ کسی چیز کا ابتدائی حصہ۔ ابتدائی دور۔ پہلا زینہ۔ تمہیدِ کتاب، سرنامۂ کتاب یا خطبۂ کتاب کو بھی دیباچہ کہتے ہیں۔ اس کے لیے آغازِ کلام، پیش گفتار، پیش لفظ، پیش نامہ جیسے الفاظ بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ انگریزی میں اسے Preface, Preamble, Foreword کہا جاتا ہے۔

کسی کتاب کی ابتدا میں کتاب اور صاحبِ کتاب کے تعارف پر مشتمل جو مضمون ہوتا ہے اسے ادب کی اصطلاح میں دیباچہ کہتے ہیں۔ یہ ایسا مضمون ہوتا ہے جس میں کتاب کے مشمولات، کتاب تحریر کرنے کی غرض وغایت، کتاب کے موضوع اور اس کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ مصنف یا تو اپنی کتاب کا دیباچہ خود لکھتا ہے یا کسی مشہور اہلِ قلم سے لکھواتا ہے۔ عام طور پر مصنّفین کسی مشہور ومعروف اہلِ قلم سے اپنی کتابوں کے دیباچے لکھوانا پسند کرتے ہیں۔ دیباچوں میں کتاب اور صاحبِ کتاب کے تعارف کے ساتھ ساتھ کتاب پر تنقید وتبصرے کی بھی گنجائش ہوتی ہے۔ ایسے دیباچے کتاب کے مشمولات کی اہمیت وافادیت اور اس میں موجود خوبیوں اور خامیوں کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں جن میں کتاب کے تعارف کے باوصف تنقید وتبصرے سے بھی کام لیا گیا ہے۔

دیباچے کی افادیت یہ ہے کہ اس کے مطالعے سے کتاب کے موضوع، مشمولات، اس کے حسن وقبح، موجودہ تناظر میں کتاب کی اہمیت وافادیت کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔ دیباچہ پڑھنے کے بعد قاری کا ذہن پوری کتاب پڑھنے کی طرف مائل ہوتا ہے۔

مقدمہ:

مقدمہ بھی ایک طرح کا دیباچہ ہے۔ یہ بھی کتاب کے شروع میں شامل ہوتا ہے۔ دیباچے اور مقدمے میں فرق یہ ہے کہ دیباچہ سرسری اور ہلکا پھلکا ہوتا ہے۔ جب کہ مقدمہ طویل، عالمانہ اور مدلل ہوتا ہے۔ علمی اعتبار سے

مقدمہ دیباچے سے اعلیٰ درجے کی چیز ہوتی ہے۔عموماً تحقیقی اور تدوینی کتابوں پر مقدمات لکھے جاتے ہیں۔ مدون اور محقق اپنی کتاب پر خود مقدمہ لکھتا ہے۔کبھی کبھی اپنے سے بڑے نہایت معتبر اور اس موضوع کے ماہر سے بھی لکھوایا جاتا ہے۔

تدوین متن سے متعلق کتاب ہے تو مقدمے میں تدوینِ متن کے مقصد، اہمیت وافادیت اور دورِ حاضر میں اس کی ضرورت پر تفصیلی روشنی ڈالی جاتی ہے۔ساتھ ہی متن اور اس کے مصنف کے بارے میں تقریباً تمام ضروری معلومات پیش کی جاتی ہیں۔مقدمے میں متن کا مفصل تنقیدی جائزہ بھی لیا جاتا ہے۔مقدمہ نگاری بھی ایک فن ہے۔ اچھے مقدمے وہ سمجھے جاتے ہیں جو غیر ضروری تفصیلات سے پاک ہوں اور جن میں اختصار کے باوصف جامعیت بھی پائی جائے۔مقدمے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔مقدمے سے کتاب کی تصنیف وتالیف یا تدوین وترتیب کا مقصد سمجھ میں آتا ہے۔مقدمہ، کتاب اور صاحبِ کتاب، متن اور صاحبِ متن کی تفہیم میں بھی سودمند ثابت ہوتا ہے۔

تقریظ:

کے لغوی معنی ہیں: کسی زندہ شخص کی تعریف وتوصیف بیان کرنا۔فرہنگِ آصفیہ، لغاتِ کشوری اور لغاتِ فارسی (مولفہ: لالہ رام نرائن لال) میں اس کا املا 'تقریض'' بھی دیا گیا ہے۔ممکن ہے پہلے اس املے کا بھی چلن رہا ہو لیکن اب یہ املا رائج نہیں۔ بقولِ عبادت بریلوی ایامِ جاہلیت میں یہ لفظ عرب میں ایک عرصے تک تنقید کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔5

ادب کی اصطلاح میں تقریظ اس مضمون کو کہتے ہیں جو کسی کتاب کی تعریف وتوصیف میں کسی دوسرے شخص نے لکھا ہو۔تقریظ عام طور پر کتاب کے آخر میں شامل کی جاتی ہے۔پہلے تقاریظ لکھنے کا عام رواج تھا۔اس دور کی تقریباً ہر کتاب کے آخر میں تقریظ نظر آتی ہے۔ آج تقریظ نگاری کی صنف تقریباً متروک ہوچکی ہے۔دراصل تقریظ ایک ایسی عبارت ہوتی تھی جس میں کتاب اور صاحبِ کتاب کی تعریف وتوصیف مبالغہ آرائی کے ساتھ بیان کی جاتی تھی۔تقریظ نگار کتاب میں موجود خامیوں کو نظرانداز کرتے ہوئے صرف اور صرف کتاب اور صاحبِ کتاب کی خوبیاں بیان کرتا تھا۔تقریظ کو تنقید کی ایک قسم کہا جاسکتا ہے لیکن ناقص اور نامکمل۔اسی لیے اس کی تنقیدی اہمیت بہت کم ہے۔اتنا ضرور ہے کہ اردو میں تنقید کی روایت کو سمجھنے کے لیے اردو میں لکھی گئی تقاریظ کا مطالعہ سودمند ثابت ہوسکتا ہے۔بہرحال اردو کی غیر افسانوی نثری اصناف میں تقریظ بھی شامل ہے۔آج کل مدارس اسلامیہ سے فارغ' مذہبی موضوعات پر لکھنے والے اہلِ قلم حضرات کی کسی کسی کتاب میں تقریظ کے عنوان سے ایسی عبارت نظر آتی ہے۔

تنقید:

غیر افسانوی اصنافِ ادب میں تنقید بھی ایک اہم صنف ہے۔لفظ 'تنقید' عربی لفظ 'نقد' سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں: 'جانچنا اور پرکھنا'۔تنقید کا مفہوم ہے: جانچنے اور پرکھنے کا عمل۔اصطلاح میں کسی چیز کی خوبیوں اور خامیوں کا صحیح اندازہ لگا کر اس پر کوئی رائے قائم کرنا تنقید کہلاتا ہے۔تنقید کو انتقاد بھی کہتے ہیں لیکن یہ لفظ اردو میں مستعمل نہیں۔انگریزی میں تنقید کے لیے Criticism کا لفظ استعمال ہوتا ہے جس کے حقیقی معنی عدل وانصاف یا فیصلہ کرنے کے ہیں۔گویا تنقید ایسی تحریر ہوتی ہے جس میں کسی چیز کے تمام پہلوؤں کا باریک بینی اور غیر جانبداری کے ساتھ جائزہ لے کر اس کے بارے میں نپی تلی اور حقیقت پر مبنی رائے دی جائے۔

وہ تنقید جو ادب کو جانچنے اور پرکھنے کا کام کرتی ہے اسے ادبی تنقید کہتے ہیں۔اس فن کا ماہر نقاد کہلاتا ہے۔نقاد کسی ادبی فن پارے کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرکے نہ صرف اس کی خوبیوں اور خامیوں کا پتا لگاتا ہے بلکہ اس فن پارے کی قدر وقیمت کا تعین بھی کرتا ہے۔تنقید میں تجزیہ اور تشریح بھی ہوتی ہے اور وضاحت اور صراحت بھی۔تنقید ادب کی تفہیم اور اس کے فروغ میں اہم رول ادا کرتی ہے۔تنقید قاری اور ادب کے درمیان رابطے کا کام بھی کرتی ہے۔ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ہڈسن کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

جب ہم تنقیدی ادب کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ عدل، انصاف، رائے دینا یا کسی قسم کا حکم لگانا ہی تنقید نہیں ہے بلکہ وہ تمام ادب تنقید کے تحت شمار کیا جا سکتا ہے جو ادب کی دوسری اصناف کے متعلق لکھا گیا ہو۔چاہے وہ ان اصنافِ ادب کی تشریح کرے، تجزیہ کرے یا ان کی قدر وقیمت کا پتہ لگائے یا اس کی تحریر میں بیک وقت یہ تمام خصوصیات نمایاں ہوں۔تنقید ادب کی تمام اصناف یعنی شاعری، افسانہ نگاری، ڈرامہ نویسی اور خود تنقید نگاری سے سروکار رکھتی ہے۔اگر ادب کی ان اصناف کو زندگی کا ترجمان کہا جائے تو ان اصناف نے زندگی کی جو ترجمانی کی ہے اس کی ترجمان تنقید ہے۔6

اچھی تنقید نہ صرف ادب کی تفہیم اور اس کے ارتقا میں اہم کردار ادا کرتی ہے بلکہ بقول آل احمد سرور ایسی تنقید اچھی تخلیق سے کم نہیں۔وہ لکھتے ہیں:

اچھی تنقید محض معلومات ہی فراہم نہیں کرتی بلکہ وہ سب کام کرتی ہے جو ایک مورّخ، ماہرِ نفسیات، ایک شاعر اور ایک پیغمبر کرتا ہے۔تنقید ذہن میں روشنی کرتی ہے اور یہ روشنی اتنی ضروری ہے کہ بعض اوقات اس کی عدم موجودگی میں تخلیقی جوہر میں کسی شے کی کمی محسوس ہوتی ہے۔7

مختصر یہ کہ تنقید غیر افسانوی ادب کی ایک اہم صنف ہے جس کی ضرورت، اہمیت اور افادیت مسلّمہ ہے۔ اردو تنقید کے ارتقا اور فروغ میں محمد حسین آزاد، حالی، شبلی، مولوی عبدالحق، عبدالرحمان بجنوری، نیاز فتح پوری، ڈاکٹر زور، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر سید عبداللہ، کلیم الدین احمد، احتشام حسین، عبادت بریلوی، آل احمد سرور، وقار عظیم، محمد حسن عسکری، خورشید الاسلام، محمد حسن، ریاض احمد، محمد احسن فاروقی، سید شبیہ الحسن، ڈاکٹر عبدالعلیم، اسلوب احمد انصاری، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمان فاروقی، سلیم احمد، وارث علوی، شمیم حنفی، عبدالمغنی، وہاب اشرفی، مغنی تبسم، انور سدید، سید محمد عقیل، قمر رئیس، فضیل جعفری، باقر مہدی، ابوالکلام قاسمی (فہرست نامکمل ہے) جیسے کئی نقادوں نے اردو تنقید کو وقار واعتبار عطا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

تبصرہ:

'تبصرہ' کے لفظی معنی ہیں: کسی کو کوئی چیز دکھانا۔اس کے مجازی معنی ہیں کسی بات کے متعلق اظہارِ رائے، بصیرت کا اظہار، کسی امر یا واقعے کے بیان میں خوبیوں اور خامیوں کا ذکر، کسی چیز کے معائب اور محاسن پر روشنی ڈالنا۔ادب کی اصطلاح میں تبصرہ اس مضمون کو کہتے ہیں جس میں کسی کتاب یا رسالے کو پڑھ کر اس کی خوبیوں اور خامیوں پر اظہارِ خیال کیا گیا ہو۔تبصرہ تنقید ہی کی ایک شاخ ہے۔تبصرے میں زیرِ نظر کتاب کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرکے اس کے

وہ تنقید جو ادب کو جانچنے اور پرکھنے کا کام کرتی ہے اسے ادبی تنقید کہتے ہیں۔اس فن کا ماہر نقاد کہلاتا ہے۔ نقاد کسی ادبی فن پارے کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کر کے نہ صرف اس کی خوبیوں اور خامیوں کا پتا لگاتا ہے بلکہ اس فن پارے کی قدر وقیمت کا تعین بھی کرتا ہے۔تنقید میں تجزیہ اور تشریح بھی ہوتی ہے اور وضاحت اور صراحت بھی۔تنقید ادب کی تفہیم اور اس کے فروغ میں اہم رول ادا کرتی ہے۔

مضامین، موضوع اور اسلوبِ نگارش کا غیر جانبداری کے ساتھ جائزہ لیا جاتا ہے۔ تبصرہ نگاری کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے قارئین کو کتاب کے مشمولات ومضامین سے واقف کروایا جائے۔ یہی نہیں بلکہ کتاب کی اہمیت وافادیت کو اجاگر کرتے ہوئے کتاب پڑھنے کی ترغیب دینا بھی اس کا مقصد ہوتا ہے۔ اچھا تبصرہ وہ ہوتا ہے جس میں کتاب کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کی خامیوں پر بھی گفتگو کی جائے۔ پروفیسر کلیم الدین لکھتے ہیں:

تبصرے کا مقصد ہے کسی کتاب کے جوہر کا پتہ لگانا اور اسے جمال یا تفصیل کے ساتھ پیش کرنا اور جو کچھ کہا جائے اس سے کتاب کی اہم ترین خصوصیتیں (خوبیاں اور برائیاں دونوں) واضح ہوجائیں۔[8]

تبصرہ مختصر، جامع اور پُر مغز ہونا چاہیے۔ اچھے تبصرے زیرِ تبصرہ کتاب کی شہرت اور فروخت کا بھی اہم ذریعہ ہوتے ہیں۔

تحقیق:

تحقیق عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں: تلاش وجستجو، چھان بین، کھوج، دریافت وغیرہ۔ پروفیسر کلبِ عابد کے مطابق:

تحقیق عربی زبان کا لفظ ہے۔ یہ بابِ تفعیل سے مصدر ہے۔ اس کے اصلی حروف ح ق ق ہیں۔ اس کا مطلب ہے حق کو ثابت کرنا یا حق کی طرف پھیرنا۔[9]

ڈاکٹر عبدالرزاق قریشی نے تحقیق کی مختلف تعریفات کی روشنی میں تحقیق کا مقصد یوں بیان کیا ہے:

... تحقیق کا مقصد (1) نا معلوم حقائق کی تلاش اور (2) معلوم حقائق کی توسیع یا ان کی خامیوں کی تصحیح ہے۔ ان دونوں کا نتیجہ حدودِ علم کی توسیع ہے اور حدودِ علم کی توسیع انسانی ترقی کا باعث ہوتی ہے۔[10]

واقعہ یہ ہے کہ تحقیق کے وسیلے ہی سے ہم کسی شے کی حقیقت اور ماہیت کو سمجھ سکتے ہیں۔ حقائق کا ادراک تحقیق ہی کے ذریعے ہوتا ہے۔ تحقیق کی بدولت ہی ہم پر اس عالمِ رنگ وبو کے اسرار منکشف ہوتے ہیں۔ تمام قسم کے علوم وفنون کی توسیع کے لیے تحقیق بے حد ضروری ہے۔ ادب سے تعلق رکھنے والی تحقیق کو ادبی تحقیق کہا جاتا ہے۔ تحقیق بھی غیر افسانوی ادب کی ایک اہم شاخ ہے۔

شبلی نعمانی، عبد الحق محمود شیرانی، قاضی عبد الودود، امتیاز علی خان عرشی، مالک رام، نور الحسن ہاشمی، مسعود حسین خان، محی الدین قادری زور، نذیر احمد، مختار الدین احمد، مشفق خواجہ، خلیق انجم، جمیل جالبی، رشید حسن خان، خواجہ احمد فاروقی، تنویر احمد علوی، عبد الرزاق قریشی، گیان چند جین، کالی داس گپتا رضا، سیدہ جعفر، محمد علی اثر، اسلم مرزا، شمیم طارق، (فہرست نامکمل ہے) جیسے بیسیوں محققین نے اردو میں تحقیق کی بنیادیں استوار کرنے کا فریضہ انجام دیا ہے۔

تذکرہ:

تذکرہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی: ذکر، یادداشت، بیان، یادگار، سرگزشت، سوانح عمری کے ہیں۔ اصطلاحی معنوں میں تذکرہ ایسی کتاب کو کہا جاتا ہے جس میں کسی خاص علم وفن کے مشاہیر کے حالاتِ زندگی جمع کیے گئے ہوں۔ مثلاً: علما کے تذکرے، محدثین کے تذکرے، صوفیہ کے تذکرے، مورخین کے تذکرے، شعرا کے تذکرے وغیرہ۔ ادب کی اصطلاح میں تذکرہ سے مراد ایسی کتاب ہوتی ہے جس میں شعرا کے حالاتِ زندگی اور ان کا نمونۂ کلام دیا جاتا ہے۔ اردو زبان میں بہت سارے تذکرے لکھے گئے ہیں۔ مثلاً: نکات الشعرا (میر تقی میر)، تذکرۂ شعرائے اردو (میر حسن)، تذکرۂ ہندی اور ریاض الفصحا (مصحفی)، مخزنِ نکات (قائم چاند پوری)، گلشن ہند (مرزا لطف علی)، چمنستانِ شعرا (لچھمی نرائن شفیق)، گلشنِ بے خار (مصطفیٰ خان شیفتہ)، آبِ حیات (محمد حسین آزاد)۔ یہ تذکرے اردو زبان وادب کی تاریخ بھی ہیں، اردو تنقید کے ابتدائی نمونے بھی ہیں، شعرائے اردو کے حالاتِ زندگی کی دستاویز بھی ہیں اور ان کی سیرت وکردار کے مرقعے بھی ہیں۔ اس طرح تذکرے کے حدود بہ یک وقت، سوانح، تنقید، تاریخ اور سیرت نگاری سے ملتے ہیں۔

غیر افسانوی ادب کی اہمیت وافادیت:

غیر افسانوی ادب کو ہم ترسیل وابلاغ کا بہترین ذریعہ کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ اس کے ذریعے خیالات واحساسات اور نظریات کی ترسیل بغیر کسی الجھاوے کے آسانی کے ساتھ ہوجاتی ہے۔ جبکہ افسانوی ادب میں یہ ممکن نہیں۔ کیونکہ افسانوی ادب کی تخلیق میں تخیل، رومانیت، استعارات، تشبیہات، علامات، رمز وکنایہ جیسے مختلف وسائل کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اگر چہ غیر افسانوی ادب میں بھی کہیں کہیں ان وسائل کا استعمال ہوتا ہے لیکن بہت کم اور سادے طریقے سے ہوتا ہے۔ افسانوی ادب میں ابہام ہوتا ہے جبکہ غیر افسانوی ادب میں وضاحت وصراحت ہوتی ہے۔ غیر افسانوی ادب میں دنیا کے حقائق، تجربات ومشاہدات اور مسائلِ حیات کو قصہ پن کے بغیر راست اور سلیس انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ افسانوی ادب چونکہ تخیل کا زائدہ ہوتا ہے اور اس میں

غیر افسانوی ادب میں دنیا کے حقائق، تجربات و مشاہدات اورمسائل حیات کو قصہ پن کے بغیر راست اور سلیس انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ افسانوی ادب چونکہ تخیل کا زائدہ ہوتا ہے اور اس میں قصہ، پلاٹ، مکالمے ہوتے ہیں۔قصہ کبھی کبھی پیچیدہ بھی ہوجاتا ہے۔ اس لیے افسانوی ادب کی تفہیم میں بسا اوقات دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔جب کہ غیر افسانوی ادب میں یہ مشکلات نہیں ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قسم کی علمی، سائنسی، تیکنیکی، سماجی، مذہبی، قانونی، تاریخی اور سیاسی تحریروں کے لیے غیر افسانوی نثر کا استعمال کیا جاتا ہے۔

قصہ، پلاٹ، مکالمے ہوتے ہیں۔ قصہ کبھی کبھی پیچیدہ بھی ہوجاتا ہے۔ اس لیے افسانوی ادب کی تفہیم میں بسا اوقات دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جب کہ غیر افسانوی ادب میں یہ مشکلات نہیں ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قسم کی علمی، سائنسی، تیکنیکی، سماجی، مذہبی، قانونی، تاریخی اور سیاسی تحریروں کے لیے غیر افسانوی نثر کا استعمال کیا جاتا ہے۔

حوالے:

(1) ڈاکٹر سیدہ جعفر، اردو میں مضمون کا ارتقا، نیشنل فائن پرنٹنگ پریس حیدرآباد، 1973، ص 12
(2) پروفیسر گیان چند، تحقیق کا فن (اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، 1990، ص 56
(3) ڈاکٹر طلعت گل، اردو رپورتاژ، کتابی دنیا دہلی، 2004، ص 5
(4) ج ع واجد فرہنگِ ادبیاتِ اردو، کتابی دنیا دہلی، 2011، ص 327
(5) ڈاکٹر عبادت بریلوی، اردو تنقید کا ارتقا، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، 1996، ص 132
(6) ایضاً ص 29
(7) آل احمد سرور، تنقید کیا ہے، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی 1980، ص 305
(8) کلیم الدین احمد، اردو تنقید پر ایک نظر (ادارہ فروغ اردو لکھنؤ، 1957، ص 305
(9) بحوالہ گیان چند، تحقیق کا فن (اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، 1990، ص 2
(10) عبدالرزاق قریشی، مبادیاتِ تحقیق، انجمنِ اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی، 2014، ص 17

■

Mohammad Azmatul Haq
Assistant Professor(CHB) Dept, of Urdu
Maharashtra Udayagiri College
Udgir-413517
Dist Latur (M.S) Mob:7020407042

مطبع مجتبائی دلی

عبداللہ عثمانی

بلاشبہ زبان وعلوم کی ترویج وترقی میں 'پریس' نے جو کردار ادا کیا ہے اس کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا یوں تو ہندوستان میں چھپائی کی ابتدا سولھویں صدی عیسوی میں ہوچکی تھی لیکن اس میں اردو کا کوئی اہتمام نہ تھا جو پریس قائم ہوئے وہ اکثر مسیحی اداروں کے تھے ان میں زیادہ تر بائبل کے ترجمے شامل تھے اردو فارسی زبان کی پرنٹنگ کا کام دراصل وارن ہسٹنگز کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔

1830 میں لیتھو طباعت کا پہلا مطبع کانپور میں مسٹر آرچر نے قائم کیا، کچھ دنوں بعد لکھنؤ کے بادشاہ نصیر الدین حیدر کے ایما پر ایک مطبع کا آغاز ہوا 1841 میں پہلی بار سائنس سے متعلق ایک کتاب شائع ہوئی جو لارڈ مبروہم کی انگریزی کتاب کا ترجمہ تھا لکھنؤ کے لیتھو پریس میں سب سے پہلے جو کتاب زیور طبع سے آراستہ ہوئی وہ 'شرح الفیہ' تھی اس کے بعد یہ سلسلہ آگے بڑھتا گیا نیز اردو فارسی اور عربی کتابیں چھپتی رہیں۔ 1848 میں صرف لکھنؤ میں ایک درجن پریس قائم ہوچکے تھے ان میں سلطان المطابع، مطبع سلطانی، مطبع میر حسن، مطبع مصطفائی اپنی وصفائی طباعت اور معیار کے لیے مشہور تھے بعدہ لکھنؤ اور کانپور کے حوالے سے مطبع منشی نول کشور نے خاص شہرت حاصل کی اسی طرح دلی میں بھی متعدد پریس کام کررہے تھے جن کے ذریعہ نادر ونایاب مخطوطات کے ترجمے تصحیح کے ساتھ منظر عام آرہے تھے۔ ان میں مطبع مصطفائی، اکمل المطابع، مطبع احمدی، افضل المطابع، اور مطبع مجتبائی قابل ذکر ہیں، واضح ہو کہ اس وقت جو پریس قائم ہوئے انھوں نے صرف کتابوں کی چھپائی کا ہی کام نہیں کیا بلکہ یہ مطابع تحقیق وتراجم اور تصحیح کتب کی شاندار خدمات انجام دیتے تھے۔ ان میں علما، فضلا اور مترجمین کی بڑی بڑی جماعتیں ملازم تھیں نیز کاتبوں اور عالموں کی بڑی تعداد یہاں روزگار پاتی تھی، دلی کے مطابع میں مطبع مجتبائی نے اپنے حسن طباعت تحقیق اور تنقیح کے حوالے سے جو شہرت حاصل کی اس کی نظیر بھی ہندوستان کے چنیدہ مطبعوں میں مل سکے گی۔ پہلے یہ مطبع میرٹھ میں زیر سرپرستی منشی ممتاز علی نے قائم کیا تھا منشی ممتاز علی کا ذوق علمی اور ان کی خطاطی برصغیر میں معروف ہے راقم الحروف کے کتب خانے میں اس مطبع کی میرٹھ سے چھپی ہوئی کئی کتابیں موجود ہیں جو اپنی حسین کتابت اور خوبصورتی کی اعلیٰ نظیر ہیں۔ منشی ممتاز علی ابن منشی امجد علی دہلوی میرٹھ، جو نزہت رقم کے تخلص سے معروف تھے یہ بہادر شاہ ظفر کے خطاطی میں شاگرد تھے، آپ نے میرٹھ میں 'مجتبائی' نام سے ایک مطبع قائم کیا تھا، اس مطبع نے قرآن کریم اور حمائل شریف کے جو نسخے شائع کیے وہ نہ صرف پرنٹنگ کے اعتبار سے اعلیٰ تھے بلکہ تصحیح، حواشی اور تراجم کے لحاظ سے بھی نہایت ممتاز ومقبول تھے، اس پریس کی مطبوعات کا معیار نہایت بلند تھا علمی، دینی کتابوں کے علاوہ مرزا غالب کی 'عود ہندی' بھی سب سے پہلے اسی پریس میں 1868 میں شائع ہوئی تھی۔ 1886 میں منشی ممتاز علی مکہ مکرمہ ہجرت کرگئے اور مطبع کی ایک مشین اپنے ساتھ مکہ مکرمہ لے گئے جہاں انھوں نے متعدد کتابوں کی اشاعت کی تھی مولانا امداد صابری کے مطابق حاجی امداد اللہ (م 1899) کی جہاد اکبر اور تحفۃ العشاق وغیرہ کتابیں یہاں چھپی ہیں۔ 1886 میں منشی ممتاز علی سے پانچ سو روپے میں مولوی عبدالاحد نے مجتبائی پریس کی مشینیں خرید کر یہ مطبع اسی نام سے دلی سے جاری کیا۔

مولوی عبدالاحد ابن حافظ غلام محمد (1850 تا 1920) نے غالباً اواخر انیسویں صدی میں دلی کے محلّہ چوڑی والان سے مطبع مجتبائی کا اجرا کیا محققین کے مطابق تین درجن علماء ومترجمین کی جماعت اس مطبع میں تحقیق اور تراجم کے کام پر معمور تھی، مولوی عبدالاحد کے حالات زندگی 'مولانا احسن نانوتوی' از ایوب قادری، طبع کراچی، واقعات دارالحکومت دہلی، از بشیر الدین احمدؒ یادگار دلی' از سید محمد ولی اللہی وغیرہ میں موجود ہیں چنانچہ مولانا سید محمد میاںؒ نے 'علمائے ہند کا شاندار ماضی' جلد چہارم کے حاشیہ میں اطلاع دی ہے کہ:

''آپ (مولانا احسن نانوتویؒ) 1846 / 1262ھ میں بنارس کالج میں فارسی کے مدرس اوّل مقرر ہوئے وہاں آپ نے ایک بیوہ خاتون مسماۃ زینب سے نکاح کرکے عقد بیوگان کی سنت زندہ کی اس بیوہ کے ساتھ ایک شیر خوار بچہ بھی آپ کی تولیت میں آیا جس نے جوان ہوکر دہلی میں مطبع مجتبائی قائم کیا جو بیسویں صدی کے آغاز میں سب سے زیادہ مشہور مطبع تھا جس نے بے شمار نادر تصنیفات پوری تصحیح اور خوبی کے ساتھ شائع کرکے علم کے قدردانوں سے خراج تحسین حاصل کیا''

(علمائے ہند کا شاندار ماضی: 4/305، حاشیہ مطبوعہ کتابستان دہلی 1985)

مولانا عبدالاحد کا دیوبند سے گہرا رشتہ رہا ہے آپ کی پہلی شادی دیوبند ہی میں مسماۃ سکینہ سے ہوئی تھی جن سے نو بچے پیدا ہوئے اور ایک بیٹی رابعہ کا نکاح بھی دیوبند میں ہوا تھا، نیز ایک بیٹی کی شادی شمس العلما سید احمد بخاریؒ امام جامع مسجد دہلی کے ساتھ ہوئی تھی۔

مولوی عبدالاحد مرحوم کے بارے میں واقعاتِ دارالحکومت دہلی میں بشیر الدین صاحب نے لکھا ہے:

''مولوی صاحب رضوی سید ہیں اور آپ کا سلسلہ نسب

حضرت امام علی رضا سے ملتا ہے خود بڑے نیک نفس منکسرالمزاج، ملنسار اور خلیق ہیں بریلی کالج سے 1869 میں کلکتہ یونیورسٹی کا انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ اسکول بدایوں میں ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ 1875 کو الہ آباد میں امتحان وکالت دے کر درجہ اوّل کی سند حاصل کی اور اسی سال انبالے کے رسالے ''پندرہ بنگال میں وکالت کرنے لگے آخر کار وکالت چھوڑ کر ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے پھر 1884 میں اس سلسلے کو منقطع کر کے ضلع میرٹھ میں وکالت کرنے لگے آخر کار وکالت چھوڑ کر دلی تشریف لائے اور مطبع کا کاروبار شروع کیا جس میں آپ کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی اپنی لیاقت اور وجاہت کے بل پر حکام میں بڑا رسوخ حاصل ہے اور بڑی عزت اور وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں دلی کے نہایت سربرآوردہ اشخاص میں آپ کا شمار ہے قومی کاموں میں بہت دلچسپی لیتے ہیں علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی ہیں آنریری مجسٹریٹ ہیں اسی سال ان کو خان بہادر کا خطاب ملا ہے دہلی میں ایسا کوئی قومی جلسہ یا اہم کام نہ ہوگا جس میں آپ سب سے آگے نہ ہوں''۔ (واقعات دارالحکومت دہلی جلد دوم، از بشیرالدین صفحہ 92-191، مطبع شمسی پریس آگرہ، 1919)

محمد ایوب قادری نے محمد یوسف دہلوی کے حوالے سے 'مولانا احسن نانوتویؒ' میں ایک جگہ لکھا ہے کہ مطبع نولکشور کے بعد اگر کسی مطبع نے لازوال شہرت پائی تو وہ واحد مطبع مجتبائی تھا، انھوں نے اپنے حسن انتظام سے اس مطبع کو ایسی خوبی سے چلایا کہ سیکڑوں، مدارس تاریخی اور بعض ادبی کتابوں کے درجنوں ایڈیشن لاکھوں نسخے چھاپ ڈالے ان دونوں بزرگوں کی تنہا ایک خدمت ہی ایسا عظیم کارنامہ ہے کہ صدیوں ان کا نام زندہ اور باقی رہے گا یہ اپنے بزرگوں کا صدقہ جاریہ ہے کہ آج ہمارے کتب خانے مختلف علوم وفنون کی نایاب کتابوں سے معمور نظر آتے ہیں''۔

مطبع مجتبائی میں نہایت مستند علما تصحیح وتالیف اور حواشی کا کام انجام دیتے تھے ان میں مولانا محمد احسن نانوتوی، مولانا منیر نانوتویؒ، مولانا فضل الرحمٰن، مولانا نظام الدین کیرانوی، مولانا جمیل الرحمٰن، مولانا محمد اسحاق اور مولوی محمد بیگ کے نام قابل ذکر ہیں۔

بہر کیف انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے نصف تک مطبع مجتبائی نے دینی، علمی کتابوں کی اشاعت میں جو اعتبار اور معیار حاصل کیا تھا وہ کم ناشران کو حاصل ہوا، قرآن پاک اور احادیث کی ضخیم کتابوں کی تصحیح، تنقیح اور حواشی وغیرہ کا جو نظم مولوی عبدالاحد کے یہاں تھا وہ اس ادارے کا امتیاز ہے، صحاح ستہ میں بخاری شریف، ترمذی شریف، ابوداؤد شریف، مسلم شریف، ابن ماجہ شریف، نسائی شریف مؤطین اور طحاوی جیسی بڑی کتابوں کی تصحیح اور نئی کتابت کے ساتھ حواشی وغیرہ کا اہتمام نہایت جانفشانی سے یہاں ہوا ہے، ان کتابوں کے علاوہ درس نظامی کی ہر چھوٹی بڑی کتاب مطبع مجتبائی سے چھپی تھی، ان کتابوں کے موجودہ پبلی شرز، بلاشبہ مولوی عبدالاحد اور ان کے مطبع کے رہین منت ہیں، آج دنیا بھر میں ان ہی کتابوں کے عکس چھپ رہے ہیں۔ دینیات اور درسیات کے علاوہ مذکورہ مطبع سے دیگر علوم وفنون کی کتابوں کی اشاعت بھی ہوئی ہے، بالخصوص فن طب میں اچھا ذخیرہ شائع ہوا تھا ان میں درج ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں۔ التحفۃ الحامدیہ فی لصناعۃ الکلیۃ زبان عربی، از حکیم محمد اجمل خان دہلوی یہ کتاب کشتہ جات پر مشتمل ہے، حمیات قانون، محشی از شیخ بوعلی سینا، حدودالامراض، قانونچہ عربی محشی، موجز عربی محشی، قرابادین مظہری، موجز عظیم النفع ترجمہ تدارک الخطا فارسی، مجموعہ یاقوتی چار رسائل، اکسیر الصبان چار حصے، انیس الکحال، حکیم محمد اختر گورگانی الطاعون، از حکیم محمد اجمل خاں دہلوی، علاج الحمیات، شہزادہ مرزا احمد اختر، قرابادین ویدک، مرزا احمد اختر بحر الجواہر، تکملۃ الہندی، از شاہ اہل اللہ قرابادین قادری، از حکیم اکبر ارزانی تحفۃ محمد شاہی مترجم حکیم مرزا احمد اختر اکسیری کشتہ جات، از ڈاکٹر غلام نبی، علاج الامراض فارسی، از حکیم شریف خان دہلوی۔

درج بالا کتابوں کے علاوہ سیکڑوں علمی دینی کتابیں مطبع مجتبائی سے شائع ہو کر اپنی صحت اور حسن طباعت کی سند حاصل کر چکی ہیں۔

مطبع مجتبائی کے مالک مولوی عبدالاحد ایک ممتاز صاحب خیر ہستی تھے انھوں نے دینی مدارس کی دل کھول کر مالی اور کتابوں سے مدد کی، چناں چہ دارالعلوم اور اس کے سرپرست حضرت نانوتویؒ سے انھیں خاص انسیت تھی چوں کہ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ میرٹھ میں منشی ممتاز علی کے مطبع مجتبائی میں قریب آٹھ برس تصحیح وغیرہ کی خدمات انجام دے چکے تھے۔ ایسے بھی یہ مولانا احسن نانوتویؒ (م 1895) کے بیٹے کی حیثیت سے دارالعلوم اور اس کے اکابرین سے خاص عقیدہ رکھتے تھے، لہٰذا اکابرین دارالعلوم کی اکثر کتابیں مثلاً حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، ڈپٹی ذوالفقار علی، مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، حاجی امداد اللہ، مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت تھانوی وغیرہ نہایت اہتمام سے شائع کی تھیں علاوہ ازیں دارالعلوم دیوبند کی روئدادیں بھی سالہا سال تک اسی مطبع میں نہایت اہتمام سے چھپتی تھیں۔ احقر کی لائبریری میں مطبع مجتبائی کی طبع شدہ قریب تین درجن کتابیں موجود ہیں ان میں بعض کتابیں انتہائی نایاب ہیں سردست چند کتابوں کا تعارف پیش ہے۔

مجموعۂ حالات عزیزی، کرامات عزیزی، مجربات عزیزی، اعمالِ خاندانِ عزیزی، ارشادات عزیزی، مرتب مولوی عبدالاحد صاحب مرحوم سائز 20x26، صفحات 56، الہدیۃ السنیۃ فی ذکر المدرسۃ الاسلامیہ الدیوبندیہ، از ڈپٹی ذوالفقار علی سائز بڑا زبان عربی خط نستعلیق صفحات 12، اشاعت 1307ھ، تذکرۃ البلاغہ از ڈپٹی ذوالفقار علی، قصائد قاسمی، از حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سائز 20x26، صفحات 24، ضخامت 80، صفحات سنہ اشاعت 1912، قرابادین قادری فارسی از حکیم سید محمد اکبر ارزانی، سائز کلاں صفحات 468 سنہ اشاعت 1286 طبع میرٹھ، علاج الامراض فارسی از حکیم شریف خان دہلویؒ سائز کلاں صفحات 433 صفحات سنہ اشاعت 1903 اکسیری کشتہ جات از ڈاکٹر غلام نبی لاہور سائز 18x22، 148، صفحات سنہ اشاعت 1348ھ، اردو زبان کی تاریخ از واعظ لال سائز 20x30، 106 صفحات سنہ اشاعت 1920 مفرداتِ ویدک 3 حصے از مرزا احمد اختر گورگانی سائز بڑا سنہ اشاعت 1910 صفحات 1206، انتباہ المومنین از مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، سائز 20x26، اردوئے معلیٰ (مجموعہ مخطوط غالب) حصہ اول صفحات 327، دوم 56 صفحات سائز 20x26 طبع اوّل 1899۔

چنانچہ مطبع مجتبائی نے برصغیر میں ہی نہیں بلکہ عرب ممالک تک میں اپنی شاندار مطبوعات کی دھوم مچادی تھی آج بھی جن کتب خانوں میں مجتبائی دہلی کی کتابیں موجود ہیں وہ قابل دید ہیں، بلاشبہ مطبع مجتبائی نہ صرف ایک پریس کی حیثیت رکھتا تھا بلکہ یہ تحقیقی مرکز بھی تھا مولوی عبدالاحد نے جس ذوق علمی اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا وہ ہندوستانی پریس کی تاریخ میں سدا یادگار رہے گا بقول صاحب واقعات دارالحکومت دہلی مولوی صاحب (مولوی عبدالاحد) نے اپنی ذات قابلیت اور محنت اور صرفہ سے اس کو (مطبع کو) ایسی ترقی دی کہ اتنا بڑا اور کوئی مطبع اب دلی میں نہیں ہے۔''

2 دسمبر 1920 میں مولوی عبدالاحد کا انتقال ہو گیا ان کے بعد ان کے بیٹے عبدالعلیم اور عبدالمتین وغیرہ نے مطبع کا کام جاری رکھا تقسیم ملک کے سبب مولوی عبدالاحد کے بیٹے پاکستان چلے گئے اور لاہور میں اسی نام سے مطبع کا اجراء کیا جو غالباً اب بھی مطبع مجتبائی کے نام سے کام کر رہا ہے، پاکستان جاتے وقت وارثان نے مطبع مجتبائی کی کروڑوں روپے کی مالیت کی کتابیں ردی میں فروخت کر دیں تھیں۔

■

Abdullah Usmani
4/16. Gaddi wara
P.o. Deoband- 247554 (UP)
Call:-09837680287
Email- AbdullahUsmani786@gmail.com

محمد بشیر مالیر کوٹلوی

شمع کی لو: یونس دہلوی

ایک غریب گھر کا بارہ سالہ لڑکا، اپنی مٹھی میں پانچ پیسے کے 15 سکے دبائے، مالیر کوٹلہ پوسٹ آفس کے سامنے پیارے لال اخبار والے کی دوکان پر ہر ماہ کی پندرہ تاریخ کو بھاگتا ہوا چلا جاتا، سر پر مختصر بال لیے ہوئے بوڑھا اخبار فروش اُس کو دیکھتے ہی کہہ اٹھتا لو آ گیا— شمع کا چھوٹا پروانہ۔ پیارے لال پیسے گن کر 75 پیسے کی قیمت کا رسالہ 'شمع' نئی دہلی اس کے ہاتھ میں تھما دیتا۔ واضح کردوں، کہ یہ کوئی فکشن نہیں، بلکہ حقیقت ہے۔ وہ چھوٹا پروانہ راقم الحروف یعنی میں ہی تھا۔ جی ہاں! اسکول جاتے ہوئے جیب خرچ کے لیے گھر والے روزانہ پندرہ پیسے دیتے تھے۔ اُن میں سے، میں پانچ پیسے کا سکہ الگ جمع کر لیتا تھا۔ شمع بڑی پابندی کے ساتھ پندرہ تاریخ کو مالیر کوٹلہ آ جاتا تھا۔ رسالے لے کر میں گھر کی چھت پر جا بیٹھتا اور مزے لے لے کر مطالعہ کرتا۔ شمع میں دلچسپیاں ہی اتنی تھیں کہ میں بچپن سے ہی اس رسالے کا عاشق بنا۔ فلم اسٹاروں کی خوبصورت تصاویر، ادریس دہلوی کی مسافر کے طور پر فلم اسٹارز سے ملاقاتیں کرنا، ان کے شب و روز کو قلم بند کرنا، ادریس صاحب کی منظر نگاری اس قدر بہترین ہوتی، پڑھ کر محسوس ہوتا، جیسے ان کے الفاظ نہیں کیمرے کی آنکھ ہے۔ سدھیر کے فلمی گانوں پر کارٹون کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس کے علاوہ آنے والی فلموں کی باتصویر کہانیاں پڑھ کر لگتا آدھی فلم دیکھ لی۔ شمع میں شائع ہونے والے، افسانوں، غزلوں اور نظموں کا معیار بھی قابل ذکر ہے۔ واجدہ تبسم کے چٹ پٹے افسانے اور عبدالحمید عدم کی بے باک شاعری خاص کشش رکھتی تھی۔ شمع میں شائع ہونے والی تخلیقات کو پڑھ کر میرا ادبی شعور جاگا۔ خاص طور پر افسانوں کا مطالعہ کرنے سے غیر معیاری افسانے تو شمع کی دہلیز کو بھی چھو نہ پاتے تھے۔

ان دنوں مالیر کوٹلہ میں صرف شاعری کے اکھاڑے ہوا کرتے تھے۔ افسانہ نگار کوئی نہ تھا۔ آنجہانی پریم وار برٹنی کبھی کبھی، پی کے اگروال کے نام سے بطور افسانہ نگار شائع ہو جاتے تھے۔ وہ بہترین شاعر تو تھے ہی افسانے کے رموز سے بھی واقف تھے۔ ان دنوں ہمارے شہر کے قابل احترام شاعر ڈاکٹر نریش صاحب نے ابھی افسانے لکھنا شروع نہیں کیے تھے۔ بات ماہنامہ 'شمع' کی ہو رہی تھی۔ 'شمع' میں شائع ہونے والے افسانوں کے کرداروں کے اسکیچ، کرداروں کو سامنے کھڑا کر دیتے تھے۔ یہ مرحوم یونس دہلوی صاحب کا کمال فن تھا کہ وہ قارئین شمع کے لیے افسانے خوبصورت ڈھنگ سے پروستے تھے۔ پہلے سدھیر در کے اسکیچز آیا کرتے تھے پھر نسیم کی مصوری نے شمع کے افسانوں، غزلوں اور نظموں کو سجایا۔ غیاث احمد امروز کو بھی شمع میں مصوری کے مواقع ملے بلاعنوان یونس صاحب کی شمع کو دین تھی جو قارئین میں بے حد مقبول ہوتی۔ بلاعنوان افسانوں کی اشاعت کا مزہ ہی اور تھا۔ پہلے شمارے میں افسانہ شائع ہوتا۔ دوسرے شمارے میں قارئین کے ارسال کردہ عنوانات اور انعامات کا تذکرہ تو ہوتا ہی، اس سے پہلے افسانے کا خاکہ بھی یونس صاحب دیتے تھے۔ نویں دہاکے شمع میں فلمی اور ادبی رنگ کے ساتھ ساتھ مذہبی رنگ بھی دے دیا گیا۔ آج کے مسائل کے عنوان سے عادل صلاحی صاحب دین کی روشنی میں شرعی سوالات کا جواب دیتے تھے۔ بزم شمع میں دل چسپ سوالات کے جوابات ہوا کرتے تھے۔ جشن سال گرہ میں فلمسازوں کا یوم پیدائش بھی مکمل پتہ ہوتا تھا۔ بازگشت میں قارئین کے خطوط شائع ہوا کرتے تھے۔ 'شمع' کی خاص کشش شمع کے ادبی معمے ہوا کرتے تھے۔ ایک پرائیویٹ ادارے کا دنیا بھر میں جال کا پھیلانا بہت بڑی بات تھی۔ صحیح حل پر موٹی رقوم کے انعامات، جس میں سونا بھی شامل ہوتا، معموں کے حل کے لیے لوگ لائبریری کھنگالتے تھے میرے کچھ کلیگ رات رات بھر معموں کے حل کے لیے کتابیں پڑھتے تھے۔

چھوٹی کلاسوں میں، میں نے ماہنامہ 'کھلونا' سے مطالعہ شروع کیا۔ نیلی دنیا، خوفناک جزیرہ پڑھ کر ہمارے اندر مطالعے کی دلچسپی پیدا ہوئی، شمع کے افسانے پڑھ کر ہمیں دیوانگی کی حد تک افسانوں سے لگاؤ ہو گیا۔ تخلیق کے لیے قلم تو ہم نے بہت پہلے سنبھال لیا تھا۔ 1974 سے میں باقاعدہ چھپنے لگا۔ میرا سب سے بڑا خواب تھا، اپنے محبوب جریدے میں شائع ہونا۔ آٹھویں دہاکے میں میں نے شمع کو اپنے کچے پکے افسانے بھیجنا شروع کر دیے۔ ہمیں چھپا چھپایا کارڈ مل جاتا، لفظ 'ناقابل اشاعت' ہمارا مونہہ چڑاتا رہتا۔ اُن دنوں دہشت گردی نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ اسی موضوع پر افسانہ ضرورت ہوا تو میں نے شمع کو برائے اشاعت بھیج دیا۔ فروری 1984 کے شمارے میں افسانہ چھپا، وہ دن میری زندگی کا سب سے بڑا دن تھا۔ مارے خوشی کے میرے پاؤں زمین پہ نہیں لگ رہے تھے۔ دراصل ملازمت کے سلسلے میں میرا تبادلہ محکمہ نے فرید آباد کر دیا۔ دہلی کی قربت اور فرید آباد کے ادبی ماحول نے ہمارے ادبی شعور کو نکھارا اور ہم شمع کے ساتھ ساتھ شاعر بمبئی آجکل دہلی اور بیسویں صدی جیسے موقر جرائد میں بھی چھپنے لگے۔ ایک دن ہم ایک تازہ افسانہ لے کر ڈرتے ڈرتے شمع کے دفتر کی سیڑھیاں چڑھ گئے، اور یونس دہلوی صاحب کے دفتر کے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ چپراسی نے اندر اطلاع دی تو تھوڑی دیر بعد مجھے بلا لیا گیا۔ بڑا سا ٹیبل۔ ٹیبل پر کاغذات کا انبار، انبار کے پیچھے، چشمہ پہنے، مسکراتی ہوئیں، ذہانت سے بھری ہوئی دو آنکھیں، سلام بجا کر میں نے اپنا

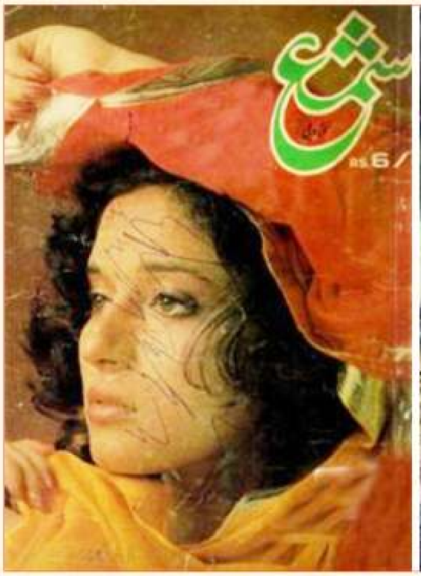

تعارف دیا۔ کہنے لگے، اچھا اچھا آپ ہو بشیر مالیرکوٹلوی۔ میرے ایسے چھٹ بھیئے کو یونس صاحب نے بہت پیار اور عزت سے بٹھایا۔ باتیں کیں، اور چائے پلائی۔ میں پہلی ہی ملاقات میں ان کا گرویدہ ہوگیا۔ اس دن کے بعد میں اکثر و بیشتر ان سے ملتا رہا۔ یونس صاحب کے آفس سے ملحقہ مسافر، یعنی ادریس دہلوی صاحب کا آفس تھا۔ دوسری طرف یونس صاحب کی بیٹی سعدیہ دہلوی مدیرہ بانو کا آفس تھا۔ 84ء سے 2000ء تک میں ماہنامہ 'شمع' کا چہیتا افسانہ نگار بنا رہا۔ یونس صاحب میرے افسانوں اور منی کہانیوں کو لگاتار دوسرے شمارے میں بھی شائع کر دیتے تھے۔ یہ حق شاید انھوں نے مجھے ہی دیا تھا۔ کئی بار میرے افسانوں کو بلاعنوان کا شرف بھی حاصل ہوا، اور میں جی بھر کر شمع میں چھپا۔

مرحوم یونس دہلوی خوبیوں کا گہوارہ تھے۔ مرحوم کی ایک خوبی اُن کا انداز گفتگو تھا۔ میں زندگی میں دو شخصیات کی اردو گوئی کا قائل ہوں۔ ایک فلم اسٹار دلیپ کمار، دوسرے یونس دہلوی مرحوم۔ دلیپ کمار کو میں کبھی نہیں ملا، ان کا تلفظ اور انداز بیان کا جواب نہیں۔ یونس دہلوی صاحب کی اردو گفتگو کا تو میں مداح تھا۔ اگر یہ کہوں کہ ان سے باتیں کر کے میرا تلفظ سنورتا تھا، تو غلط نہ ہوگا۔ اس قدر بہترین اردو بولتے تھے کہ جی چاہتا تھا، بس سنتے ہی جائیں۔ افسانوں کی پرکھ کی بات کریں تو وہ ماسٹر تھے۔ میں نے آج تک اس قدر افسانے کو جانچتے ہوئے کسی مدیر کو نہیں دیکھا۔ آج کا مدیر محض نام دیکھتا ہے بہت کم ایسے لوگ ہیں جو پڑھ کر سوچ سمجھ کر افسانے شائع کرتے ہیں۔ یونس صاحب نے مجھے دوپہر کے تین بجے کا وقت دیا تھا۔ میں سیدھا اُن کے آفس میں جاتا، افسانہ دیکھ کر، اسی وقت قابل اشاعت کی مہر لگا دیتے یا اس کی خامیوں کی طرف میری توجہ دلا دیتے۔ ایک بار میں ایک تازہ افسانہ لے کر ان کے آفس گیا اور میں نے افسانہ ان کے آگے رکھ دیا۔ ایک ڈیڑھ منٹ میں انھوں نے افسانہ لوٹا دیا۔ یہ کہہ کر کہ کوئی اور لے آؤ۔ میں نے کہا۔ یونس صاحب آپ اسے پڑھ کر تو دیکھیے! وہ ہنس پڑے بولے میں نے مکمل پڑھ لیا، تم چاہو تو اس کے کسی بھی پہلو پر بات کر سکتے ہو۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا سر آپ نے اتنی جلدی کیسے یہ سات صفحات پڑھ لیے؟ اُس دن مجھ پر انکشاف ہوا کہ یونس صاحب صفحہ کے پہلے لفظ سے آخری لفظ تک ترچھا پڑھ کر، افسانہ سمجھ جاتے تھے۔ کہنے لگے: میرے پاس ہزاروں افسانے آتے ہیں اگر انھیں مکمل پڑھنے لگوں تو مشکل ہو جائے اس لیے میں ترچھا پڑھتا ہوں۔ ایک ایک لفظ، پھر افسانے کی کمزوریوں کو لے کر مجھے درس دینے لگے۔ میں نے یونس دہلوی صاحب سے بہت کچھ سیکھا۔ میرے دوسرے مجموعے 'سلگتے لمحے' کے لیے انھوں نے اپنے ہاتھ سے نوٹ لکھ کر دیا جو میرے لیے اثاثہ ہے۔ ان کا آشیرواد ہے۔ میں تقریباً سال سال دہلی کے قریبی اضلاع میں رہا۔ ان کی صحبت سے فیضیاب ہوتا رہا۔ بعد میں میرا تبادلہ پنجاب میں ہوگیا۔ میں ذاتی طور پر یونس صاحب سے دور ہوگیا۔ مگر شمع سے مسلسل جڑا رہا۔ غالباً سنہ 2000 میں شمع بجھ گئی تو فلمی اور ادبی میدان میں اندھیرا چھا گیا۔ میرے ادیب دوستوں کا مجھ پر الزام ہے کہ میں فلمی پرچوں میں زیادہ چھپتا رہا۔ اسی لیے ادب میں اپنا مقام نہیں بنا سکا۔ سر تسلیم خم ہے۔ کیا کرتا ماہنامہ 'شمع' میں شائع ہونا میری کمزوری تھی۔ عصر حاضر میں بڑے خوبصورت پرچے نکل رہے ہیں، مگر جو بات شمع میں تھی وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ شمع پوری اردو دنیا میں مقبول تھا۔ کچھ سال ہوئے مجھے یو کے جانے کا اتفاق ہوا۔ برمنگھم ریڈیو اسٹیشن پہ مجھے بطور مہمان کلاکار حصہ لینے کا موقع ملا۔ افسانہ سنانے کے بعد مجھے سامعین کے سوالات کے جوابات دینے تھے۔ یورپ کے ممالک سے سامعین نے مجھ سے بات کی۔ کئی لوگوں نے مجھے بتایا کہ وہ مجھے 'شمع' نئی دہلی کے زمانے سے جانتے ہیں۔ شمع میں شائع ہونے والے افسانے اکثر و بیشتر پاکستان کے پرچوں میں بھی شائع ہو جاتے تھے، یہ شمع کے افسانوں کے معیار کی کشش تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پاکستان میں شمع نئی دہلی بہت مقبول تھا۔ ہم نے یہ بھی سنا تھا کہ رسالہ 'شمع' پاکستان میں بلیک میں بکتا تھا۔ ماہنامہ 'شمع' فلمی دنیا میں بھی کم مقبول نہیں تھا۔ ان دنوں بالی ووڈ میں اردو زبان و ادب کو پڑھا جاتا تھا۔ 'شمع' کی کسی فلم کے بارے میں رپورٹس، پر فلم کی کامیابی منحصر ہوتی تھی۔ آج فلم انڈسٹری میں کہانی کا فقدان ہے۔ تبھی تو فلمیں، تاریخی کہانیوں اور مختلف شخصیتوں پر بننے لگی ہیں یا پھر پرانی فلموں کی کہانیوں یا ساؤتھ والوں کا سہارا لیا جا رہا ہے جسے بالی ووڈ کو 'شمع' اس معاملے میں کارآمد ثابت ہوتا تھا۔ میرا اپنا مشاہدہ، سنیے میری کہانی 'ممتا کا سودا' نومبر 1997 میں شائع ہوئی جس پر فلم 'چوری چوری چپکے' بنالی گئی۔ یہ کیا چھوٹا ثبوت ہے 'شمع' کی مقبولیت کا؟ میں یہ کہنے میں عار نہیں سمجھتا کہ جو مجھے چند جملے تخلیق کرنے اور شائع ہونے کی سعادت نصیب ہوئی ہے، مجھے ماہنامہ 'شمع' نئی دہلی خاص کر مرحوم یونس دہلوی نے بخشی۔ خدا اُن کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام بخشے۔ (آمین)

> **شمع میں شائع ہونے والے افسانے اکثر و بیشتر پاکستان کے پرچوں میں بھی شائع ہوجاتے تھے، یہ شمع کے افسانوں کے معیار کی کشش تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پاکستان میں شمع نئی دھلی بہت مقبول تھا۔ ہم نے یہ بھی سنا تھا کہ رسالہ 'شمع' پاکستان میں بلیک میں بکتا تھا۔ ماھنامہ 'شمع' فلمی دنیا میں بھی کم مقبول نہیں تھا۔ ان دنوں بالی ووڈ میں اردو زبان و ادب کو پڑھا جاتا تھا۔ 'شمع' کی کسی فلم کے بارے میں رپورٹس، پر فلم کی کامیابی منحصر ہوتی تھی۔ آج فلم انڈسٹری میں کہانی کا فقدان ھے۔ تبھی تو فلمیں، تاریخی کہانیوں اور مختلف شخصیتوں پر بننے لگی ھیں یا پھر پرانی فلموں کی کہانیوں یا ساؤتھ والوں کا سہارا لیا جارھا ھے جسے بالی ووڈ کو 'شمع' اس معاملے میں کارآمد ثابت ھوتا تھا**

■

Mohd Bashir Malerkotlvi
Retd. Estate Officer, Near Urdu Academy
Manto Street, O/S. Delhi Gate
Malerkotla - 148023 (Punjab)
Cell:09417423788

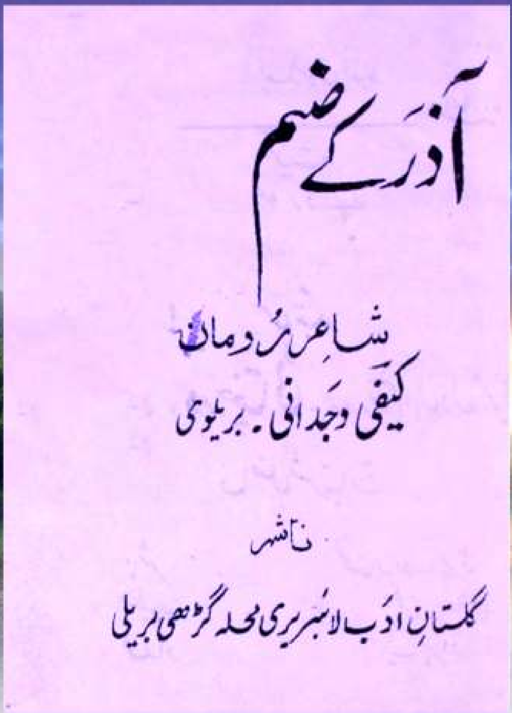

پی پی سریواستو رند

شاعرِ رومان کیفی وجدانی بریلوی

شعر ہو یا نثری اَدب یا کوئی دیگر فنونِ لطیفہ، ان سب کی آبیاری کے لیے موزونیِ طبع اور ذہنِ رسا کے ساتھ خونِ جگر کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ بریلی ایک ایسا مردم خیز علاقہ ہے جس نے ایسی ماہر شخصیات پیدا کی ہیں جنھوں نے اپنی ادبی خدمات سے اس کا نام روشن کیا۔ اگر ادب کی تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھیں تو نواب محبت خاں محبت (ف 1809)، میر غلام علی عشرت (ف 1821ء)، میر حسن شاہ حقیقت (ف 1834)، مفتی سیّد احسن تلمیذ مرزا غالب (ف 1852)، مفتی سلطان احمد احسن، تلمیذ مرزا غالب (ف 1882)، حسن رضا خان تلمیذ داغ دہلوی (ف 1908)، منشی بدرالدین تلمیذ مرزا غالب کے علاوہ ان ادیبوں اور شاعروں کا ذکر بھی بریلی سے منسلک ہے جواب یادگارِ پارینہ ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر ماتا پرشاد زیب بریلوی۔ شیام موہن لال جگر بریلوی، تبارک علی عبرت تلمیذ دل شاہجہانپوری وغیرہ آج بھی پروفیسر حنیف کیفی (جامعہ نئی دہلی) اور زاہد حسین ووسیم بریلوی موجود ہیں۔

اس ہجوم میں ایک نام کیفی وجدانی کا بھی ہے جو، جواں عمری میں ہی راہی ملک عدم ہوا۔

ملاقات کیفی وجدانی سے 1972 میں ہوئی جب میرا تبادلہ ویسٹرن ریلوے (Western Railway) سے این۔ ای ریلوے گورکھپور ہوا اور 'پوسٹنگ' عزت نگر ڈویژن جو بریلی کا نواحی علاقہ ہے۔ اس ملاقات کا سہرا جناب انور چغتائی بریلوی کے سر جاتا ہے جو عزت نگر کے ریلوے کے اکاؤنٹ ڈپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ 1972 میں ہی ایک سیّد صاحب سبکدوش ہوئے۔ ان کے اعزاز میں ایک تقریب تھی جس میں جناب انور چغتائی نے ایک منظوم 'سراپا' پڑھا تھا جس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس وقت تک میرے دو یا تین شعری مجموعے منظر عام پر آچکے تھے اور میں اردو کے ادبی رسالوں میں بھی اکثر نظر آجاتا تھا۔ انور چغتائی، استاد الشعرا اور مصوّرِ فطرت حضرت عبرت بریلوی کے جانشین تھے اور بالغ نگاہ شاعر تھے۔ کیفی وجدانی انور صاحب کے بہت نزدیک تھے۔ کیفی وجدانی نے اپنے مجموعۂ کلام 'آزر کے صنم' میں اپنی عقیدت کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''جناب انور چغتائی کو میں ایک کہنہ مشق شاعر ہونے کے ناطے جانشیں عبرت تسلیم کرتا ہوں۔ ان کے مشورے حضرتِ عبرت کی غیر موجودگی میں ہمیشہ میرے لیے مشعلِ راہ بنے اور آج بھی وہ اکثر اپنی قیمتی رائے اور پُرخلوص تنقیدی نظروں سے میرے کلام کو نوازتے ہیں۔''

بریلی تبادلے کے بعد جب کچھ فرصت کے لمحات میسر ہوئے تو کچھ اور شخصیات سے بھی ملاقات ہوئی، جنہیں میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ محترم راجے بریلوی ایڈووکیٹ ڈاکٹر لطیف حسین ادیب، پروفیسر کرپانندن جو بریلی کالج کے شعبۂ انگریزی کے صدر تھے اور جنھیں اردو، ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔

اُنھیں دنوں جناب انور بریلوی کے ساتھ بریلی میں ایک ادبی نشست میں شرکت کرنے کا موقع ہاتھ آیا۔ اس میں مقامی شعرا نجمی بریلوی اور شاعر بریلوی کے ساتھ کیفی وجدانی کو سننے کا موقع بھی ملا۔ کیفی نے جب غزل پڑھی تو نشست میں داد و تحسین کا شور آسمان کو چھوگیا۔

ضرور اک نیند، زیرِ سایۂ مژگانِ نم لے لے
سفر درپیش ہے اے زندگی تھوڑا سا دم لے لے
بُرا مت مان خود سے بے نیازی میری فطرت ہے
تجھے بھولا نہیں اے زندگی مجھ سے قسم لے لے

اس کے بعد کیفی نے جب یہ اشعار پڑھے تو محفل میں کوئی بھی شخص ایسا نہیں تھا جس نے جھوم جھوم کر داد نہ دی ہو اور شاید یہ اشعار ہی میری اور کیفی کی قربت کا سبب بنے۔

میں اپنی زندگانی بیچتا ہوں، اس کے بدلے میں
خدا چاہے خدا لے لے، صنم چاہے صنم لے لے
میں اپنی داستاں ترتیب دے لوں صرف اے کیفی
پھر اس کے بعد چاہے موت ہاتھوں سے قلم لے لے

اس نشست کی صدارت جناب انور چغتائی بریلوی نے کی۔ ان کے دو اشعار اب بھی یاد ہیں۔

زندگی بے وفا لگے ہے مجھے
اس میں تیری ادا لگے ہے مجھے
بے وفا تجھ کو لوگ کہتے ہیں
اور اِس کا بُرا لگے ہے مجھے

اسلوب بیان بالیقین ایک فطری عطیہ ہے۔ اردو شاعری

میں باریک بینی اور نکتہ رسی ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ کیفی وجدانی کی شاعری میں نازک احساسات، ظاہری سطح پر رنگ روپ کی طرح بکھرے ہوئے ملتے ہیں اور نکہت گل کی طرح غیر مرئی فضاؤں میں پیچ وخم کھاتے ہیں۔نشور واحدی نے کیفی کی شاعری کے بارے میں لکھا تھا کہ:

''کیفی نے دنیائے شعر ونغمہ میں ایک گلستاں آہستہ خرامی سے سج دھج سے سجایا ہے کہ اس کی پنکھڑیاں ہلکے ہلکے رنگ کی شاخیں مرمریں کلائیوں کی طرح صندل افشاں نیم شگفتہ خوشبوؤں کے ساتھ دھیمی اور سہانی لگتی ہیں۔''

کیفی وجدانی اپنے کلام کی سطح پر بہت کم ملتا ہے۔ سیاہ راتوں کی خاموشی، ان گنت تاروں کی ڈوبتی مسکراہٹ، خاموش فضاؤں کے شکستہ دل خواب کیفی کو چاروں طرف سے گھیرے رہتے ہیں۔ الفاظ کی گھن گرج، مفہوم کی وسعت، پرواز تخیل اور شائستہ مزاجی کیفی کا سرمایہ ہیں۔ جس میں جھنجھلاہٹ بھی ہے اور ٹھہراؤ بھی۔

لہو میں بھی مرے چہرے کا زرد رنگ ملا
ہر آئینے میں، میں اپنے سے محوِ جنگ ملا
وہ تا بہ حدِّ نظر وسعتوں کا پھیلاؤ
مگر اڑا تو مجھے آسمان تنگ ملا
نشانہ بنتی رہی، انفرادیت مری
کسی شجر سے نہ میرے پروں کا رنگ ملا
وہ شخص تھا ہی نہیں احتیاط کا قائل
وہ شخص مجھے ملا اور بے درنگ ملا
وہ بات پھر بھی زبان قلم پہ آ ہی گئی
غزل میں بھی مری جھنجھلاہٹوں کا رنگ ملا

کیفی وجدانی ہمارے ہی محکمہ یعنی ریلوے میں ٹی۔ٹی ای (T.T.E.) تھے اور بریلی سٹی اسٹیشن ہیڈ کوارٹر تھا مگر

کیفی کی شاعری میں زندگی کی حقیقتیں، مناظر کی دلفریبی، نفسیات کی باریکیاں اور رومانی فضائیں الگ الگ سطح پر جلوہ گر ہیں۔ کیفی وجدانی کا شمار بریلی کے جدید شاعروں میں کیا جاتا تھا۔ 1971 اور اس کے بعد کا وہ کلام جس نے کیفی وجدانی کو کیفی دیوانی بنایا دستیاب نہیں ہے۔ ہاں متفرق غزلیات جو کبھی میرے ہاتھ آسکیں اب تک میرے پاس ہیں۔ ان غزلیات میں سادگی، منفرد لب ولہجہ ہے، شگفتگی ہے۔

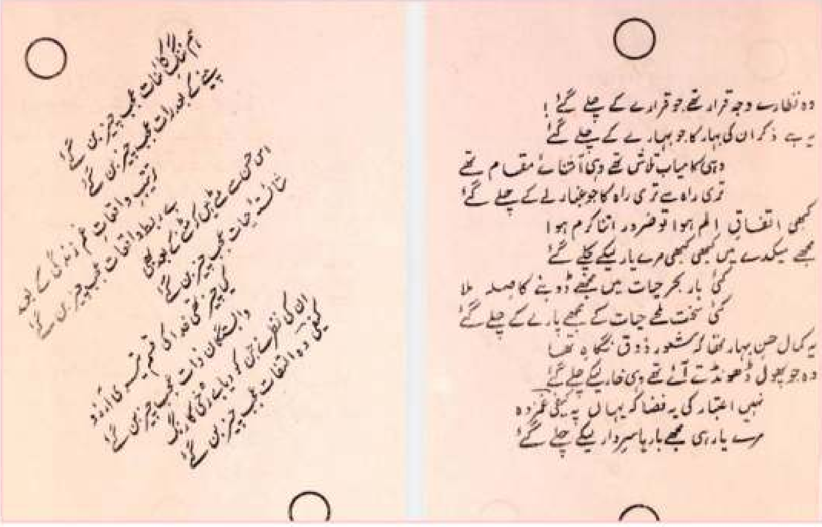
وہ نظارے وجہ قرار تھے جو قرار لے کے چلے گئے
یہ ہے ذکر ان کی بہار کا جو بہار لے کے چلے گئے
وہی کامیاب تلاش تھے وہی آشنائے مقام تھے
تری راہ سے تری راہ کا جو غبار لے کے چلے گئے
کبھی اتفاق الم ہوا تو ضرور اتنا کرم ہوا
مجھے میکدے میں کبھی کبھی مرے یار لے کے چلے گئے
کئی بار بحر حیات میں مجھے ڈوبنے کا جو صلہ ملا
کئی تخت مجھے حیات کے مجھے پار لے کے چلے گئے
یہ کمال حسن بہار تھا کہ نشو و ذوق نگاہ تھا
وہ جو پھول ڈھونڈنے آئے تھے وہی خار لے کے چلے گئے
نہیں اعتبار کی یہ فضا کہ یہاں پہ کیفی غمزدہ
مرے یار ہی مجھے بار بار سر دار لے کے چلے گئے

ہمارے درمیان محکمے کی کوئی دوری نہیں تھی۔ میں ان کی شاعری کا مداح تھا اور ان کو حق تھا کہ وہ کسی بھی وقت اور کہیں بھی ایک شاعر دوست کی حیثیت سے مل سکتے تھے اور اکثر ایسا ہوتا بھی تھا کہ ڈیوٹی کے بعد گھر جانے سے پہلے ایک 'جھانکی' میرے غریب خانہ پر بھی ڈال دیتے۔ وہ فطرتاً لاابالی قسم کے آدمی تھے۔ ایک دن آئے اور بولے ایک طرحی مشاعرہ یا نشست ہے۔ مجھے بھی شرکت کرنا ہے مگر اپنا شعر سنا کر غائب ہوگئے۔

ہمارے سَر سے بس اک خوں کی دھار تو نکلی
پھر اس کے بعد شگاف آگئے چٹانوں میں

کیفی کے جانے کے بعد میں اس شعر کو بار بار لکھتا اور پڑھتا رہا اور لطف لیتا رہا۔ ایسا ہی ایک واقعہ اور ہے۔ بریلی کی برسات بہت مشہور ہے۔ ہوتی ہے تو کئی کئی دنوں تک، کبھی موسلا دھار، کبھی رِم جھِم۔ ایسے ہی موسم میں صبح صبح کیفی نمودار ہوئے اور بولے شعر سنیے۔

گھروں میں چھپ نہ بیٹھو، کہ رُت سہانی ہے
چھتوں پہ آؤ کہ بارش کا پہلا پانی ہے
یہ حادثات تو بچپن سے ساتھ ہیں میرے
تمہارا غم تو بہت بعد کی نشانی ہے

اس کے علاوہ اور بھی کئی اشعار تھے جو اب یاد نہیں۔ چونکہ یہ اشعار دل کو چھو گئے۔ اب بھی یاد ہیں۔

کیفی کی شاعری میں زندگی کی حقیقتیں، مناظر کی دلفریبی، نفسیات کی باریکیاں اور رومانی فضائیں الگ الگ سطح پر جلوہ گر ہیں۔ کیفی وجدانی کا شمار بریلی کے جدید شاعروں میں کیا جاتا تھا۔ 1971 اور اس کے بعد کا وہ کلام جس نے کیفی وجدانی کو کیفی دیوانی بنایا دستیاب نہیں ہے۔ ہاں متفرق غزلیات جو کبھی میرے ہاتھ آسکیں اب تک میرے پاس ہیں۔ ان غزلیات میں سادگی، منفرد لب ولہجہ ہے، شگفتگی ہے۔شادابی ہے۔

ہَوا کی شکل میں اک انتشار گھر میں تھا
تمام راہ کا گرد و غبار گھر میں تھا
میں جس کی کھوج میں صحرا نورد کہلایا
انھیں رُتوں کو مرا انتظار گھر میں تھا
اسے یہ غم کہ میں آواز دے کے لَوٹ آیا
مجھے یہ وہم کہ وہ میرا یار گھر میں تھا
کہیں بھی رہتے مگر عافیت، کہیں بھی نہ تھی
برون خانہ رَسَن ہے تو دار گھر میں تھا
نگل ہی لیتی وہ خونخوار تیرگی لیکن
شکار ہونے سے پہلے شکار گھر میں تھا
میں اپنے ظاہر و باطن کو کچھ سمجھ نہ سکا
سڑک پہ کیوں تھا اگر میرا پیار گھر میں تھا

کیفی وجدانی کی شاعری میں ایک دَبا ہوا احتجاج بھی ہے، کیونکہ وہ ایسے معاشرے میں رہ رہے تھے جہاں احتجاج کی لَو تیز نہیں کی جاسکتی تھی مگر گرد و پیش کے حالات سے ان کا دل زخمی تھا اور وہ ان زخموں کو آہستہ آہستہ اپنے اشعار سے مندمل کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر درد اپنی جگہ قائم رہا۔ اسی زمانے میں بریلی کے ادبی حلقے میں ایک ایسا واقعہ منظر عام پر آیا جس کا چرچا مہینوں تک رہا۔ کیفی کا ذہن بھی اس واقعہ سے متاثر ہوا۔ میں یہ واقعے اس لیے نہیں لکھ رہا ہوں کہ کسی کی دل شکنی نہ ہو مگر کیفی نے جھنجھلاہٹ اس طرح نکالی۔

طوفاں کشتی، موج، کنارا بک جائے
پیاس کی قیمت دے تو دریا بک جائے
سچے حرفوں کی کوئی پہچان نہیں
کیا جانے کب لکھنے والا بک جائے
آج بھی سورج سَر پر آنے والا ہے
کاش مرا گھٹتا ہوا سایا بک جائے

بیٹھے ہیں بازار میں ہم بھی اے کیفی
شاید کوئی لفظ ہمارا بک جائے

کیفی وجدانی نے جن موضوعات کو برتا، وہ اس لیے اہم نہیں ہیں کہ اُنھیں کیفی نے اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ اس دور میں بھی دوسرے شعرا ان موضوعات کو اپنی شاعری میں پیش کررہے تھے مگر جن موضوعات کو کیفی نے اپنے اسلوب میں ڈھالا، وہ اتنے مکمّل تھے کہ ایک ایک لفظ خود اپنی جگہ معنی بن کر صفحۂ قرطاس پر آ گیا۔ لفظوں کی اس تلاش نے کیفی کو ایسی شعری زبان تشکیل دینے کی تحریک دی کہ ایک انفرادی شعور عطا ہوا۔ دلکش ترکیبیں، منفرد ردیفیں و معنی کا برتاؤ ان کی شاعری کا حصّہ بن گیا۔

بس اُسے تو صرف آئینہ دکھانا پڑ گیا
مجھ کو اپنے سامنے سے ہو کے جانا پڑ گیا
سب ہی شرمندہ نظر آتے تھے سارے شہر میں
اپنا اپنا زخم سَر، سب کو دکھانا پڑ گیا
ڈوبتی کشتی، کنارے سے لگانے کے لیے
پیٹ سے باندھا ہوا پتھر گرانا پڑ گیا
وہ مناظر سامنے آئے کہ اپنے ہاتھ میں
جو دیا ہم نے جلایا تھا بجھانا پڑ گیا
بازوؤں میں بھر کے کچھ اونچی اڑانوں کی تھکن
پھر ہمیں کیفی انھیں سطحوں پر آنا پڑ گیا

سَر پٹکتی پھری، دیوانی ہَوا پانی پر
دیر تک جلتا رہا کوئی دیا پانی پر
اس کنارے مجھے دیکھا، تو کہا لوگوں نے
کیسا پتھر تھا کہ جو 'تیر' گیا پانی پر
اتنی بھیگی ہوئی پلکوں پہ نہ چُن روح کے زخم
پود شعلوں کی ہے اس کو نہ لگا پانی پر
اہمیت پانی کی کیا ہے یہ بتا کر اس نے
لِکھ دیا تشنہ لبی کا بھی مزہ پانی پر

اس کے علاوہ جو غزلیات میں نے کیفی کی زبان سے نشستوں میں سنی ہیں یا وہ غزلیات جو نجی محفلوں میں کیفی نے لاابالی پن کے ساتھ سنائیں، ایک مختلف انداز کی تھیں۔ اگر وہ تمام سرمایہ آج موجود ہوتا تو عرفان صدیقی جیسے شاعر کے مقابلے میں کھڑا کیا جا سکتا تھا۔ ان کے کلام میں جدیدیت تھی۔ اسلوب میں رچاؤ تھا۔ آراستگی پیدا کرنے کا احساس تھا۔ ان کے اشعار میں اکثر نئی ترکیبیں، الفاظ کی تراش خراش اور خود رنگ تشبیہوں کا انوکھا امتزاج تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس دَور میں کیفی کی آواز عام شعرا سے الگ تھی جو اس کی پہچان بنی۔ کیفی کی شاعری میں ایک وجدانی اسلوب بھی تھا۔ اب میں کیفی کا وہ کلام کہاں سے لاؤں جس نے نہ صرف مجھے بلکہ اس وقت کے اکثر ادیبوں اور شاعروں کو نہ صرف متاثر کیا تھا بلکہ اسے عوامی شہرت بخشی۔ میرے پاس اس وقت ٹیپ ریکارڈ کی گئی چند غزلیں ہی ہیں، جن کو میں اس مضمون میں شامل کر رہا ہوں۔

کنارہ خود نہ تھی، اس سے پیشتر وہ ندی
تھا جس ندی کے کنارے ہمارا گھر وہ ندی
وہ جس کے 'سوت' مری چشمِ تر سے ملتے ہیں
ڈبو رہی ہے مجھے، مجھ میں ڈوب کر وہ ندی
وہ 'دشت زادہ' تھا، چلّو میں ریت بھر لایا
کبھی اٹھا نہ سکے گی اب اپنا سَر وہ ندی
تمہارے گاؤں کی دہلیز، چوم کر اک دن
اُتر گئی مری پتوار چھوڑ کر وہ ندی
بچھا کہ جلتی ہوئی ریت پر وہ رنگِ سراب
سمٹ گئی ہے مری پیاس موڑ کر وہ ندی

وہ لمحہ عمر بھر کے لیے اک سزا بنا
جو میری زندگی نہ بنا، راستا بنا
میرے سکوت میں مری آواز کھو گئی
میں خود کو توڑ کر بھی نہ گونگی صدا بنا
دونوں ہی ایک سوکھے سمندر کی دین ہیں
میں دشت بے کنار بنا، وہ گھٹا بنا
پتھر کی سختیاں بھی کھلے سَر کے ساتھ ساتھ
یہ بھی کھُلا کہ سَر نہ تھا موم کا بنا
تاریکیوں میں ڈوب رہی ہے فصیل جسم
اب اے شعاع خانہ کوئی راستا بنا

کیفی وجدانی نے جن موضوعات کو برتا، وہ اس لیے اُہم نہیں ہیں کہ اُنھیں کیفی نے اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ اس دور میں بھی دوسرے شعرا ان موضوعات کو اپنی شاعری میں پیش کررہے تھے مگر جن موضوعات کو کیفی نے اپنے اسلوب میں ڈھالا، وہ اتنے مکمّل تھے کہ ایک ایک لفظ خود اپنی جگہ معنی بن کر صفحۂ قرطاس پر آگیا۔ لفظوں کی اس تلاش نے کیفی کو ایسی شعری زبان تشکیل دینے کی تحریک دی کہ ایک انفرادی شعور عطا ہوا۔ دلکش ترکیبیں، منفرد ردیفیں ومعنی کا برتاؤ ان کی شاعری کا حصّہ بن گیا

ایسا نہیں ہے کہ کیفی نے اس دَور کی روایتی شاعری سے خود کو الگ کر لیا تھا اور پورے طور پر جدیدیت کا جامہ پہن لیا تھا۔ طبیعت موزوں ہوئی تو یاروں کی محفل میں شریک ہو گئے یا پھر خمریات کی طرف راغب ہو گئے۔ میں ان کے یاروں کی محفل کا شاہد ہوں۔ اب یہ اشعار بھی دیکھ لیں۔

ہم ننگ کائنات، عجب چیز بن گئے
پینے کے بعد رات عجب چیز بن گئے
ترتیبِ واقعات غمِ زندگی کے بعد
بے ربط واقعات عجب چیز بن گئے
کیا چیز تھی خُدا کی قسم تیری آرزو
وابستگانِ ذات عجب چیز بن گئے
ان کی نظر نے جن کو دیا بے رُخی کا رنگ
کیفی وہ التفات عجب چیز بن گئے

ایسا بھی اکثر ہوا کہ کیفی آئے۔ کھڑے کھڑے بات کی اور کوئی شعر سنایا اور بھاگ لیے۔ ایک روز آئے اور یہ شعر سنایا اور غائب ہو گئے۔

ہر اک سے پوچھتے تھے پتہ میکدے کا ہم
ہم تو تمام رات تماشا بنے رہے

نئے غزل گویوں کے قافلے میں کیفی وجدانی کی آواز روایت سے الگ ہٹ کر بریلی کی فضاؤں میں گونجی۔ افسوس کہ اس کا سرمایۂ شاعری میرے پاس نہیں ہے۔ اس سے بڑھ کر افسوسناک بات یہ ہے کہ کیفی وجدانی کے بڑے بیٹے شارق کیفی جو منفرد انداز کے شاعر ہیں، انھوں نے بھی اپنے والد کیفی وجدانی کے سرمایہ کو محفوظ نہیں کیا۔ میں نے اس کی وہ غزلیات سنی ہیں جو روایات سے الگ تھیں اور ان غزلیات میں اس نے نئی لفظیات، نئی تراکیب کو برتا تھا اور شاید یہی وجہ تھی بریلی شہر میں کیا گرد و نواح میں بھی اس کی شاعری کے چرچے تھے۔ لکھنؤ میں والی آسی کی دوکان اور کیفی کا ذکر اس زمانے میں اکثر ہوتا تھا۔ افسوس کہ اچانک 23/اگست 1988 کیفی کی آواز یکدم خاموش ہو گئی۔ ڈیوٹی سے واپس آئے تھے اور اپنی اسکوٹی پر اپنے جگری دوست بال کشن کی دوکان واقع کتب خانہ بریلی پہنچے۔ پسینے میں تربتر، مشکل سے دوکان میں بیٹھے اور اپنے دیرینہ جگری دوست بال کشن کے سامنے آنکھیں بند کر لی۔ اس دارفانی سے کوچ کر گئے، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

نہیں اس کا غم بالآخر ہمیں ایک دن تھا مرنا
ترے آستاں پہ مرتے تو کچھ اور بات ہوتی

■

Mr. P.P. Sriwastav Rind
R-16, Sector 11
NOIDA - 201301 (UP)
Mob.:0971142018

بھٹکل شاعر ڈاکٹر محمد حسین فطرت مرحوم

محمد ناصر سعید اکرمی

مرحوم فطرت کی پیدائش 1932 کی ہے، آپ کا نام محمد حسین ہے، فطرت آپ کا تخلص ہے، آپ کے والد کا نام حاجی عبدالقادر تھا، آپ کی تعلیم انجمن ہائی اسکول میں ہوئی، پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ یونیورسٹی تشریف لے گئے اور وہاں ادیب ماہر کی سند پائی، آپ ایلوپیتھک کے ڈاکٹر بھی ہیں، مرحوم نے ابتدائی تعلیم اس وقت کے عام رواج کے مطابق مولانا شریف محی الدین اکرمی سے حاصل کی اور اردو ادب کا ذوق مولانا محمود خیال سے ملا۔ مرحوم خیال صاحب خود شاعر تھے، اور خیال اپنا تخلص لکھتے تھے، ہائی اسکول میں اس زمانے کے طلبہ نے آپ سے خوب استفادہ کیا تھا اور اچھا ادبی ذوق آپ سے پایا تھا، انھیں میں مرحوم عبداللہ دامودی بھی تھے۔ فطرت کو بچپن ہی سے مطالعے کا ذوق رہا، اسی ذوق نے ان کو ایک ممتاز شاعر کا درجہ دیا، ہندوستان سے نکلنے والے اکثر ادبی رسائل ان کے زیر مطالعہ رہتے تھے، عربی اور فارسی کو انھوں نے اپنی محنت اور کاوش سے سیکھ لیا تھا، ہندوستان بھر سے کتابیں منگواتے تھے خود بھٹکل میں بھی الحجاز بک ایجنسی، شبیر برادرس وغیرہ سے عمدہ اور چنیدہ کتابیں خریدتے تھے، اور حرف حرف پڑھنے کے بعد آپ کا یہ معمول تھا کہ ان کتابوں کو آدھے دام میں فروخت کرتے تھے تا کہ ان روپیوں سے دوسری کتابیں خریدی جا سکے۔

فطرت بڑے ذہین تھے، پڑھا لکھا سب یاد ہو جاتا تھا، بڑے بڑے رائٹرس اور ادیبوں کی کتابوں کو مرحوم نے اپنے ذہن و دماغ میں محفوظ کر لیا تھا، آپ محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر، مولانا حالی، رشید احمد صدیقی، مولانا آزاد، علامہ شبلی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مودودی کے علاوہ اس وقت کے اسلامی شعرا و ادبا کی کتابیں اور تصنیفات زیر مطالعہ رہتی تھیں، اس لیے آپ کی فکر و سوچ اسلامی ہوئی، اسی فکر کو آپ نے اپنے اشعار میں ڈھالا۔

فطرت کو بچپن ہی سے شعر و سخن سے لگاؤ رہا، اور طالب علمی کے زمانے ہی میں شاعری کرنے لگے۔ آپ نے اپنی شاعری کی اصلاح وقت کے کہنہ مشق شاعر جناب ابوبکر مصور سے لی، جن کو وقت کے بڑے شاعر داغ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔

فطرت نے جب سے لکھنا شروع کیا، لکھتے رہے، لکھتے رہے، اور اخیر تک لکھتے ہی رہے، اور لوگوں سے خوب داد تحسین حاصل کرتے رہے، ہندوستان بھر کے نامور شعراء اور ادباء نے آپ کی شاعری کو تسلیم کیا، آپ کو ایک اچھا قادر الکلام شاعر تصور کیا، آپ کے کلام میں قدیم و جدید کا حسین اور عمدہ امتزاج پایا جاتا ہے، آپ نے بڑے بڑوں سے داد تحسین حاصل کی ہے، چنانچہ علامۂ وقت حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے فرمایا تھا ''آپ کے کلام میں بڑی روانی اور شستگی اور شائستگی پائی جاتی ہے، تعجب ہے کہ بھٹکل جیسی سرزمین جو اردو کے مرکز سے بہت دور ہے اور واقعی سنگلاخ ہے ایسے دلنواز شعر کہنے والا کیسے پیدا ہو گیا۔ (ساز ازل، ص 10) کہنہ مشق شاعر کوثر فاروقی نے لکھا ہے کہ ''آپ کے کلام کو جنوبی ہندوستان میں اردو کی چند روشنیوں میں ایک روشنی سمجھتا ہوں، بھٹکل میں آپ کا وجود غنیمت ہی نہیں، مبارک ہے اور اس علاقے میں اردو کا بھرم قائم ہے''

(ساز ازل، ص 12)

ایڈیٹر صدق جدید حکیم عبدالقوی صاحب نے لکھا ہے، فطرت صاحب وہاں صاحبِ دیوان شعراء میں ممتاز و منفرد مقام رکھتے ہیں، نہ صرف اردو پر انھیں عبور حاصل ہے بلکہ ان کا کلام گوناگوں معنوی خوبیوں سے مرصع ہے۔ (سخن دلنواز، ص 9)

آپ نے ہر صنف پر طبع آزمائی کی ہے، حمد، نعت، نظم، غزل، ہر صنف پر آپ نے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔

حمدیہ شاعری کے تعلق سے آپ خود لکھتے ہیں ''حمد و مناجات اردو شاعری کی ایک تابناک روایت ہے، الحاد و دہریت کی تاریکی خواہ کتنی ہی چھا جائے انسان کا ضمیر ہمیشہ توحید کی گواہی دیتا رہے گا، اور آدمی کے نہاں خانۂ دل سے یہ صدا بلند ہوتی رہے گی۔

گر پس پردہ کوئی شاہ گلفام نہیں
مری فطرت میں محبت کا شرارہ کیوں ہے!
نقش باطل نہیں یہ رنگ و جمالِ گلشن
عارض گل کو بہاروں نے نکھارا کیوں ہے!

(مضامین فطرت، 41)

فطرت صاحب نعتیہ شاعری کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ پُل صراط کی مانند ہے جس میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے، ذرا سی لغزش سے توحید کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جانے کا خطرہ رہتا ہے۔ فطرت صاحب نے اپنے اشعار میں اس فرق و امتیاز کو باقی رکھا، نہ توحید کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے پایا اور نہ ہی نبی کی مدح سرائی و ثنا خوانی میں کوئی فرق آنے دیا، آپ نے اپنا یہ نعتیہ کلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی بھٹکل آمد کے موقع پر پڑھا تو حضرت والا نے ہر ہر شعر پر آپ کو داد تحسین دی اور اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا، اس کے چند اشعار ذیل میں دیے جاتے ہیں۔

نعت کیا لکھوں یہی سوچ کے گھبراتا ہوں
میں قلم ہاتھ میں لیتے ہوئے رک جاتا ہوں
اپنی کم مائگیِ علم پر شرماتا ہوں
خود کو واللہ میں نااہل بہت پاتا ہوں

نعت لکھنے کے تصور سے لرز جاتا ہوں
آج فرسودہ روایات ہیں نعتوں کا لباس
شرک وبدعت کے خیالات پہ ہے جن کی اساس
نہیں مداح کو توحید کے آداب کا پاس
نعت میں پرتوِ اخلاص کہاں پاتا ہوں
نعت لکھنے کے تصور سے لرز جاتا ہوں

(مضامین فطرت، ص 52)

جناب فطرت مرحوم نے ترانۂ جامعہ اسلامیہ بھٹکل لکھا جس کا ہر شعر اپنے اندر معنویت رکھتا ہے، اردو ادب کا ایک شاہکار اور نہایت ہی عمدہ کلام تصور کیا جاتا ہے، جس دن فطرت صاحب کا انتقال ہوا اسی دن راقم کو سہارنپور سے مولانا غزالی مرحوم پر مضمون کے تعلق سے فون آیا تو باتوں باتوں میں راقم نے کہا کہ آج ہمارے علاقہ کے بلکہ کرناٹک کے ایک بڑے شاعر فطرت صاحب کا انتقال ہوگیا ہے، جس سے پورا بھٹکل سوگوار ہے تو اس وقت ہم نے ترانۂ جامعہ کے چند اشعار ان کو سنائے تو سنتے ہی موصوف نے کہا کہ یہ تو بہت بڑے اور منجھے ہوئے شاعر معلوم ہوتے ہیں، اسی ترانے کے چند اشعار حاضر خدمت ہیں۔

ہم شانہ کشِ زلفِ گیتی تزئین امم کے باعث ہیں
ہم نقش ونگارِ علم وفن رشحاتِ قلم کے باعث ہیں
ہم خندۂ سنبل و ریحاں ہیں ہم شمعِ طاقِ گلشن ہیں
ہے عطر فشانی وصف اپنا ہم سوز وساز کے مخزن ہیں
ہم مطلعِ گوہرِ افشاں ہیں سورج کی تمازت رکھتے ہیں
ظلمت گہہ آب وگل میں ہم انوار کی دولت رکھتے ہیں
بال وپرِ شاہیں رکھتے ہیں پرواز پہ اپنی نازاں ہیں
شہباز فلک پیماں ہیں ہم آفاق میں ہر سو رقصاں ہیں
غنچوں کا تنفس رکھتے ہیں پھولوں کا تفکر رکھتے ہیں
ہم نغمہ سرائے فصل وگل گلشن کا تصور رکھتے ہیں
ہم بھی ہیں بساطِ ہستی پر دنیائے رنگ وبو کی طرح
آوارہ گشتِ امکاں میں کہسار بکف آہو کی طرح

الوداعی نظموں کے چند متفرق اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

شاعرِ فطرت کو تم سے گفتگو مقصود ہے
موعظت کی شمع زیرِ آستیں موجود ہے
عکس ہے یہ چودھویں کے چاند کا اور بدر کا
شاعری در اصل دروازہ ہے شرحِ صدر کا

غافلوں کو پھر عطا ہو علم وہ موتی نہیں
علم جب آتا ہے دل کی آنکھ پھر سوتی نہیں

قول رومی صد کتاب وصد ورق درنار کن
تجھ پہ لازم سینہ را از نور حق گلزار کن

حافظانِ محترم بھی اب یہاں مذکور ہیں
ان کے استاذ ومربی کے بھی ہم مشکور ہیں
تم کو اپنے مرتبے کا رکھنا ہے ہردم خیال
حفظ ہی کافی نہ جانو ہے عمل کا بھی سوال
حافظ قرآں نہ ہونے کا مجھے کب غم نہیں
عاشق قرآں ہوں یہ رتبہ بھی مجھ کو کم نہیں

فطرت کے شعری مجموعے ان کی زندگی میں ہی شائع ہوکر مقبول عام وخاص ہوئے، 'سازِ ازل'، 'گل بانگ فطرت'، 'ساغرِ عرفان'، 'سخن دلنواز'، 'رفیقِ اعلیٰ'۔ اسی طرح مرحوم نے 'نفیر فطرت' کے نام سے ایک علمی وادبی رسالہ بھی جاری کیا تھا جس کے کئی شمارے منظر عام پر آئے، اور لوگوں، خاص طور سے ادبی ذوق والوں، نے اس کو خوب پسند کیا اور سراہا، اسی طرح آپ کے مضامین فطرت کے نام سے نثری مضامین بھی کتابی شکل میں شائع ہوئے ہیں، آپ کے مضامین بہت ہی عمدہ اور ادبی شہ پارے کی حیثیت رکھتے ہیں، بعض کو یہ کہتے سنا گیا کہ فطرت کی نثر شعر سے زیادہ بہتر ہے۔

فطرت کا جامعہ اسلامیہ اور اس کے اساتذہ وطلبہ سے گہرا اور مضبوط ربط تھا، مہینے میں ایک دو مرتبہ آپ اکثر جامعہ تشریف لاتے اور اپنی نئی تخلیقات اساتذہ اور طلبہ کو سناتے، اور اساتذہ ان کے کلام سے خوب محظوظ ہوتے اور جی بھر کر داد بھی دیتے، جامعہ اسلامیہ میں مہمانوں کی آمد کی اطلاع ملتی تو اس موقع پر آتے اور دیر تک مہمانوں کے پاس بیٹھتے اور اپنا کلام سنانے کے لیے موقع نکالتے، مہمان حضرات آپ کا کلام سنتے اور خوشی محسوس کرتے تھے۔

طلبہ کے درمیان بیت بازی ہوتی یا شعری نشست ہوتی تو فطرت صاحب کو ضرور دعوت دی جاتی تھی، بہت کم ایسا ہوا کہ آپ اس طرح کی نشستوں میں تشریف نہ لائے ہوں، اصل میں یہ آپ کا میدان اور یہی آپ کا اوڑھنا بچھونا تھا اور یہی آپ کی اصل غذا تھی، عام طور پر آدمی کی قدر وقیمت اس کی زندگی میں کم مرنے کے بعد زیادہ ہوتی ہے، جیسا فائدہ ان کے علم سے اور ادب سے اٹھانا چاہیے نہیں اٹھاتے، دنیا سے رخصت ہونے کے بعد کف افسوس ملتے ہیں، فطرت جیسے شاعر ہمیشہ پیدا نہیں ہوتے ان کے کلام کی پذیرائی جتنی ہونی چاہیے تھی نہیں ہوئی، فطرت صاحب کو کرناٹک کا نہیں بلکہ پورے ہندوستان کا شاعر اگر کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

■

Mohd Nasir Sayeed Akrami
Madina Colony Amenuddin Road
Bhatkal - 581320 (K.A)
Mob.:09902105300

انیس احمد ندوی

حکیم سید فخرالدین خیالی

ایک پر فکر شاعر اور کہنہ مشق نثار و ادیب

حکیم سید فخر الدین خیالی (1841-1908) 1841 میں رائے بریلی شہر سے باہر ایک چھوٹی سی بستی تکیہ کلاں یعنی دائرہ شاہ علم اللہ میں پیدا ہوئے دائرہ شاہ علم اللہ اہل علم وفضل کی نگاہ میں اہل نظر، اہل علم، اور صاحب قلب و نظر کا مرکز رہا ہے، جہاں دن کو ربانیت کا آفتاب اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جگمگاتا ہے اور شب کو روحانیت کا ماہتاب رہبانیت کی قبائیں چاک کر کے پورے خطے کو بقعۂ نور بنا دیتا ہے، اس خانوادہ کے بارے میں بڑے بڑے صاحب علم کی شہادتیں موجود ہیں، پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں ''دعوت وعزیمت ارشاد وتلقین، علم وفضل سلوک وعرفان، سخنوری وسخن شناشی کا شاید ہی کسی خاندان میں وہ اجتماع ہوا ہو جو رائے بریلی کے دائرہ شاہ علم اللہ میں بسنے والے خانوادہ کو قسام ازل نے ارزانی فرمایا اور جو آج تک اس خاندان کا طرۂ امتیاز ہے۔''

خیالی کے والد ماجد مولانا میر عبدالعلی سید احمد شہید سے نسبی تعلق کے علاوہ نسبت ارادت بھی رکھتے تھے، گر چہ آپ سرکاری ملازمت کرتے تھے مگر زہد واتقا کی زندگی بسر کرتے تھے فطرتا درویش دوست اور طبعا درویش منش تھے، نقاشی، خطاطی اور شاعری بھی ان کی فطرت میں تھی، عربی میں علی نیز فارسی اور ریختہ میں 'ہجر' تخلص کرتے تھے، علم، نسبت، ارادت، زہد وتقویٰ اور شاعری کی خوبصورت فضاؤں میں پروان چڑھنے سے حکیم سید فخر الدین بھی آگے چل کر خیالی، میر اور فخر تخلص کرنے لگے جن کی شاعری میں پاکیزگی کے ساتھ ساتھ خیالات میں حسن اور جذبات میں گل رعنا کا ابال نظر آتا ہے۔

حکیم سید فخر الدین خیالی ایک مثالی عالم دین، عظیم نثر نگار، پر گو شاعر، حکیم و دانا ہیں جنھوں نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا، ان کا مزاج عالمانہ اور جذبات مکمل طور پر شاعرانہ تھے، ان کا مطالعہ نہایت وسیع اور نظر بہت گہری تھی، علوم دینیہ میں مولانا محمد نعیم فرنگی محلی اور شاعری میں سرخیل سخنوراں امیر اللہ تسلیم کے شاگرد تھے، حیدر آباد کے سفر کے دوران سید محمود اصفہانی حریف کو فارسی زبان وادب کا استاذ بنایا اور کلام پر اصلاح لی نیز دوسری زبانیں ہندی، تلگو، تمل وغیرہ سیکھیں۔

آپ نے ہر قسم کے اشعار کہے ہیں، نظم، غزل، مثنوی، قصیدہ، مسدس، مخمس ہر صنف سخن میں نہایت کامیاب اشعار کہے ہیں، خیالی کی مثنویوں میں میر حسن کا رنگ وآہنگ پایا جاتا ہے مسدس میں مولانا خواجہ الطاف حسین حالی کا رنگ جھلکتا ہے، غزل میں مومن وغالب کا رنگ تغزل ملتا ہے، انھوں نے عربی، فارسی، اردو، بھاکھا سب میں عمدہ شاعری کی ہے، آپ کا کلام عربی میں کم، بھاکھا، فارسی اور اردو یا ریختہ میں سب سے زیادہ ہے، نثری تصانیف بھی کئی ایک تھیں لیکن اکثر ضائع ہوگئیں تاہم مطبوعہ وقلمی ملا کر اردو میں تقریبا دس ہزار اشعار دستیاب ہیں

حضرت خیالی کی تصنیفات:

حضرت خیالی کی تصنیفات بہت زیادہ نہیں لیکن بہ لحاظ صفحات بہت زیادہ ہیں، البتہ سب زیور طبع سے آراستہ نہ ہوسکیں۔ آپ کے قلم گہر بار نے عربی، فارسی، اردو، بھاکھا، سب میں اپنا جو ہر دکھایا ہے اور نثر کا بھی عمدہ نمونہ چھوڑا ہے لیکن سب سے زیادہ آپ نے فارسی میں لکھا ہے، آپ کی سب سے اہم وعظیم کتاب ''مہر جہاںتاب'' ہے جو فارسی میں علوم ومعارف کا خزانہ ہے، عربی میں کچھ اشعار کہے ہیں، جو مہر جہاںتاب ہی میں درج ہیں، ایک کتاب اردو میں 'سبیل النجاۃ' ہے جو اوراد و وظائف پر ہے یہ کتاب چھپی تو تھی مگر اب دستیاب نہیں، ندوۃ العلما کی لائبریری میں ایک مطبوعہ نسخہ موجود ہے، ایک کتاب سیرۃ السادات ہے، اس کتاب میں بہت تفصیل کے ساتھ سادات کی بہت سی شاخوں کا نسب نامہ درج ہے، یہ کتاب اب تک غیر مطبوعہ ہے ایک کتاب 'نثر خیالی' نثر ظہوری کے طرز پر لکھی تھی، یہ کتاب چھپی تھی مگر اب دستیاب نہیں، ندوۃ العلما کے کتب خانہ میں ایک نسخہ موجود ہے، یہ کتاب شاہ جہاں بیگم والیِ بھوپال کی مدح میں ہے، اردو نثر میں خیالی کی ایک اور مشہور کتاب 'تاریخ بھسیل کھنڈ' اور ایک کتاب چمنستان اردو ہے (اردو قواعد کی کتاب) مگر اب یہ دونوں بالکل نایاب ہیں، اردو میں ایک کتاب مجربات خیالی لکھی جو وظائف دعائیں اور مرض اور اس کے علاج پر مشتمل تھی، بعض عربی کتابوں کے ترجمے بھی کیے تھے، سیوطی کی ایک کتاب کا ترجمہ 'فخر المطالب' کے نام سے کیا تھا، شاہ ولی اللہ کی کتاب 'انصاف فی بیان اسباب الاختلاف' کا ترجمہ بھی اردو میں کیا تھا مگر اس کا بھی پتہ نہیں، ایک اور کتاب فارسی میں 'سیرت علمیہ' ہے اس میں سید شاہ علم اللہ کے حالات اور ان کے خاندان، تمام علما ومشائخ اور سادات کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ سب سے اہم تصنیف 'مہر جہاںتاب' ہے جو تیرہ سو صفحوں پر مشتمل ایک قسم کی انسائیکلوپیڈیا ہے اس میں پچاسی اردو شعراء کے تذکرے بھی شامل ہیں، مہر جہاںتاب کا آخری باب 'تذکرہ ریختہ گویان ہند' ہے جو بعض حیثیت سے بڑی اہمیت کا حامل ہے اور شعرا کے تذکرے سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک خاص تحفہ ہے، حکیم سید فخر الدین خیالی کی فکر ونظر کا اندازہ ان کی

اسی تصنیف سے لگایا جاسکتا ہے، یہ دو جلدوں پر مشتمل ہے، پہلی جلد میں مختلف علوم کی نوعیت اور خصوصیات سے بحث کی گئی ہے، انبیاء کرام، صحابہ و تابعین نیز مشاہیر اسلام کی سوانح مرتب کی ہے، اور شعرا کے کلام کا انتخاب اور ان کا مختصر حال درج کیا ہے اور دوسری جلد تاریخ و جغرافیہ سے متعلق تھی جو مکمل نہ ہوسکی۔

خیالی کی شاعری:

خیالی ایک پرگو، خوش فکر شاعر ہیں، اردو شاعری میں ان کا بہت سارا کلام ضائع ہوگیا تاہم اب بھی خاصا ذخیرہ موجود ہے آپ نے کئی ہزار اشعار تو مہر جہانتاب کے 'تذکرہ ریختہ گویان ہند' میں محفوظ فرمادیا، آپ نے کئی مثنویاں بھی لکھی ہیں، مثنوی نگار خانہ چین، مثنوی ماہ و خورشید، 'بہار تسلیم' جان فخر، 'فغان فخر'۔ جوش دل آپ کا پہلا دیوان تھا، دیوان فارسی، دیوان فخر وغیرہ۔

''لالہ سری رام مصنف خم خانہ جاوید رقمطراز ہیں:

''نثر خیالی در مدح شاہجہاں والی بھوپال نیز ایک ضخیم مثنوی چار سو صفحہ کی زیور طبع سے آراستہ ہوچکی ہے، دو مثنویاں اور ایک دیوان ابھی غیر مطبوعہ ہے''

(خمخانہ جاوید، سوم 99)

خیالی کے عالم و فاضل پسر نیک اختر مولانا عبدالحی حسنی گل رعنا میں فرماتے ہیں 'مثنوی ماہ و خورشید' بھوپال میں غلام محمد فروغی کی فرمائش پر لکھی تھی تقریباً پانچ ہزار شعر کی کتاب ہے اس کا ناتمام مسودہ میرے پاس ہے، کتاب صاف کرکے فروغی کو دے دی تھی معلوم نہیں انھوں نے کیا کیا، مثنوی نگار خانہ چین فروغی کی فرمائش پر بھوپال میں لکھی یہ بھی ماہ و خورشید کے برابر ہے فروغی نے چھپوالیا تھا'' (گل رعنا، ص 536) ڈاکٹر ہارون رشید صدیقی ندوی اپنی کتاب 'حکیم سید فخر الدین خیالی حیات و کارنامے اور ان کے تذکرہ ریختہ گویان ہند کی تنقیدی تدوین' میں لکھتے ہیں: ''مثنوی ماہ و خورشید کا ایک قلمی نسخہ جو کتب خانہ ندوۃ العلماء میں موجود ہے اس میں صرف 1800 اشعار ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لالہ سری رام نے جس مثنوی کا ذکر کیا ہے وہ نگار خانہ چین ہوگی، مثنوی، بہار تسلیم میں تقریباً چھ سو اشعار ہیں، اس کے علاوہ مسدس خیالی اور منجیات خیالی چھپ گئی تھیں، اور ان کا ایک نسخہ ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

منجیات خیالی:

یہ خیالی کی نعتوں کا مجموعہ ہے، بڑی خوبصورت نعتیں ہیں رنگ و آہنگ میں اقبال کے شکوہ سے کسی طرح کم نہیں، خودی ہے، خود اعتمادی ہے اور اللہ کی ذات عالی سے وابستگی کا یقین و بھروسہ بھی، اشعار ملاحظہ کریں۔

تم نہ دیکھو ہمیں جو رحمت رحماں ہوکر
کیا در غیر پہ ہم جائیں مسلماں ہوکر
حضرت حق سے حکم آپ کے در کا ہے ملا
کس کے دروازہ پہ پھر جائیں پریشاں ہوکر
کون پھر یاد کریں امت عصیان ہوکر
بھولیں گر آپ ہمیں خاصۂ یزداں ہوکر
مہر کہاں اور روئے زیبا صلی اللہ علیہ وسلم
نور کی صورت نور کا چہرا صلی اللہ علیہ وسلم
کہتے کیا ہو فخر خیالی جو بھی کہا ہے وہ تھوڑا ہے
خالق اکبر کا ہے پیارا نام صلی اللہ علیہ وسلم

دیوان فخر: یہ ایک قلمی دیوان خیالی ہی کے قلم سے ہے۔

خطرات خیالی: یہ قلمی نسخہ خیالی ہی کے قلم سے ہے تکیہ کلاں رائے بریلی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

دیوان خیالی: یہ ضخیم قلمی نسخہ کسی اور کے قلم سے ہے اور خیالی کے تقریباً تمام دستیاب شدہ کلام کا مجموعہ ہے۔

مہر جہانتاب: اس کتاب کا تذکرہ پہلے کیا جاچکا ہے۔

بھاکھا کی شاعری:

بھاکھا (بھاشا) (عوامی بولی یا عوامی زبان) میں ان کا پورا ایک دیوان تھا جس کا نام 'پریم راگ' تھا مگر اب اس کا پتہ نہیں البتہ اس کے بہت سے اشعار مہر جہانتاب میں بھاکھا شاعروں کے تذکرہ میں درج ہیں کچھ صاف

شدہ دیوان میں بھی محفوظ ہیں جن سے یہ صاف اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھاکھا کے زبردست شاعر تھے، کہتے ہیں:

بیر یا بولے جیر اہلساوے بولے کوئلیا پیا ناؤں
پپیہا کوں کوں مورو ابولے مور پیا کا کہ بدھ باتوں

خیالی کی اردو شاعری:

حکیم سید فخر الدین خیالی اردو شاعری میں ایک اہم مقام پر فائز ہیں لیکن ان کی شخصیت اور شاعری کی طرف توجہ نہیں دی گئی اول تو یہ کہ جس ماحول میں ان کی پرورش ہوئی وہ پورا خاندان علم، تقوی و پرہیز گاری نیز شاعری کے فکر و فن میں اہم مقام پر فائز تھا، خیالی کے والد سید عبد العلی بجز ایک اچھے شاعر تھے، خیالی کے نانا سید محمد ظاہر ظاہر ایک خوش گو شاعر تھے، ابتدائی اساتذہ میں حکیم محمد جان دہلوی نیز اعزہ اور اقرباء میں کئی ایک شاعر تھے، غرضیکہ شاعری کی گود میں آپ کی پرورش ہوئی، دوسری اہم وجہ یہ کہ آپ کی طبیعت میں طبعی موزونیت جو شاعری کے لیے خشت اول کی حیثیت رکھتی ہے، بدرجہ اتم پائی جاتی تھی، موزوں طبیعت کو اتنا خوبصورت ماحول ملا جس نے آپ کی شاعرانہ صلاحیتوں میں نکھار پیدا کیا اور آپ عمدہ شاعری کرنے لگے، آپ نے ہر صنف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے، نعت، قصیدہ، رباعی، غزل، مخمس مسدس، ترجیع بند وغیرہ لیکن آپ کی مثنویاں اردو شاعری میں اہم مقام کی حامل ہیں، کیونکہ ان میں میر حسن کا رنگ و آہنگ اور زور و شور پایا جاتا ہے، نہایت خوش رنگ سراپا بیان کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں کشش، جاذبیت، تغزل، نادر تشبیہات کے ساتھ ساتھ خوبصورت خیالات و افکار بھی پائے جاتے ہیں۔

جب ہم خیالی کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے انھیں ایک اعلی مقام پر پاتے ہیں، یہ دعوی تو نہیں کیا جاسکتا کہ وہ مثنوی میں میر حسن سے بہتر ہیں یا رنگ تغزل میں مومن و غالب کے ہی ہم پایہ ہیں، ہاں وہ ان کے ہم رنگ و ہم فکر نظر آتے ہیں اور شاعری میں بھی اپنا ایک مخصوص مقام ضرور رکھتے ہیں، ایک منفرد اسلوب اور لب و لہجہ کے شاعر ہیں جو شاعری میں ہر ایک کا جداگانہ ہوتا ہے، شاعری میں خصوصاً ہم فکر و ہم پایہ شعرا کے درمیان کمتر یا بہتر، اعلی تر یا فروتر کے تبصرہ سے گریز کرتے ہوئے یہ سمجھنا بہتر ہوگا کہ ہر ایک شاعر کا اپنا منفرد رنگ ہوتا ہے، اپنا اپنا لہجہ و اسلوب ہوتا ہے، ہر ایک کے فکر و نظر نیز شعر و ادب کا سانچہ و ڈھانچہ جداگانہ ہوتا ہے، کشش، جاذبیت، اسلوب، سادگی و پرکاری تشبیہات و استعارات کا استعمال، صنائع و بدائع،

ندرت خیال، بلند پروازی و بلند حوصلگی، احساسات کا بانکپن، حسن سراپا کا انداز بیان ہر میدان میں ہر شاعر کا اپنا طریقہ اور اپنا انداز ہوتا ہے، غرضیکہ 'زبان اپنی اپنی خیال اپنا اپنا' ہر پھول کا رنگ جدا ہوتا ہے، ہر پھول میں ایک مخصوص کشش، خوشبو، رنگ و روغن، اور جاذبیت ہوتی ہے۔ تو کوئی بہتر یا کوئی فروتر کیوں کر ہوا؟ جیسا کہ شاعر کہتا ہے۔

گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینت چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

اس تمہید کے بعد یہی کہنا ہے کہ حکیم سید فخرالدین خیالی بھی خوبصورت چمن شعر وسخن کے ایسے خوبصورت و پرکشش پھول ہیں جو زینت چمن کا اہم حصہ ہیں جن سے رونق چمن میں اضافہ ہوتا ہے، یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ شعرا اگلوں کے دیوان شعر وادب نیز ان کی فکر ونظر، قافیہ و ردیف سے فائدہ ضرور اٹھاتے ہیں، خیالی کی فارسی شاعری میں یہ اثرات کچھ زیادہ ہیں لیکن اردو شاعری (ریختہ) میں یہ اثرات نہیں نظر آتے، یہ موضوع قابل مطالعہ ہے وہ کس کی شاعری سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں کیوں کہ وہ بظاہر مومن و غالب کے رنگ و آہنگ سے زیادہ ہی ہم آہنگ نظر آتے ہیں، اردو شاعری اس وقت عروج پر تھی اور شعراء کی خوبصورت کہکشاں موجود تھی اردو شاعری کا معیار بھی آج سے بہت مختلف تھا، کل تک فارسی الفاظ کا استعمال عیب نہیں خوبی تھی، آج اردو بڑی حد تک فارسی سے آزاد ہوگئی ہے یا آزاد ہونے کا عمل جاری ہے، یہ اس لیے لکھ رہا ہوں کہ خیالی کی شاعری میں اس مجبوری کو سمجھنا ہوگا کیونکہ خیالی کی شاعری میں عربی وفارسی کے الفاظ بکثرت ملتے ہیں جو ان کی علمیت، ادبیت اور زمانے کے چلن کی طرف اشارہ کرتے ہیں، انھوں نے غالب کی زمین میں بھی اشعار کہے ہیں اور مومن کی بھی تقلید کی ہے لیکن کسی کی نقالی نہیں کی صرف ان کی زمینوں اور اسلوب فکر وفن میں اشعار کہے ہیں، دیکھیے فکر میں حسن اور حسن میں بانکپن ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔

ہر اک محفل میں اپنا یار بے برگی سے مشکل ہے
درخت منتخب ہوں میں جہاں میں کشت دہقاں کا
یہ صورت پرتو صحبت سے ان شعلہ رخوں کی ہے
نمونہ بن رہا ہے تن مرا سرو چراغاں کا
سرمہ بھی چشم ناز کو اس کی گراں ہے اب
خاک نیاز کا تو گزر واں کہاں ہے اب
رہے ہم ہاتھ ہی ملتے جنوں نے پاؤں پھیلائے
نشان تار تک چھوڑا نہیں جیب و گریباں کا
جسے سمجھا تھا دل آرام جاں اے وائے بیدردی
وہ اک آتش پر کالہ ہے خرمن سوزی جل کا
زمین ہے مدفن نقش اور سینہ مخزن حسرت
دل پر آرزو بھی رشک ہے گور گریباں کا

ان کی شاعری میں رنگ حسن وعشق کی خوب صورت کشا کش اور فکر وفن کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے مومن کے عشق ومحبت کا تصور اور غالب کی بلند پروازی دونوں ہی ان کی شاعری کا اٹوٹ حصہ ہیں، کہتے ہیں۔

چشم تھی تر آہ کا لب پر دھواں
نبض تھی ساقط دل مضطر تپاں
لوٹتا تھا خاک پر بسمل کی شکل
پھرتی تھی پر آنکھ میں قاتل کی شکل
جلتا تھا اس آگ میں جس کا دھواں
دیدۂ ظاہر سے رہتا تھا نہاں

غزل ملاحظہ کیجیے۔

پاس جب تک وہ قمر آتا نہیں
دل سنبھلتا اب نظر آتا نہیں
ڈر سے اشکوں کا بھی ٹوٹا سلسلہ
سوئے مژگاں اک گہر آتا نہیں
دیدہ و دل میں تو کب کا آبسا
گھر میں وہ ظالم مگر آتا نہیں
ارمان وصل کا دل شیدا میں رہ گیا
میں عمر بھر فریب تمنا میں رہ گیا
کیا کیا دیا ہے ساتھ رفیق جنوں نے آہ
ٹوٹا جو خار دشت کف پامیں رہ گیا
مجبور چج ہے آدمی اس جی کے ہاتھ سے
دل جس پہ آیا، آیا جدھر سے پھرا، پھرا
وصل میں بھی ادب عرض بیاں مانع ہے
ہائے جو دل میں ہے وہ منہ سے نکلتا ہی نہیں
بے نشانی سے نہیں احساں کسی کا بعد مرگ
پاک ہیں یاروں کی رسم فاتحہ خوانی سے ہم
غضب کی تیزیاں کرتا ہے ابلق شب و روز
کسی سوار کا جمتا نہیں رکاب میں پاؤں
اپنے ہوتے غیر بیٹھیں ان کے پاس
یہ بھی اے دل گردش ایام ہے
حسرت برس رہی ہے مری مشت خاک پر
چادر نہ پھول کی ہے نہ شمع مزار ہے
دکھلا رہا ہے چرخ پس از مرگ رفعتیں
باد صبا کے دوش پہ میرا غبار ہے

اردو قصیدوں میں سے ایک قصیدہ کے چند اشعار پیش ہیں۔

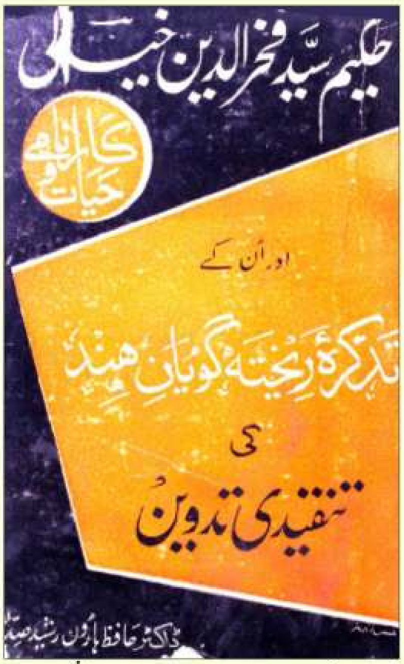

آگیا سامنے وہ بت دل و دین دشمن
رخصت اے شیخ حرم کفر ہوا تو بہ شکن
ہے تمنا کہ لکھوں اس کا سراپائے جمال
سخن حسن سے لبریز ہے آغوش دہن
زلف ہے یا شب دیجور کہ جس کے آگے
شام غربت سے زیادہ ہے رخ صبح وطن

بہرحال یہ امر مسلم ہے کہ خیالی کی اکثر تصانیف ضائع ہوگئیں اس کو ادبی دنیا کی ناقدری پر محمول کیا جاسکتا ہے کیونکہ اکثر شعری سرمایہ بھی ضائع ہونے سے بچایا نہیں جا سکا ان کی طبیعت میں نمود وریا سے گریز کے ساتھ ساتھ اخفا بھی تھا، اس لیے گمنامی نے اور ادبا کی شہادتوں سے محروم رکھا، علم دوستی کے ساتھ ساتھ ان میں انسانیت دوستی بھی تھی، اگر ان کی تاریخ بگھیل کھنڈ یا چمستان اردو یا مجربات خیالی یا دیگر کتابیں اور اشعار کا بڑا ذخیرہ موجود ہوتا تو ان کے صحیح مقام کا تعین ہوتا، تاہم اردو نثر نگاری کے جو نمونے اور اردو شاعری میں جو کلام موجود ہے وہ خود آپ کی ادبیت، علمیت اور اعلی شاعری کی بانگ دہل شہادت پیش کر رہا ہے کہ "مشک آنست کہ بوید نہ کہ عطار بگوید" لہٰذا اتنا یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک، بلند پایہ شاعر، کہنہ مشق نثار وادیب تھے جو ادبی دنیا میں اپنا صحیح مقام نہیں حاصل کر سکے۔

■

Anees Ahmad Nadwi
House No: 43, Taigore Marg
Darul Uloom Nadwatul Ulama
Lucknow - 226007 (UP)
Mob.:09450573107

آغا غیاث الرحمٰن

ودربھ میں فارسی زبان وادب کا ارتقا

موجودہ ودربھ دوقدیم علاقوں پر مشتمل ہے۔ اس کا مغربی حصہ برار کہلاتا ہے اور دوسرا مشرقی حصہ جس میں ناگپور اور اطراف کے چار اضلاع شامل ہیں گونڈوانہ کے نام سے موسوم ہے۔ لسانی اور ادبی ترویج وترقی دونوں علاقوں میں مختلف زمانوں میں ہوئی یہاں تک کہ دونوں کے وقوع ہونے میں بھی سیکڑوں برس کا وقفہ حائل ہے۔ برار عہد وسطیٰ میں ساڑھے پانچ سوسال سے زیادہ عرصے تک دکن سے منسلک رہا۔ اس عرصے میں دکن میں جو سیاسی، سماجی، ثقافتی، لسانی اور ادبی انقلابات رونما ہوئے اس کے اثرات نتیجتاً اس علاقے پر بھی مرتب ہوتے رہے۔

محمود غزنوی کی آمد (1004) کے بعد جو لسانی اثرات مرتب ہوئے وہ اس علاقے میں فارسی زبان کی ابتدا اور ترویج میں نقطہ آغاز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علاء الدین خلجی نے (1295 تا 1315) دکن کو فتح کرکے سلطنت دہلی میں شامل کرلیا اور مفتوحہ علاقوں کے انتظام و انصرام کے لیے گجرات سے دکن تک تمام علاقہ کو انتظامی حلقوں میں تقسیم کردیا اور ایک ترک افسر ہر حلقے میں مقرر کردیا۔ اس انتظامی ضرورت کے تحت بے شمار ترک خاندان اپنے متوسلین کے ساتھ گجرات اور دکن کے طول و عرض میں آباد ہوگئے۔ محمد تغلق نے (1325 تا 1351) خلجی عہد کے اس نظام حکومت کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ اسے مضبوط تر بنادیا۔ اس نے ایک فرمان جاری کیا اور دہلی کی بجائے دولت آباد کو پائے تخت بنائے جانے کا اعلان کردیا چنانچہ پوری آبادی دہلی سے دکن براہ برار منتقل ہوگئی۔

قیاس کیا جاسکتا ہے کہ خلجی نے شمالی ہند کے لاتعداد خاندانوں کو حکمراں بناکر یہاں آباد کردیا اور تغلق ساری دہلی کو یہاں لے آیا تو اس علاقہ میں تہذیبی، معاشرتی اور لسانی سطح پر کس قدر تبدیلیاں رونما ہوئی ہوں گی اور کتنا زبردست انقلاب برپا ہوا ہوگا۔ ان واقعات نے شمالی ہند کی تہذیب اور زبانوں کو اس علاقے میں رائج کردیا۔ دہلی سے جو زبانیں منتقل ہوئیں وہ کھڑی بولی، برج، ترکی اور فارسی زبانیں تھیں جو یہاں کی مقامی بولیوں اور زبانوں دکنی اور مراٹھی کے ساتھ مل کر آزادانہ طور پر ترقی کرتی گئیں اور ایک دوسرے کو متاثر بھی کرتی رہیں۔

فاتحین کی اہم زبان فارسی تھی۔ سرکاری محکموں اور عدالتوں کی زبان بھی فارسی ہی رہی اور اس کی یہ حیثیت 1856 تک برقرار رہی۔ صوفیوں اور بزرگوں نے اسے تبلیغ دین کا ذریعہ بنایا اور رفتہ رفتہ یہ زبان ادبی سطح پر بھی استعمال ہونے لگی۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جو زبان پانچ سوسال تک کسی علاقے کی سرکاری زبان رہی ہو اس کا تسلط اور اثرات کس قدر مضبوط ہوچکے ہوں گے۔ چنانچہ فارسی زبان اور تہذیب کے اثرات اس علاقے میں ہر شعبہ حیات پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اپنی تالیف 'مراٹھی زبان پر فارسی کا اثر' میں نہ صرف مراٹھی زبان پر بلکہ عوام وخواص کی زندگی کے ہر پہلو پر مرتب ہوئے ان اثرات کو واضح کیا ہے۔ بابائے اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی برتاؤ، آپس کے میل جول اور تعلقات، ربط وضبط اور رواداری کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:

ان تعلقات کا اثر جہاں تمدن کے مختلف شعبوں پر پڑا وہاں زبان کیونکر بچ سکتی تھی۔ یہ قاعدہ ہے کہ جب دو قوموں کا اتصال ہوتا ہے تو جس قوم کا تمدن اعلیٰ، زیادہ قوی اور پائدار ہوتا ہے، اس کا اثر دوسری قوم پر جو کم متمدن ہے زیادہ ہوتا ہے۔ مسلمان جب دکن میں آئے تو بمقابلہ یہاں والوں کے زیادہ متمدن تھے اور یہی وجہ ہے کہ مرہٹوں پر مسلمانوں کے تمدن کا زیادہ اثر ہوا۔ خصوصاً ایسی صورتوں میں فاتح کا اثر مفتوح پر زیادہ ہوتا ہے اور اسی وجہ سے فارسی زبان کا اثر جو فاتحوں کی زبان تھی، مرہٹی پر بہت زیادہ ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرہٹی زبان میں سیکڑوں عربی، فارسی الفاظ اور محاورے داخل ہوگئے پیشواؤں کے زمانے کی زبان دیکھی جائے تو اس میں فقرے کے فقرے اور جملے کے جملے فارسی کے ملیں گے۔

مولوی عبدالحق نے عہد بہ عہد، مکتوبات گزارشات اور کتبات کی مثالیں دے کر فارسی کے مراٹھی زبان پر اثرات کو واضح کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مراٹھی کے متعصب ادبا اور ماہر لسانیات اس علاقہ کی مراٹھی کو معیاری نہیں سمجھتے اور اسے محض ویدربھیہ بولی سے زیادہ کا درجہ نہیں دیتے۔

ودربھ میں فارسی کے کثرت استعمال اور مراٹھی کے تسلط کے اسباب بیان کرتے ہوئے مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ:

تقریباً تمام سرکاری دفاتر میں فارسی رائج تھی۔ سرکاری علاقوں میں مرہٹے کثرت سے تھے بوجہ ملازمت انھوں نے فارسی سیکھی یا ان کی زبان پر فارسی الفاظ چڑھے ہوئے تھے اور وہ بے تکلف ان کا استعمال کرتے تھے۔

سرکاری دفاتر میں اپنے معاملات کی خاطر آنے والوں اور عدالتوں میں مقدمات کی پیروی کرنے والوں کی زبانوں پر بغیر کسی ارادہ کے فارسی الفاظ آجاتے اور وہ ان کی زبان میں داخل ہوجاتے تھے۔ مسلمان فقراء جوگاؤں گاؤں اور قصبوں میں مانگتے، کھاتے پھرتے، اگرچہ وہ مقامی زبان بولتے اور ہندوانہ گیت گاتے تھے لیکن فطری طور پر ان کی زبان پر فارسی الفاظ آہی جاتے تھے۔ درویش اور صوفی مذہب اور مسلک کی تبلیغ واشاعت کرتے ان میں مضامین کی نوعیت سے عربی اور فارسی کے الفاظ استعمال ہوہی جاتے تھے۔ دنیا کی طمع اور اغراض کی خاطر، میل جول اور ارتباط کی وجہ سے تبدیلی مذہب اور بین المذاہب شادی بیاہ کرنے سے بھی فارسی زبان کا چلن بڑھتا گیا۔

سرکاری ملازمتوں کے لیے فارسی کا جاننا ضروری تھا۔ اس ضرورت کی خاطر بھی لوگ فارسی سیکھنے کے لیے مجبور تھے۔ فارسی زبان کی شیرینی اس کی نزاکت ولطافت کی وجہ سے اور اپنے طبعی ذوق کی تسکین کے لیے بھی لوگ اسے بولتے اور برتتے تھے۔

مسلمانوں کے ساتھ جو فنون اور صنعتیں یہاں آئیں ان کے مخصوص الفاظ بھی ان کے ساتھ آئے اور رائج ہوگئے۔ جو لوگ فارسی جانتے تھے ان کا طریقہ گفتگو، طرز ادا، لباس اور انداز فارسی زبان وتہذیب کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ یہ لوگ شرفا اور تعلیم یافتہ تھے عام لوگ بھی بطور فیشن ان کا انداز اختیار کرنے لگے۔ اس طرح رفتہ رفتہ پورے علاقہ کی تہذیب اور معاشرہ فارسی کے زیر اثر آگیا۔ اس علاقے کے کتبات، سکہ جات، کتب خانے، مکتوبات وملفوظات، تاریخی قطعات، تراجم، شعری ونثری تصنیفات وتالیفات اور شعرا وادبا کا مختصر جائزہ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے تاکہ ودربھ میں فارسی زبان وادب کی ترویج وارتقاء کی تصویر واضح ہوجائے۔

کتبات:

کتبات کسی علاقہ کی تاریخ، زبان وادب، شاعری، علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کے اظہار کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اس علاقہ میں تاریخی عمارات، مساجد، فصیل

سرکاری دفاتر میں اپنے معاملات کی خاطر آنے والوں اور عدالتوں میں مقدمات کی پیروی کرنے والوں کی زبانوں پر بغیر کسی ارادہ کے فارسی الفاظ آجاتے اور وہ ان کی زبان میں داخل ہوجاتے تھے۔ مسلمان فقراء جوگاؤں گاؤں اور قصبوں میں مانگتے، کھاتے پھرتے، اگرچہ وہ مقامی زبان بولتے اور ہندوانہ گیت گاتے تھے لیکن فطری طور پر ان کی زبان پر فارسی الفاظ آہی جاتے تھے۔ درویش اور صوفی مذہب اور مسلک کی تبلیغ واشاعت کرتے ان میں مضامین کی نوعیت سے عربی اور فارسی کے الفاظ استعمال ہوہی جاتے تھے۔

اور مقابر پر بے شمار کتبات پائے جاتے ہیں۔ یہ تمام کتبات فارسی زبان میں ہیں۔ کہیں نثر میں ہیں اور کہیں منظوم ہیں۔ ان سے اس علاقہ میں فارسی کی مقبولیت، اہمیت اور اس کے اثرات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ شہر ایلچپور کے علاوہ دیگر تاریخی مقامات ملکاپور، فتح کھیڑلہ، پنچ گوہان، روہن کھیڑ، راجور، جلگاؤں، جامود، رسول پور، بالاپور، آکوٹ، کارنجہ، منگرول پیر، پاتور، آشٹی، آمنیر اور ناگپور وغیرہ مقامات پر بھی کتبات پائے جاتے ہیں۔ محکمہ آثار قدیمہ ہند ناگپور نے ان کے نقوش کو محفوظ کرلیا ہے۔

ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین ربانی نے اپنی کتاب اچل پور: تاریخ وثقافت میں ایک مضمون اچل پور کے کتبات پر لکھا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً 75 کتبات یہاں موجود ہیں۔ انھوں نے اپنے مضمون میں کتبات کی سیاسی، تاریخی، ثقافتی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے اقوام کے عقائد، رواداری، قومی یکجہتی اور اس زمانہ کے فن خطاطی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

سکّہ جات:

کتبات کی طرح سکے بھی اپنے عہد کی تاریخ، ثقافت اور زبان کی طرف نشاندہی کرتے ہیں۔ عمادشاہی دور میں ایلچ پور میں سکے ڈھالنے کے لیے ایک ٹکسال (دارالضرب) قائم کیا گیا تھا۔ یہاں کے ڈھلے سکوں پر حکمرانوں کے نام، سنہ اجرا، کوئی نشان یا کلمہ وغیرہ ہوتا تھا۔ یہاں کے مضروب سکوں پر فارسی تحریر پائی جاتی ہے۔ جو یہاں فارسی زبان کی اہمیت اور اس کے چلن کا ایک اور ثبوت پیش کرتی ہے۔

کتب خانے:

ایلچپور کی جامع مسجد کے قدیم کتب خانے میں مطبوعہ کتب کے علاوہ 122 مخطوطات بھی ہیں۔

ڈاکٹر سید عبدالرحیم نے اس کتب خانہ کے مخطوطات کی وضاحتی فہرست مرتب کی ہے اور اسے جامع مسجد ایلچپور کا ایک نادر کتب خانہ کے عنوان سے شائع بھی کرادیا ہے۔ ان مخطوطات میں اردو کے 12، عربی کے 115 اور فارسی کے 95 مخطوطے ہیں۔

خانقاہ نقشبندیہ بالاپور کا کتب خانہ اپنے ذخیرہ کے اعتبار سے سب سے بڑا کتب خانہ ہے۔ اس میں فارسی، عربی اور اردو کی ہزاروں مطبوعہ کتابیں موجود ہیں ان کے علاوہ چند مخطوطے بھی ہیں۔ پروفیسر سید عبدالرحیم نے خانوادۂ عنایت الٰہی نقشبندی بالاپور کے علمی کارنامے میں اس کتب خانہ کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ یہاں زیادہ تر مخطوطات اسی خانوادہ کے بزرگوں کی تالیفات اور تصنیفات پر مشتمل ہیں اس کتب خانہ میں علاقائی ادب پر شائع ہونے والی سبھی مطبوعہ کتابیں موجود ہیں۔ ناگپور میں صدر مسلم لائبریری، کھٹکھٹے لائبریری اور کامٹی میں محمد ظہیر وارثی، ناگپور میں ڈاکٹر شرف الدین ساحل اور جلگاؤں جامود میں ڈاکٹر محمد سعداللہ کی ذاتی لائبریریوں میں بھی مطبوعہ کتب کا بڑا ذخیرہ ہے جس میں فارسی کتب بھی شامل ہیں۔ کھٹکھٹے لائبریری بند ہوچکی ہے اس کا سرمایہ کتب بھی منتشر ہوچکا ہے۔ ان کے علاوہ علاقہ میں خانگی لائبریریاں بھی موجود ہیں۔

مکتوبات/ملفوظات:

حضرت داداحیات قلندر (م: 1253) فارسی میں آپ کے ملفوظات کا ایک ضخیم مخطوطہ موجود تھا۔ آپ کے ایک معتقد ملفوظات کا اردو ترجمہ کروانا چاہتے تھے اس غرض سے وہ ملفوظات لے کر چلے گئے بعد میں مفقود ہوگئے (تذکرہ حضرت شاہ سید بدرالدین عرف دادا حیات قلندرؒ، مرتبہ ڈاکٹر سید عبدالرحیم اور ڈاکٹر ظفر پٹیل)

حضرت شاہ غلام حسین ایلچپوری کے مکتوبات ڈاکٹر سید عبدالرحیم نے مرتب کرکے مسودہ تیار کرلیا تھا، شائع نہ کراسکے، اسی دوران حضرت کا انتقال ہوگیا۔ مسودہ ان کی لائبریری میں موجود ہے۔

قطعات تاریخ:

تعمیرات، تصنیفات اور وفیات وغیرہ پر قطعہ تاریخ کہنے کا یہاں بھی قدیم رواج تھا۔ چنانچہ ایسے قطعات تاریخ مختلف تذکروں اور تاریخی کتب میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ تمام قطعات فارسی میں کہے گئے ہیں۔

فارسی علما، شعراء، ادباء، تالیفات اور تصنیفات:

احمد شاہ ولی بہمنی کے عہد (1422) میں ایک عالم اور شاعر شیخ آذری کی یہاں آمد کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے گاول گڑھ کی تعریف میں فارسی میں ایک قصیدہ لکھا۔ نظام شاہی عہد میں برہان نظام شاہ کے دور میں ایک عالم اور شاعر خواجہ محمد دہدار فانی کو برار کا ناظم مقرر کیا گیا۔ فانی بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے۔ جمیل جالبی نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ دکن میں جو فارسی رجحان غزل کی شکل میں ابھرا۔ فانی اس کے نمائندہ شاعر تھے۔ انھوں نے اردو غزل کو فارسی کا اسلوب دیا۔ فانی کی مختلف اصناف پر 37 تصنیفات کا پتہ چلتا ہے۔ وہ صاحب دیوان شاعر تھے لیکن ان کا دیوان دستیاب نہیں تذکروں میں اردو، فارسی کے اشعار ملتے ہیں۔ البتہ فارسی نثری تخلیقات مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

فانی کے والد خواجہ محمود عیانی دہدار علوم وفنون اور تصوف وعرفان میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ انھوں نے علم جفر، تکسیر وتصوف پر متعدد کتابیں لکھیں۔ کاروان ہند جلد دوم تالیف احمد گلچیں معانی میں تقی اوحدی مولف عرفات العاشقین کے حوالے سے ان کے حالات درج ہیں۔ ان کی نظم ونثر کے رسائل کا ذکر بھی کیا ہے۔ ان میں حل الرموز، نظم شرح الکموز، آثار الاطوار وغیرہ شامل ہیں۔ ان کا مدفن وور بھ (برار) میں ضلع بلڈانہ میں ہے۔ عیانی فارسی کے جید عالم، خوش گو شاعر اور علوم متداولہ پر کامل دستگاہ رکھتے تھے۔

سندھی علما:

عہد مغلیہ میں ہمایوں کے زمانہ (1543) میں سندھی علماء کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ جو یہاں درس وتدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔ ان میں اکثر صاحب تصنیف اور تالیف گزرے ہیں اور بعض نے فارسی شاعری میں طبع آزمائی بھی کی ہے ان میں شیخ طاہر، شیخ قاسم، شیخ محمد طیب، شیخ مبارک، شیخ اسحٰق، شیخ عثمان، مسیح الاولیاء شیخ عیسیٰ جند اللہ جندی، شیخ سلیمان سیفی، ان علماء کرام کے تفصیلی حالات درج ذیل کتب میں دیکھے جاسکتے ہیں:

(1) تاریخ اولیاء کرام برہانپور بشیر محمد خاں، (2) گلزار ابرار غوثی شطاری مانڈوی، (3) برہانپور کے سندھی اولیاء سید مطیع اللہ راشد، (4) اچل پور کے سندھی اولیاء ڈاکٹر سید عبدالرحیم۔

خانوادہ عنایت اللّٰہی بالاپور:

خانقاہ نقشبندیہ بالاپور کے بزرگوں کا علمی روحانی فیض اس علاقہ میں ایک عرصہ تک جاری رہا۔ اس خاندان کے بزرگوں کے حالات خانوادہ عنایت اللّٰہی نقشبندی بالاپوری کے علمی کارنامے ڈاکٹر سید عبدالرحیم میں تفصیل سے درج ہیں۔ اس کے علاوہ عنایت اللّٰہیہ سید شمس الدین، بقیہ عنایت سید شاہ محمد خلیل اللہ، تذکرۂ اولیاء دکن مولوی عبدالجبار خان ملکاپوری کے علاوہ اور کئی تذکروں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان بزرگوں میں بھی صاحب علم وکمال بزرگ گزرے ہیں۔ ان میں سے بعض صاحب تصنیف وتالیف بھی تھے اور بعض اردو اور فارسی کے اچھے شاعر بھی تھے۔ مثلاً سید ظہیر الدین، سید مجد الدین، سید قمر الدین، سید نور الہدیٰ، سید شمس الدین، سید شاہ محمد خلیل اللہ، سید شاہ منتجیب الدین جنتی، سید نور الاصفیاء وغیرہ

آقا محمد امین وفا فارسی کے جید عالم تھے۔ شعر گوئی اور انشاء پردازی کے علاوہ حدیث وفقہ ومعقولات پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ شیخ غلام مصطفیٰ انسان، محمد ماہ محرم، نور الدین علی خان رنگین، خواجم قلی خاں موزوں، شیخ نور العین عاصی، شیخ محمد عاصی، خواجہ ایوب، جان محمد رسا، مرزا عطاضیا، نصیر الدین خان دانا، سید محمد درویش درسی، مبارک خاں مبارک، میر عبدالحی خان صارم، غلام قادر سامی، شاہ غلام حسین ایلچپوری، مرزا دین محمد بیگ اعزاز، قاضی خواجہ محمد ناقص ملکاپوری، میر شمس الدین فیض، امجد حسین امجد وغیرہم ان شعرا کا کلام فارسی کے مختلف تذکروں میں دستیاب ہے۔

ناگپور اور اطراف:

دوسری طرف مشرقی خطہ گونڈوانہ ہے۔ اس خطہ میں ناگپور اور اطراف کے اضلاع شامل ہیں۔ اس علاقہ کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے لکھا ہے:

سولہویں صدی تک یہ علاقہ غیر آباد تھا۔ مشہور مورخ عبدالحمید لاہوری نے سب سے پہلے اس کا ذکر بادشاہ نامہ میں کیا ہے۔ گونڈ راجہ بخت بلند نے اٹھارویں صدی عیسوی میں اس شہر کی بنیاد ڈالی اور اپنا پائے تخت دیوگڑھ سے ناگپور منتقل کردیا۔ جو قافلہ یہاں آکر آباد ہوا اس میں بہت سے مسلمان امرا، حفاظ اور معمار شامل تھے۔ ان کے ذریعہ اور زبانوں کے علاوہ اس علاقہ میں فارسی کا بھی رواج ہوا۔ 1792 میں لالہ پیم چند نے شاہنامہ فردوسی کو اردو میں نظم کیا۔

ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد دکن کی طرف سے متعدد مسلمان سپاہی یہاں آکر آباد ہوگئے۔ برار سے بھی مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ 1818 تا 1853 تلاش معاش میں یوپی اور میوات سے آئے ہوئے ہزاروں خاندان یہاں آباد ہوگئے۔ ان نووارد مسلمانوں میں کئی صاحب علم بھی تھے جن کی فارسی استعداد اچھی تھی۔ ناگپور کا مسلم معاشرہ میں ڈاکٹر ساحل نے ریذیڈنٹ رچرڈ کی رپورٹ 1827 کے حوالے سے لکھا ہے کہ دیگر زبانوں کے اسکولوں کے ساتھ فارسی کے دو اسکول بھی قائم کیے گئے اور 128 اساتذہ فارسی کی تعلیم پر مقرر کیے گئے۔ چنانچہ یہاں فارسی کے رواج اور استعمال میں تیزی آتی چلی گئی۔ دکن کے شاعر عاصی ناگپوری جنھیں ناگپور کا پہلا شاعر بھی خیال کیا جاتا ہے انھوں نے فارسی تصنیف قصص الانبیا کا دکنی زبان میں ترجمہ کیا۔ یہاں کے مزارات پر فارسی کتبوں کی کثرت سے اس کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے علاقے میں فارسی زبان وادب پر چار کتابیں تصنیف کی ہیں (1): برار کی تمدنی وعلمی تاریخ (2001) جس میں برار میں مسلم عہد حکومت میں فارسی کے شعرا کا سیر حاصل ذکر ہے نیز گونڈوانہ میں فارسی کی ابتدا اور ارتقاء کی تاریخ بھی بیان کی ہے۔ (2) ناگپور میں فارسی (2002) ناگپور میں فارسی زبان وادب کے جو ماہرین اور ادباء وشعرا گزرے ہیں ان کا جامع تذکرہ ہے۔ (3) خاقانی شروانی (2002) خاقانی کی حیات وشاعری پر ایک وقیع اور جامع کتاب ہے جس کی مشاہیر وادبا نے کافی پذیرائی کی ہے۔ (4) غمگین ناگپوری (2012) مولانا غلام رسول غمگین انیسویں صدی کے ایک زبردست عالم، انشاپردازا ور شاعر تھے۔ اس کتاب میں ان کے حالات زندگی اور کلام موجود ہے۔

اس علاقہ میں فیض احمد فیض بھی فارسی کے زبردست عالم اور شاعر گزرے ہیں۔ آپ کے کہے فارسی تاریخی قطعات اکثر مقامات پر کندہ کیے ہوئے ملتے ہیں۔ اسی طرح محمد امجد، فیض الدین خان فیض، ناصر خاں حشمت، عباس علی شہرت، غلام قادر خاں زلفی اور وحشی بھی اس علاقے میں فارسی کے شعرا گزرے ہیں۔

وور بھ میں شعری تخلیقات کے مقابلے میں نثری تخلیقات کم ملتی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ قدیم نثر نگاروں کی تخلیقات ضائع ہوچکی ہوں جیسا کہ عام طور پر اس علاقے کا ادبی سرمایہ ناقدری کی نذر ہوکر ضائع ہوچکا ہے۔ عبدالجبار خاں ملکاپوری نے تذکرہ شعراء دکن جلد اول میں لکھا ہے کہ:

مرزا دین محمد بیگ اعزاز برار کے فارسی کے اچھے ادیب تھے۔ آپ فارسی نظم ونثر عمدہ لکھتے تھے۔ نظم میں اعزاز تخلص کرتے تھے اور نثر میں راست گفتار آپ صاحب التالیف والتصنیف تھے۔ یہ کتابیں آپ کی تالیفات ہیں۔ اخلاق محمدی، شاہنشاہ نامہ، فتاویٰ نسائی، عجائب الکلمات، مراۃ الخصائل اور دیوان غیر مرتب۔ یہ کتابیں

میرے کتب خانہ میں تھیں افسوس کہ موسیٰ ندی کی طغیانی میں غرق آب اور نذر سیلاب ہوگئیں۔

دوسری جگہ تذکرۂ اولیاء دکن حصہ دوم میں عبدالجبار خان نے لکھا ہے کہ:

برار کے ایک عالم محمد فقیر علی خاں جنھوں نے ایک رسالہ تصوف میں بہ زبان فارسی تصنیف کیا تھا۔ وہ بھی سیلاب کی نذر ہوگیا۔ اس طرح یہاں کے ادبی سرمایہ کے تلف ہوجانے کی اور کئی مثالیں مل سکتی ہیں۔

صوفی نے تذکرۂ شعراء دکن میں صوبہ برار کے دیوان سراج الدین سراج کا ذکر کیا ہے جو فارسی اور ریختہ میں شاعری کرتے تھے۔ خواجہ نعمت اللہ ہروی کی تالیف تاریخ خاں جہانی ومخزن افغانی سب سے پہلی فارسی نثری کتاب ہے جس کی ابتدا ملکاپور میں کی گئی۔ خواجہ محمد دہدار فانی کی اب تک فارسی کتب کا پتہ چلتا ہے، جو مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ شاہ غلام حسین ایلچپوری کے مکتوبات غیر مطبوعہ موجود ہیں۔ جنھیں سید عبدالرحیم صاحب نے مرتب کردیا ہے، خانوادۂ نقشبندیہ بالاپور کی تصنیفات کا ذکر کردیا گیا ہے۔ ڈاکٹر آفتاب احسن مولف تاریخ فارسی نویسی درہندوپاکستان میں ایک کتاب مجمل مفصل کا ذکر ہے۔ جو دنیا کی تاریخ پر مشتمل ہے اس کا مرتب محمد براری امی ہے۔ مولف نے لکھا ہے کہ مرتب نے جو حالات درج کیے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مورخ برار کا ہوگا۔ ابوالفتح ضیاء الدین محمد عرف سید امجد حسین خطیب نے برار کی ادبی، سیاسی اور معاشرتی تاریخ پر ایک ضخیم کتاب تاریخ دکن الملقب بہ ریاض الرحمٰن المعروف بہ تاریخ امجدی مرتب کی ہے جو شائع ہوچکی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی چراغ برار کے نام سے خود مرتب نے کیا ہے۔ برار کے قدیم ادب پر تحقیق وجستجو کرنے والوں کے لیے اس کتاب سے استفادہ کرنا ناگزیر ہے۔ فارسی نثری ادب کے مختلف موضوعات پر ڈاکٹر سید نعیم الدین، ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی، ڈاکٹر عبدالرب عرفان، زرینہ ثانی، ڈاکٹر مدحت الاختر، ڈاکٹر شرف الدین ساحل، ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط، ڈاکٹر شائستہ جاوید نے فارسی موضوعات پر 15 مضامین لکھے اور کتابیں مرتب کی ہیں۔ عبدالرب عرفان کے فارسی موضوعات پر تقریباً مضامین اور دو مضامین بہ زبان فارسی شائع ہوچکے ہیں۔ ان کی ایک کتاب داراشکوہ اپنی نگارشات کے آئینے میں بھی شائع ہوچکی ہے۔ ڈاکٹر خواجہ ربانی کی ایک کتاب اکبر کے عہد میں فارسی تاریخ نویسی شائع ہوئی ہے۔ سید عبدالرحیم کی فارسی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔ آپ کی فارسی خدمات کے صلہ میں صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے پریسیڈنٹ ایوارڈ بھی تفویض کیا گیا۔

ودربھ میں 1900 کے بعد فارسی میں شعروسخن کا سلسلہ جاری رکھنے والوں میں نواب عبدالوحید غازی، مولانا اکبر علی اکبر، یعقوب ساقی، خورشید علی خورشید، کا شمار ہے۔ بغدادی بیگم، خورشید آرا بیگم، پروفیسر غلام مصطفیٰ خاں، منظور حسین شور علیگ کا شمار فارسی کے ادباء وشعرا میں کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ پاکستان منتقل ہوگئے۔ فارسی زبان وتہذیب کو زندہ رکھنے والوں میں چند نام بطور خاص لیے جاسکتے ہیں۔ جو خط وکتابت میں اور اپنی گفتگو میں کثرت سے فارسی اشعار اور فقرے لکھتے اور بولتے تھے۔ ان میں حبیب الرحمٰن صدیقی، پروفیسر آغا حسن عابدی، میر غلام احمد حسن، ضیاء الحق خاں، حفیظ اللہ خان بدر، خلیل شارق، ظہیر وارثی کامٹوی وغیرہ۔

ودربھ میں فارسی کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام مختلف کالجوں اور انسٹی ٹیوٹ میں ہے۔ ناگپور میں فارسی ڈپارٹمنٹ کو قائم ہوئے تقریباً سو سال سے زیادہ کا عرصہ ہوچکا ہے۔ اس میں ایم اے تک کی تعلیم کا انتظام ہے۔ ڈاکٹر خالدہ نگار، پروفیسر رئیس انصار اور ڈاکٹر قمر جہاں فارسی کی پروفیسرس ہیں۔ یہاں فارسی میں ڈاکٹر آف فلاسفی Ph.D. کی ڈگری حاصل کرنے کی سہولت ہے۔ اس وقت تک تقریباً بیس ریسرچ اسکالرس کو پی ایچ ڈی کی سند تفویض کی جاچکی ہے۔ ڈاکٹر نورالسعید اختر نے فارسی میں ڈی لٹ کی ڈگری بھی حاصل کی ہے۔ انھیں بھی صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے فارسی خدمات کے لیے پریسیڈنٹ ایوارڈ حاصل ہوا ہے۔ سنت گاڈگے مہاراج یونیورسٹی امراؤتی کے مختلف کالجوں میں گریجویشن تک فارسی تعلیم کا انتظام ہے۔ اس طرح ودربھ نہ صرف یہ کہ فارسی کا قدیم مرکز رہا ہے بلکہ موجودہ زمانہ میں بھی فارسی تعلیم کا پورے مہاراشٹر میں ایک اہم مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔

ماخذ:

1- برار کی تمدنی وعلمی تاریخ، ڈاکٹر شرف الدین ساحل
2- تاریخ ادب اردو (جلد اول)، از سیدہ جعفر وگیان چند، مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی، 1998، ص 154 تا 159
3- تاریخ ادب اردو (جلد اول)، از جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1977
4- تاریخ ادب اردو (جلد اول)، علی گڑھ، مرتبہ ڈاکٹر نذیر احمد، اردو ادب عادل شاہی دور میں، ص 246: تا 248
5- تذکرۂ ید بیضا مولفہ آزاد بلگرامی
6- حقیقت سورت مولفہ شیخو میاں، مطبع شبانی ممبئی، ص 71
7- سرو آزاد مولفہ آزاد بلگرامی در مطبع فانی رفاہ عام فانی لاہور، (1913)
8- شام غریباں، ص 187-186
9- صبح گلشن، ص:
10- فہرست شکوۃ جلد سوم، ص 257: تا 261
11- کاروان ہند (جلد دوم) مولف احمد گلچیں معانی مشہور (ایران) 1369ھ، ص 985:
12- گلدستہ صنمائے سورت مولفہ شیخ بہادر عرف شیخو میاں شہابی ممبئی، ص 71
13- گجرات کے مشاہیر علماء، ڈاکٹر محمد زبیر قریشی، 1996، ص 28: تا 43
14- محبوب الزمن تذکرۂ شعراء دکن (حصہ اول)، مولفہ عبدالجبار خاں ملکاپوری، مطبع رحمانی حیدرآباد، 1329ھ، ص 887
15- نزہۃ الخواطر (جلد پنجم)، مولف سید عبدالحیٔ، ص 570
16- فانی کی تصنیفات جو پیر محمد شاہ لائبریری احمد آباد میں موجود ہیں۔
17- برار کی تمدنی وعلمی تاریخ، ڈاکٹر شرف الدین ساحل، 2001
18- ناگپور میں فارسی، ڈاکٹر شرف الدین ساحل، 2002
19- خاقانی شروانی، ڈاکٹر شرف الدین ساحل، 2002
20- غمگین ناگپوری، ڈاکٹر شرف الدین ساحل، 2012
21- عادل ناگپوری: شخص، شاعر، نثر نگار، ڈاکٹر شرف الدین ساحل، 2012

Dr. Agha Ghayasur Rahman
Gulsistan Colony, Near Panday Amrai Lane
Nagpur - 440013

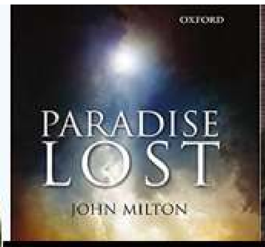

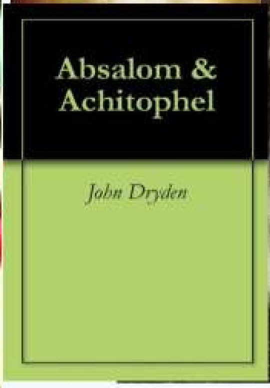

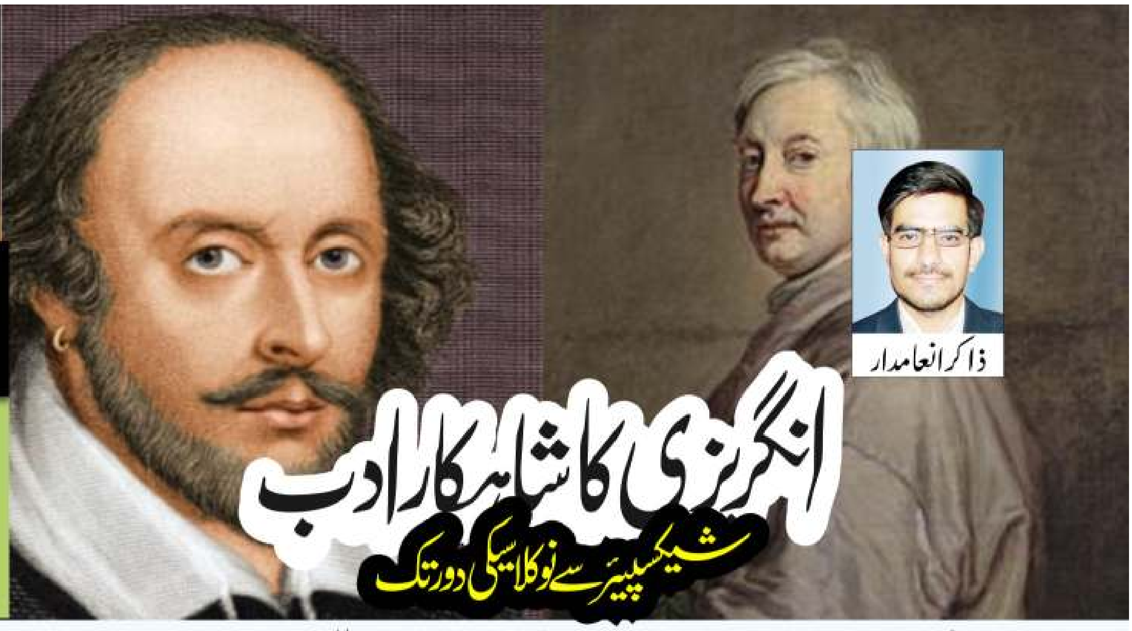

ڈاکٹر انعامدار

انگریزی کا شاہکار ادب

شیکسپیئر سے نوکلاسیکی دور تک

کسی بھی دور کے ادب کو اس دور کے حالات سے جوڑ کر دیکھا جاتا ہے۔ وہ کون سے مخصوص حالات تھے جن میں وہ ادب لکھا گیا اور اس فن پارے پر ان مخصوص تاریخی حالات نے کیا اثرات مرتب کیے۔ یوں تو ہر فن پارے پر اپنے زمانے کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں، لیکن بہت سے ایسے عوامل ہوتے ہیں جن سے ادب میں اتار چڑھاؤ اور تغیرات رونما ہوتے ہیں۔ اگر ہم اردو ادب کی بات کریں تو ادب کا مورخ جب ادب کی تاریخ لکھنا شروع کرتا ہے تو وہ بہت سے تاریخی واقعات کے تذکرے پر مجبور ہو جاتا ہے، جو اردو ادب کے آغاز و ارتقا کا محرک بنے، مثلاً پایہ تخت کی تبدیلی۔ پایہ تخت کی تبدیلی یہ خالص تاریخی موضوع ہے لیکن ادب میں اس واقعہ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ محمد تغلق نے اپنی وسیع و عریض سلطنت کا پایہ تخت جب دلی سے ہزاروں میل جنوب میں دکن کے ایک پرفضا مقام دولت آباد کو منتقل کیا تو بظاہر اس کا یہ فیصلہ اس کے معاصرین کے لیے اس کا پاگل پن تھا اور آج کے مورخین اس کی دور اندیشی اور ذہانت کی داد بھی دیتے ہوں، لیکن اس واقعہ نے اردو زبان و ادب کے آغاز و ارتقا میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ چند برسوں میں ہی جب پھر سے دلی دارالخلافہ کی حیثیت سے آباد ہوگئی تو دلی کے حکمرانوں نے جنوب کے انتظام کی خاطر امیران سِدّہ مقرر کیے۔ ایک وقت آیا جب یہی امیران سدہ متحد ہوئے اور انھوں نے دلی کی مرکزی حکومت کے خلاف بغاوت کرکے جنوب میں اپنی خود مختار حکومت کی بنیاد ڈالی۔ اس طرح دکن میں بہمنی سلطنت کی بنیاد پڑی۔ اردو کے ابتدائی ادب کی جڑیں بہمنی دور میں دکھائی دیتی ہیں۔ بہمنی عہد میں ہی نظام بیدری نے اپنی مشہور زمانہ مثنوی ''کدم راو پدم راو'' لکھی۔ جب یہ سلطنت پانچ حصوں میں تقسیم ہوئی تو قطب شاہی اور عادل شاہی جیسی طاقتور اور طویل مدت تک دکن میں حکمرانی کرنے والی سلطنتیں وجود میں آئیں۔ اردو ادب کی کوئی بھی تاریخ قطب شاہی اور عادل شاہی دور کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی ہے۔

جس وقت ہندوستان میں اور خاص طور سے دکن میں اردو کے خد و خال متعین ہو رہے تھے یہاں سے سات سمندر پار برطانیہ میں انگریزی کا سنہری دور (Golden Age) چل رہا تھا، یہ ملکہ الزابیتھ کی حکمرانی کا دور تھا۔ انگریزی کے مایہ ناز شاعر اور ادیب ''ولیم شیکسپیئر'' کی پیدائش اسی سنہری دور میں ہوئی اور اس کی پیدائش کے ٹھیک ایک سال بعد ہی گولکنڈہ کے شاہی محل میں اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کی 1565 میں پیدائش ہوئی۔ محمد قلی قطب شاہ، ولیم شیکسپیئر کا ہم عصر تھا۔ دونوں نے قریب قریب ایک سی عمر پائی قلی قطب شاہ کا انتقال 1612 میں ہوا اور ولیم شیکسپیئر کا اس کے چار سال بعد 1616 میں انتقال ہوا۔

اس مضمون میں ہم جیکوبین دور، دور بحالی اور نو کلاسیکی دور کا جائزہ لیں گے۔

اگر انگریزی ادب کی بات کی جائے تو اس کو درج ذیل ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(1) عہد قدیم (450 سے 1066)
(2) وسطی دور (1066 سے 1500)
(3) نشاۃ الثانیہ (1500 سے 1660)
(4) نوکلاسیکی دور (1660 سے 1785)
(5) رومانی دور (1785 سے 1832)
(6) وکٹورین عہد اور دور جدید

عہد قدیم : اس عہد کی ابتداء سیلٹک قوم اور جرمن قبائل جیوٹ کے انگلستان میں داخلہ سے شروع ہوتی ہے اور اس دور کا اختتام 1066 میں نارمن کے انگلستان پر قبضہ پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور کی تخلیقات میں 'بے وولف' کو کافی اہمیت حاصل ہے۔

دور وسطیٰ : انگریزی کا دور وسطیٰ زبان، تمدن، طرز زندگی کے لحاظ سے انگلینڈ میں نمایاں تبدیلیوں کا دور تھا۔ اس دور کی تخلیقات عام طور سے مذہبی قسم کی تھیں۔

نشاۃ الثانیہ : ادبی نقاد اس دور کو 'دور جدید' کا آغاز کہتے ہیں۔ اس دور کو مزید چار حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

دور الزابیتھ (1558 سے 1603)
جیکوبین دور (1603 سے 1625)
کیرولائن دور (1625 سے 1649)
دور تعطل (1649 سے 1660)

ملکہ الزابیتھ کا دور انگلستان کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ 1558 میں وہ تخت نشین ہوئیں اور 45 سال کی کامیاب حکومت کے بعد 1603 میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے دور حکومت کا اہم واقعہ 1588 میں انگلینڈ کی اسپین کے ساتھ جنگ ہے۔ ان کا دور انگریزی ادب کا دور زرین کہلاتا ہے۔ 1603 میں الزابیتھ کے بعد جیمس اول راجا بنا، اس کا تعلق اسکاٹ لینڈ سے تھا۔ انگریزی ادب میں اس کے دور حکومت کو جیکوبین دور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ دور 1603 سے 1625 پر محیط ہے۔ اس کے دور حکومت کے جس واقعہ کا ادب میں تذکرہ ملتا ہے وہ 'گن پاؤڈر پلاٹ' ہے۔ یہ ایک فدائن حملہ تھا جو جیمس اول کو ہلاک کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ جیمس کی 1625 میں وفات کے بعد چارلس اول انگلینڈ کا راجا بنا۔ یہ فضول خرچ تھا اور عوام اس سے نالاں تھے۔ اس کا دور حکومت 1625 سے 1649 تک رہا۔ اس کی حکومت کے آخری دور میں پیوریٹنٹ (Puritant) نے بغاوت کی۔ پیوریٹن اصلاح پسند لوگ تھے۔ 1642 میں انگلینڈ میں سول وار ہوئی جو 1649 تک چلی، پیوریٹین کی حمایت میں آلیور کرام ویل نامی درباری آیا جس کے پاس 10 ہزار فوج تھی۔ یہ مذہب کو بہت مانتا تھا اور اس وقت کا طاقتور جاگیردار تھا۔ آخر کار پیوریٹن کو فتح حاصل

ہوئی اور راجا گرفتار ہوا اور اس کا سر قلم کردیا گیا۔ 1649 کے بعد انگلینڈ کا کوئی راجا نہیں تھا۔صرف پارلیمنٹ تھی جو پیوریٹین تھے۔انگلینڈ اور انگریزی ادب میں یہ دور 'دور تعطل' کہلاتا ہے۔ پیوریٹن 'جان کالون کی کی فلاسفی پر عمل پیرا تھے۔ انھوں نے شراب اور تفریحی مشاغل بند کردیے، ساتھ ہی ان کے دورِ حکومت میں تمام تھیٹر بند کردیے گئے۔اس سے عوام پریشان ہوگئے اور انھوں نے چارلس دوم سے درخواست کی جس نے فرانس کی مدد سے 1660 میں اس دور تعطل کا خاتمہ کیا، یہ دور ادب میں 'دور بحالی (Restoration age) کہلاتا ہے۔تمام پیوریٹنٹ کو معاف کردیا گیا ملٹن کی تمام کتابیں جلادی گئیں اور اسے بھی معاف کردیا گیا۔

نو کلاسیکی دور :

یہ دور 1660 سے 1785 پر مشتمل ہے۔اس دور کو ادبی لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

دور بحالی (1660 سے 1700)

آگسٹن دور (1700 سے 1745)

حساسیت کا دور یا جذباتیت کا دور (Sense And Sensibility) (1745، 1785)

ان تینوں ادوار کی نمائندگی کوئی نہ کوئی بڑا ادیب یا مصنف کرتا ہے۔دور بحالی کا نمائندہ 'جان ڈرائیڈن' ہے تو آگسٹن دور کا نمائندہ 'الیگزنڈر پوپ' ہے جبکہ آخری دور 'ڈاکٹر جانسن' کے نام سے موسوم ہے۔

نو کلاسیکی دور کی خصوصیات:

اس دور کی شاعری میں سروں میں کمی آگئی تھی۔

ہجو اور طنز میں اضافہ ہوگیا تھا۔

ہیروئک کپلیٹ کا بہترین استعمال ہونے لگا اور شعرا کو اس میں مہارت حاصل ہوگئی۔

قدیم یونانی اور رومی کلاسیکل انداز کی نقالی ہونے لگی۔

تخلیق کار حقیقت پسند ہوگئے اور مفروضہ اور تصوراتی چیزوں کی پیروی سے اجتناب کرنے لگے۔

یہ دور نشاۃ الثانیہ کا رد عمل تھا۔

جذبات، احساسات اور خیالی باتوں سے عدم اتفاق کیا جانے لگا۔

دلیل اور استدلال پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔

فردوس گمشدہ (Paradise lost):

فردوس گمشدہ جان ملٹن کی شاہکار تصنیف ہے۔یہ انگریزی ادب کی ایک لاجواب تخلیق ہے۔سموئیل جانسن نے اس نظم کی مدح سرائی ان الفاظ میں کی ہے۔

''ایک نظم جو ....انسانی ذہنوں کی تخلیقات کے درمیان سے، آرائش و ترتیب کے لحاظ سے اولین مقام کی دعوے دار ہے جبکہ کارگذاری کے لحاظ سے دوسرا مقام۔''

ملٹن کے سوانح نگار 'جان اوبرے' کے مطابق یہ نظم ملٹن نے 1658 میں لکھنا شروع کی (شمالی ہند کا مشہور شاعر جعفر زٹلی اسی سال نارنول میں پیدا ہوا تھا)۔واضح رہے کہ 1654 میں ملٹن پوری طرح نابینا ہو چکا تھا کم و بیش اسی دور میں ریختی کا صاحب دیوان شاعر جس نے 'یوسف زلیخا' لکھی سید ہاشمی بیجاپوری موجود تھا جو خود بھی نابینا تھا۔جان ملٹن نے اپنے مددگاروں کے تعاون سے اس کام کو پورا کیا۔اس کا پہلا ایڈیشن 1667 میں شائع ہوا۔اس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ نو کلاسیکی دور کی پہلی شاہکار تخلیق ہے۔

اس کا پس منظر عیسائی مائیتھالوجی سے متعلق ہے۔

یہ رزمیہ نظم ہے، جو نظم معریٰ کے طرز پر لکھی گئی ہے۔یہ ایک طویل ترین نظم ہے جو دس حصوں پر مشتمل ہے اور کم و بیش دس ہزار سطروں پر پھیلی ہوئی ہے۔ 1674 میں اس کا دوسرا ایڈیشن بارہ حصوں پر مزید کچھ تبدیلیوں کے ساتھ منظر عام پر آیا۔نقاد اسے جان ملٹن کی شاہکار اور معرکۃ الآرا تخلیق قرار دیتے ہیں، جس نے ملٹن کو اپنے دور کے شعرا میں سب سے اونچا مقام عطا کیا۔اس میں بائبل کے عہد نامہ عتیق سے لی گئی اس کہانی کو پیش کیا گیا ہے جس میں انسانی پیدائش اور آدم (Adam) اور حوا (Eve) کے شیطان (Satan) کے بہکانے پر جنت (Garden of Eden) سے نکالے جانے کا ذکر ہے۔

اس کی کہانی دو دائروں کے درمیان گھومتی ہے، پہلا لیوسی فر (شیطان)، دوسرا آدم اور حوا۔کہانی شروع ہوتی ہے شیطان اور دیگر فرشتوں کی بغاوت سے جنھیں شکست دے کر 'جہنم' (Hell) میں قید کردیا جاتا ہے، جس کو اس نظم میں 'ٹارٹیرس' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ 'جہنم' کے دارالخلافہ 'پینڈیمونیم' میں شیطان اپنی جادو بیانی اور خطیبانہ صلاحیتوں کا استعمال کرکے اپنے معتقدین کو متحد کرتا ہے۔میمن اور بیلز بب اس کی مدد کرتے ہیں مولاک اور بیلیل بھی ساتھ ہوتے ہیں۔بحث و مباحثہ کے بعد شیطان کے حواری دنیا کو اور خدا کی بنائی ہوئی پسندیدہ مخلوق انسان کو بگاڑنے کا عزم کرتے ہیں۔ملٹن نے نظم میں مختلف مقامات پر فرشتوں کی جنگ کی مختلف انداز میں منظر کشی کی ہے۔شیطان کے حواریوں اور نیکی کے فرشتوں کے درمیان تین دن تک جنگ چلتی ہے۔آخری معرکہ میں خدا کا بیٹا صرف ایک ہاتھ سے شیطان کے حواری باغی فرشتوں کی بہت بڑی فوج کو شکست فاش دے کر انھیں آسمانی دنیا سے باہر کردیتا ہے۔اس تطہیر کے بعد خدا دنیا کو وجود بخشتا ہے اور آدم اور حوا کی تخلیق کرتا ہے۔انھیں تمام اختیارات اور طاقت دے کر اپنی بنائی تمام مخلوقات پر حکمران مقرر کرتا ہے۔ساتھ ہی اس بات سے متنبہ کرتا ہے کہ 'علم کے درخت' کا پھل نا کھائیں۔شیطان بھیس بدل کر سانپ کی شکل میں حوا کے پاس جاکر اسے ممنوعہ درخت کا پھل کھانے پر بہلا پھسلا کر راضی کرلیتا ہے، جب آدم کو پتہ چلتا ہے کہ حوا نے ممنوعہ پھل کھا کر گناہ کرلیا ہے تو وہ بھی اس پھل کو کھا لیتا ہے۔اس موقع پر وہ اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ جب سے حوا اس کی پسلی سے پیدا کی گئی ہے وہ دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور اگر حوا مر جائے گی تو وہ بھی موت کو گلے لگا لے گا۔جب ان دونوں کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ خدا کی نافرمانی کرکے کس قدر بڑے گناہ میں مبتلا ہو چکے ہیں تو وہ بہت شرمندگی محسوس کرتے ہیں اور گڑگڑا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔ابلیس یہاں سے جہنم میں جاتا ہے اور اپنے حواریوں کو تمام حالات سے باخبر کرتا ہے کہ کس طرح وہ آدم کو بہکانے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ابھی اس کی تقریر ختم ہی ہوتی ہے کہ اس کے ساتھی سانپ کی شکل میں تبدیل ہوجاتے ہیں اور وہ خود بھی سانپ بن جاتا ہے۔ادھر میکائیل آدم کو قیامت تک انسانیت کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی جھلک دکھاتا ہے اور اسے دیکھ کر آدم بہت پریشان ہوجاتا ہے۔اس موقع پر میکائیل آدم کو 'جیسس کرسٹ' کے بارے میں بتاتا ہے اور اسے وہ راجا مسیح (King Messiah) کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔

کردار :، خدائے ذوالجلال، لیوسی فر (شیطان)، باغی فرشتے، آدم اور حوا، میکائیل، رافیل فرشتہ، خدا کا بیٹا

جان ڈرائیڈن :

جان ڈرائیڈن 1631 میں پیدا ہوا یہ وہ دور تھا جب گولکنڈہ کا درباری شاعر ملا اسد اللہ وجہی اپنی معرکۃ الآرا تصنیف 'سب رس' لکھنے میں مصروف تھا۔ڈرائیڈن انگریزی کا ایک عظیم شاعر، ڈرامہ نگار اور نقاد ہے۔مشہور انگریزی ادیب سموئیل جانسن نے اسے ''انگریزی تنقید کا باوا آدم'' قرار دیا ہے۔اردو کے مشہور نقاد جمیل جالبی اس کے بارے لکھتے ہیں کہ

'' ڈرائیڈن کی تنقیدی اہمیت یہ ہے کہ اس نے شیکسپیئر کا مطالعہ کرکے شعرا کے مخصوص مطالعہ کی بنیاد ڈالی۔بن جونسن کی Silent Woman کا مطالعہ کرکے کتابوں پر تنقید لکھنے کی طرح ڈالی۔اسی کے ساتھ ساتھ یورپ کی مختلف زبانوں کے ڈراموں اور ادبیات کا مطالعہ کرکے تقابلی مطالعہ کی بنیاد رکھی۔شیکسپیئر اور بن جانسن کا مطالعہ کرکے اس نے بتایا کہ دو شاعروں یا دو ادیبوں کا موازنہ کیسے کیا جائے؟''

جان ڈرائیڈن کا ایک اور امتیاز یہ ہے کہ اسے پہلا

درباری شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے،اس کے علاوہ اس نے انگریزی ادب میں ہیرونک کپلیٹ (مخصوص بحروں کی رزمیہ شاعری) کی بنیاد رکھی۔وہ اپنے معاصرین اور بعد کے آنے والوں کے لیے ایک رول ماڈل تھا، الیگزینڈر پوپ اس سے بہت متاثر تھا۔جان ڈرائیڈن کی اہم تصانیف درج ذیل ہیں

1۔ ہنداور پینتھر 2۔ اورنگ زیب

3۔ غرناطہ کی فتح (یاالمنصوراورالمہدی)

4۔ ہندوستانی ملکہ 5۔ اسلم اوراچیتوفیل

6۔ میک فلیکنوئے 7۔ ایسّے آن ڈرامیٹک پوئزی

8۔ ہندوستانی حکمراں

مقدس ہرن اور تیندوا(ہند اینڈ پینتھر):

یہ جان ڈرائیڈن کی طویل ترین مذہبی قسم کی نظم ہے جو 1687 میں لکھی گئی۔یہ ہیرونک کپلیٹ میں لکھی گئی ہے جس کے لیے ڈرائیڈن کی شہرت اب تک قائم ہے۔ ماگریٹ ڈاڈی نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ

''یہ دور بحالی کی ایک غیر معمولی، نا قابل فراموش، بے مثال نظم ہے ...یہ اپنی ہی نوعیت کی نظم ہے،جس کا اعادہ ممکن نہیں (اور نہ کوئی اس کا اعادہ کر سکا ہے)۔''

یہ دراصل ایک تمثیلی یا اساطیری نظم ہے۔جس میں جانور ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں۔جس طرح ملا وجہی نے اپنی' سب رس' نثری داستان کو تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے،جس کے کردار دل،نظر،عقل،وغیرہ ہیں اس نظم میں بھی مختلف عقائد کو مختلف جانوروں سے تشبیہ دی گئی ہے۔اس نظم میں تقریباً 2600 سطور ہیں۔یہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔پہلے حصے میں مختلف عقائد کو القاب سے نوازا گیا۔

'ہند'مادہ ہرن کو کہتے ہیں،خاص طور سے سرخ مادہ ہرن جس کی عمر تین برس سے زیادہ ہو۔عیسائی روایات میں ہرن کو عقیدت، پرہیز گاری،اور نیکی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ڈرائیڈن نے اپنا عقیدہ بدل کر رومن کیتھولک عقیدہ قبول کیا تھا کیوں کہ اس وقت کے انگلینڈ کے راجا جیمس دوم بھی کیتھولک تھے۔اس نے رومن کیتھولک مذہب کو دودھ کی طرح سفید ہرن (ہند) سے تعبیر کیا جبکہ چرچ آف انگلینڈ کو 'تیندوا' اور آزاد گروہ کو 'ریچھ' پروٹسٹنٹ کے ایک ذیلی گروہ 'پرلیس بائٹرینس' کو اس نے 'بھیڑیے' سے تشبیہ دی۔پروٹسٹنٹ کے دوسرے ذیلی گروہ کویکرس کو 'خرگوش' سے تشبیہ دی۔سوسینیان کو 'لومڑی' کہہ کر مخاطب کیا۔آزاد خیال لوگوں کو 'بندر' سے تشبیہ دی۔انا بپٹیسٹ کو 'جنگلی سور' کہہ کر مخاطب کیا۔

جبکہ دوسرے حصے میں ڈرائیڈن نے چرچ کے متنازع اختیارات پر بحث کی ہے اور آخری حصے میں یہ خیال پیش کیا گیا کہ انگلیکن کلیسا، شاہی اقتدار اور کیتھولک چرچ کو مل کر ایک ایسا متحدہ محاذ قائم کرنا چاہیے جو غیر مقلد کلیساؤں اور وھگ پارٹی کے مقابل ہو۔

لارڈ میکاولی نے ڈرائیڈن کے اس کام کو اس طرح سے خراج تحسین پیش کیا ہے۔

''ڈرائیڈن کی کوئی تخلیق اس قدر دلکش اور شاندار نہیں جس میں بے انتہا لچک، ملائمیت،اور زبان کی تازگی اور ایک مسرت بخش تنوع قسم کی موسیقی کا احساس ہو۔''

الیگزینڈر پوپ

الیگزینڈر پوپ 1688 میں پیدا ہوا یہ وہ دور تھا جب بیجاپور کے عادل شاہی سلطنت کا ملک الشعرا 'شیخ مخدوم نصرتی ''علی نامہ' اور' تاریخ اسکندری' لکھ چکا تھا اور اردو کے عظیم شاعر ولی دکنی اورنگ آباد میں اپنی عمر کے چالیس سال گذار چکے تھے۔پوپ کے دور جوانی میں ہندوستان میں اردو کے عظیم شاعر سودا، درد،اور میر پیدا ہوئے۔ پاپ پستہ قد،جسمانی طور پر بہت لاغر اور بیمار تھا جس کی وجہ سے وہ کبڑا ہو چکا تھا۔اس لیے سوسائٹی سے زیادہ تر الگ تھلگ رہتا۔پوپ کی اہم تخلیقات درج ذیل ہیں۔

1۔ رومانی نظمیں (The Pastorals)

2۔ ونڈسر فاریسٹ (Windsor Forest)

3۔ تنقید نگاری پر مضمون (Essay On Criticism)

4۔ زلفوں کی لٹ یا گچھا (The Rape Of The Lock)

5۔ ہومر کا ترجمہ (Homer Translation in English)

6۔ دی ڈنسیاڈ (The Dunciad)

7۔ ایسّے آن مین (Essay on man)

دی ریپ آف دی لاک :

یہ پوپ کی اہم ترین تصنیف ہے۔انگریزی ادب میں اس کی ایک خاص اہمیت ہے اور یہ اس دور سے آج تک بڑی دلچسپی سے پڑھی جاتی رہی ہے۔اس میں نفاست، نزاکت اور باریکیوں کا تذکرہ پوپ نے جس خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے وہ قابل دید ہے۔اس میں اعلیٰ طبقہ امراء و روسا کی ہجو کی گئی ہے۔یہ ایک مزاحیہ نظم ہے جسے پوپ نے اپنے ایک دوست جان کیرل کے کہنے پر لکھا ہے۔1712 میں پہلی بار شائع ہوئی تو اس میں صرف دو کینٹوس تھے اور جب 1714 میں یہ دوبارہ شائع ہوئی تو اس میں پانچ کینٹوس شامل تھے اور 1717 میں جب آخری شکل میں اس کی اشاعت ہوئی تو اس میں کلریسا کی تقریر بھی شامل کی گئی۔پوپ کا تعلق روساء کے طبقہ سے تھا۔پوپ کے ایک شناسا رئیس تھے 'لارڈ پیٹر' ان کی معشوقہ تھی' ارابیلا فرمر'،لارڈ پیٹر نے اربیلا فرمر کی زلفوں کی ایک لٹ کاٹ لی۔جس کی وجہ سے دونوں میں جھگڑا ہوا اور دونوں کے خاندان ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔اس کہانی کو پوپ نے مزاحیہ انداز میں پیش کیا۔اس نظم میں پوپ نے مافوق الفطرت عناصر کا بھی استعمال کیا ہے اور اس کو لکھنے کے لیے پوپ نے ہومر اور ماضی کی شاندار تخلیقات کی مدد لی۔یہ ایک مزاحیہ قسم کی رزمیہ نظم کی نقالی ہے (Mock Epic)۔ارابیلا فرمر کے کردار کے طور پر بیلنڈا (Belinda) کو پیش کیا گیا ہے۔جبکہ لارڈ پیٹر کا کردار دی بائرن (The Baron) کے نام سے پیش کیا گیا۔تیسرا کردار کیرل (Caryl) کا جوان دونوں کے دوست ہیں۔بلینڈا کے کتے 'شاک' کا بھی ایک کردار اس میں پیش کیا گیا ہے۔ایک خاتون کلریسا (Clarissa) کا بھی ایک اہم کردار ہے جس نے پارٹی میں بائرن کو قینچی مہیا کروائی تھی۔

اس کی کہانی کچھ اس طرح ہے کہ بیلنڈا نیند میں ہے اور اس کی ایک مددگار روح 'ایریئل' اسے بتاتی ہے کہ آج اسے تھوڑا چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔بیلنڈا بیدار ہوکر اپنی خادمہ کی مدد سے تیار ہوتی ہے اور تھیمس ندی کے ذریعہ ہیمپٹن کورٹ پیلیس جو ایک شاہی محل ہے وہاں ایک پارٹی میں شرکت کے لیے جاتی ہے۔ان رئیس لوگوں کے درمیان بائرن بھی موجود ہے جس کو بیلنڈا ٹھکرا چکی ہے۔وہ بیلنڈا کی خوبصورت زلفوں کی تعریف کرتا ہے اور دل میں یہ سوچ لیتا ہے کہ ان دو زلفوں کی لٹوں میں سے وہ ایک لٹ کو کاٹ لے گا۔لیکن اس کی کوشش کو بیلنڈا کی مددگار ارواح ناکام بنا دیتی ہیں۔آخر کار بائرن بیلنڈا کی زلفوں کی ایک لٹ کاٹنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور جب بیلنڈا کو اس بات کا احساس ہوتا ہے تو اسے شدید غصہ آتا ہے اور وہ بائرن سے لڑنا شروع کر دیتی ہے۔پوپ نے آخر میں بیلنڈا کو تسلی دینے کی کوشش کی کہ اس کی خوبصورت زلفوں کی لٹ کہیں کھوئی نہیں ہے بلکہ وہ تو جنت میں پہنچ چکی ہے۔ آخر میں کلریسا کا اخلاقی وعظ موجود ہے۔

حوالے جات:

:1 دی ورکس آف سموئیل جانسن۔مرفی آرتھر 1837)

:2 ارسطو سے ایلیٹ تک۔جمیل جالبی صفحہ 27)

:3 دی کیمبرج ہسٹری آف انگلش لٹریچر جلد 8 صفحہ 52)

:4 دی ہسٹری آف انگلینڈ فرام دی ایکسیشن آف جیمس II۔لارڈ میکاولی، جلد اول صفحہ 660

■

Dr. Zakir Inamdar
C/o Suhail Clinic, Near Ameer Ali Masjid Main Road Radapur, Taluuqa Ardhapur
Distt: Nanded - 431704 (MS)

اردو ادب اور عالمی مسائل

اسعد اللہ

ایک طرف سائنس وٹکنالوجی نے جہاں وسائل زندگی میں بے تحاشہ اضافہ کیا ہے وہیں پر عالمی مسائل بڑھے بھی ہیں لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔ دور حاضر کی تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ وسائل کی بہتات کے باوجود موجودہ دور کا انسان مسائل سے گھرا ہوا ہے۔ اس وقت انسانی آبادی کا بیشتر حصہ انتہائی پیچیدہ قسم کے مسائل میں گرفتار ہے۔ مغربی ممالک ہوں یا مشرقی، ترقی یافتہ علاقے ہوں یا پسماندہ، انسانی آبادی الجھنوں کا شکار ہے۔ عالمگیر نوعیت کے مسائل کا سامنا ساری دنیا کو ہے اور ایسا بھی نہیں ہے کہ ان مسائل کے حل کے لیے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں ہوئی بلکہ دنیا بھر کے دانشور اور بے پناہ دماغی صلاحیتوں کے حامل مفکرین اور صف اول کے مدبرین بار بار سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں اور مسائل کے حل کے لیے عالمی کانفرنسوں اور سیمناروں کا انعقاد عمل میں لایا جاتا ہے۔ تانیثیت کے حوالے سے بھی بعض مسائل ایسے ہیں جن کے حل کے لیے اقوام متحدہ سمیت چوٹی کی انجمنوں میں باقاعدہ بیٹھکیں ہوئی ہیں مگر ''نشستند، خوردند اور برخاستند'' کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ تانیثیت کے دیگر پہلوؤں پر گفتگو سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تانیثیت کیا ہے اس عقدہ پر کچھ بات ہو جائے۔

پروفیسر انور پاشا کے بقول ''تانیثیت بنیادی طور پر عہد جدید کا ایک شعوری اور آئیڈیالوجیکل تصور ہے جس کے پیچھے بطور محرک عورت کے وہ اجتماعی تجربات کار فرما ہیں جو اس نے مردوں کی بالادستی والے نظام و اقدار میں مسلسل اور مختلف سطحوں پر امتیاز و تفریق اور استحصال و نا انصافی کی شکل میں حاصل کیے ہیں۔

(اردو ادب میں تانیثیت کی مختلف جہتیں: مرتبہ صالحہ صدیقی)

''تانیثیت (Feminisim) دور جدید کی پیداوار ہے مگر مسائل کا وجود پہلے ہوتا ہے اور سمجھنے یا سمجھانے کے لیے بعد میں کچھ اصطلاحیں معرض وجود میں لائی جاتی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ نوخیز بچے کی پہلی تربیت اور اخلاقیات کا گہوارہ آغوش مادر ہی ہوتا ہے اچھی مائیں قوم کو معیار اور وقار کی رفعت میں ہمدوش ثریا کر دیتی ہیں انھیں کے دم سے امیدوں کی فصل ہمیشہ شاداب رہتی ہے یہ دانہ دانہ جمع کر کے خرمن بنانے پر قادر ہیں تاکہ آنے والی نسلیں فروغ گلشن اور صوت ہزار کا موسم دیکھ سکیں۔ اس کے بعد کہیں جا کر ارسطو 'کتاب الاخلاق' لکھتا ہے اور دنیا کی تمام اخلاقی گتھیوں کو فلسفیانہ انداز میں سمجھانے کی کوشش کرتا اور اسے کبھی مارکومیزم کی زبانی پیش کرتا ہے تو کبھی ڈینئیل کی اور آگے چل کر یہی اخلاقی مسئلہ نہ صرف ایتھنز کی ایک عورت کا ترجمان ہوتا ہے بلکہ عالمی مسئلہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور ہمارے بڑے بڑے دانشوروں کو کہنا پڑتا ہے ''موجودہ دور میں اخلاقی گراوٹ، قلت تغذیہ، جنگ و جدال، سرحدی لکیریں، ترقی پذیر ممالک کا ترقی یافتہ ممالک سے حسد و جلن، معاشرتی رسوم و رواج اور خود کو اعلیٰ جبکہ دوسروں کو ادنیٰ سمجھنا ہی اس دنیا کا سب سے بڑا بگاڑ اور فساد ہے کیوں کہ والدین نے اپنا فرض منصبی ادا کرنا چھوڑ دیا ہے اور اس کی عمدہ مثال نیوکلیئر فیملی سسٹم ہے جہاں ماں باپ دونوں کام کاج پر ہوتے ہیں اور ان کے بچوں کی پرورش و پرداخت کا کام گھر کے ملازمین کو انجام دینا پڑتا ہے۔ مذکورہ بالا باتوں کا صرف اتنا مطلب ہے کہ اخلاقیات بھی عالمی مسائل کا ایک اہم حصہ رہا ہے ممکن ہے ہماری اس بات سے اختلاف ہو لیکن اگر ہم یونیورسٹی سطح سے لے کر مدارس کی سطح تک دیکھیں تو آج کسی نہ کسی حیثیت سے اس اہم موضوع کو نصاب میں جگہ دی گئی ہے تاہم ہمیں یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہے کہ اگر اخلاقیات کو موضوع بنا کر جہاں مرد حضرات نے بہت سے ناول او راشعار قلم بند کیے ہیں وہیں پر اخلاقی پردے میں بہت سی کارآمد باتیں بھی عورتوں کی زبانی کہلوائی گئی ہیں جس سے نہ صرف ملک کے عوام کو

فائدہ پہونچا بلکہ کئی ممالک کے لوگوں نے ایسی کتابوں کے تراجم اپنی اپنی زبانوں میں پیش کیں اور دنیا ان سے فائدہ بھی اٹھا رہی ہے۔

گوتم نیلمبر اور چمپک کی زبانی قرۃ العین حیدر نے اپنے لازوال ناول 'آگ کا دریا' میں جن عالمی مسائل کا اظہار کیا ہے ان میں نہ صرف خانہ جنگی، رشتوں کے بنتے بگڑتے پیچ وخم، عورت کی مجبوری، سماج کی بے حیائی اور روسا کا اپنے ماتحتوں کو ہراساں کرنا، ان کی زندگی کو اجیرن بنا دینا بلکہ طوائفوں کی حالت زار سے لے کر ذات پات کے بندھن تک کا احاطہ بخوبی کیا ہے، کہا جاتا ہے کہ دور کا ڈھول سہانا ہوتا ہے ہم سوچتے ہیں یہ مسائل صرف برصغیر تک محدود ہیں لیکن اگر عالمی ادب یا بین الاقوامی اخبارات پر ہماری نظر ہے تو ہم سب آئے دن یہ پڑھتے ہوں گے کہ یوروپین ممالک کے لٹریچر میں بھی کم وبیش وہی باتیں پیش کی گئی ہیں یا کی جاتی رہی ہیں جو برصغیر کے ممالک کو درپیش ہیں۔ نوعتیں الگ الگ ہوسکتی ہیں۔ اس سے انکار ناممکن ہے۔ ورجینا وولف کے ناولوں میں تو خیر صراحتاً ان عالمی مسائل کا ذکر ہے جو موجودہ معاشرہ کو درپیش ہیں تاہم دیگر مرد قلمکاروں نے بھی عورتوں کے کردار میں سماجی برائیوں کو پیش کیا ہے مثال کے طور پر میکسم گورکی کا ناول 'ماں' کو لیا جائے جب ڈسوزا کو اپنے ملک کے اندر چل رہے معاشی بحران اور گوروں کو کالوں پر فوقیت کے بارے میں معلوم ہوتا ہے تو وہ کہتی ہے "ہائے کاش انسانیت کچھ عقل وشعور سے بھی کام لیتی کیا یہ انسان نہیں، انھیں جینے کا حق حاصل نہیں، خدا کی زمین تو بہت بڑی ہے کیا انھیں اس کی زمین کی رہنے کے لیے ان مجازی آقاؤں کی اجازت ضروری ہے۔" (ماں: میکسم گورکی (اردو ترجمہ)

راجندر سنگھ بیدی نے اپنے مختصر مگر جامع ناول 'ایک چادر میلی سی' میں جہاں فسادات اور معاشرتی برائیوں کو پیش کیا ہے مثلاً دیور کے ساتھ بھاوج کو بیاہ دینا، وہیں پر ایک ایسا مسئلہ بھی پیش آیا جسے عالمی مسئلہ کا درجہ حاصل ہے اور وہ ہے بھکمری چاہے وہ برصغیر کے ممالک ہوں یا پھر براعظم سے لے کر یوروپین ملکوں تک ہر جگہ اس بھکمری کے شکار افراد کی چیخ و پکار اور ان کی دل سوز آوازیں ہمارے کانوں تک پہونچتی ہیں ایسے میں نہ صرف اقوام متحدہ سے منسلک ادارے بلکہ ہر وہ تمام چھوٹی بڑی انجمنیں اس بھکمری سے بچنے کی تدابیر کے متعلق سوچتی رہتی ہیں اور اس کے لیے اپنے طور پر لائحہ عمل تیار کرتی ہیں بطور نمونہ مثال ملاحظہ ہو "یہ پیٹ نہ ہوتا تو آج ہمیں یہ دن نہ دیکھنے پڑتے کیا صرف ہمارے ہی ملک میں ایسا ہو تا ہے یا کہیں اور بھی ہماری طرح دنیا کی عورتیں بھوک سے پریشان ہو کر اس طرح کے قدم اٹھانے پر مجبور ہوتی ہیں۔" (ایک چادر میلی سی: راجندر سنگھ بیدی)

حالانکہ اس سے پہلے منٹو بھوک پر بہت کچھ لکھ چکا ہے لیکن ہمیں اس مضمون میں تانیثیت کے حوالے سے بات کرنی ہے اس لیے ہم منٹو کے قول "بھوک سب سے بڑا مذہب ہے" اس پر کچھ تبصرہ نہیں کرنا چاہیں گے۔ جب کہ پریم چند کا شاہکار افسانہ 'کفن' بھوک کی علامت بن چکا ہے جہاں ایک عورت دردِ زہ سے تڑپ رہی ہے تاہم اس کا شوہر اور سسر آلو سے اپنے پیٹ کی آگ بجھانے میں مگن ہیں۔ اس افسانہ پر بہت بات ہو چکی ہے لیکن تانیثیت کے حوالے سے صرف اتنا عرض کرنا چاہوں گا کہ دردزہ کا مسئلہ دنیا کی تمام عورتوں کے ساتھ یکساں ہے اور جب پریم چند بدھیا کی زبانی یہ مکالمہ ادا کرواتے ہیں "دن دن بھر کام کرو اس پر بھی چین نہیں" یہ مکالمہ اپنے آپ میں جاگیردارانہ اور تحکمانہ نظام کی پول کھول دیتا ہے کہ کس طرح سے پہلے گاؤں کے چودھریوں نے کمزوروں اور مظلوموں کا استحصال کیا ہے۔ یہ تنگ دستی اور مفلسی! ہے ہی ایسی چیز جو انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتی۔ یہ شعر ملاحظہ ہو

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

افسانہ 'کفن' کو اس شعر کے تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اگر ان کے پاس دولت کی فراوانی نہ بھی ہوتی اگر گذر بسر کا سامان بھی ہوتا تو بدھیا کی یہ حالت نہ ہوتی جو ہوئی۔ اور افسانہ پڑھنے کے بعد جو تأثر ہمارے ذہنوں میں ابھرتا ہے شاید اس کے علاوہ کچھ اور ابھرتا۔

معروف تانیثی ادیبہ اور دانشور ورجینیا وولف نے "A room of ones own" میں جنسی بنیادوں پر

عورت کو کمتر تصور کرنے اور اس کے ذہنی اور تخلیقی سطح پر پست ہونے کی دلیل کو رد کرتے ہوئے اس حقیقت پر زور صرف کیا ہے کہ عورت کی صلاحیتوں کو مرد اساس معاشرے نے نہ صرف تسلیم نہیں کیا بلکہ اس معاشرے اور نظام نے عورت کو اپنے مکمل اظہار کے لیے وہ مواقع ہی عطا نہیں کیے جن میں وہ پوری قوت اور اعتماد سے اپنے تخلیقی اور ادبی جوہر کو نکھار سکتی تھی، لہٰذا ورجینیا وولف نے اس کو متعصبانہ ذہنیت کا مظہر قرار دیا۔"

(انور پاشا، مشمولہ 'اردو ادب میں...")

اس کی عمدہ مثال ہمارے ملک میں مل جائے گی مثلاً بہت عرصہ تک ایسا رہا ہے کہ خواتین اگر کچھ لکھ رہی ہیں تو وہ اپنا نام نہیں ظاہر کرتی تھیں بلکہ بنت فلاں یا زوجہ فلاں کے نام سے ہی ان کی تحریریں شائع ہوا کرتی تھیں کمال کی بات تو یہ کہ بعض اہل قلم خواتین اسٹیج پر جا کر اپنی رائے کا اظہار تک نہیں کرسکتی تھیں لیکن اب صورت حال بدل چکی ہے۔ اس موضوع پر بھی بہت سے مباحثے ہوچکے ہیں مضمون کی طوالت کے پیش نظر بس اس بات پر اکتفا کر رہا ہوں کہ ایسی تمام خواتین کے بارے میں تفصیل سے جانکاری ڈاکٹر ناہید ظفر کی کتاب 'ہندوستانی مسلم خواتین 1947 تک' کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

عالمی مسائل کا اظہار اور تانیثی قلمکار: ہر ترقی یافتہ زبان کے قلمکاروں نے اس ضمن میں بہت سارے مضامین، مقالے، ناول اور کتابیں تحریر کی ہیں کبھی فکشن کا سہارا لے کر تو کبھی مذاہب کا سہارا لے کر تاہم اس مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ ہر ایک پر تفصیلی گفتگو کی جاسکے لیکن یہاں ہم چند اہم ناموں کا ذکر کرنے کے بعد ان کی کتابوں اور مقالوں کے حوالے سے اپنی بات کو مدلل انداز میں پیش کرنا چاہیں گے۔ ہندوستانی تناظر میں دیکھا جائے تو ایک طرف قرۃ العین حیدر کا ناول 'آگ کا

دریا' جہاں اس میں شعور کی رو کا استعمال کرتے ہوئے ڈھائی ہزار سالہ تاریخ اور عالمی مسائل کو کبھی گوتم کی زبانی تو کبھی چمپک کی زبانی پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے وہیں انتظار حسین نے اپنے ناول 'بستی' میں بھی اس کو پیش کیا ہے۔مثلاً کسی بھی ملک کے بٹوارے کی صورت میں کیا، کیا کچھ ہوسکتا ہے اور کس طرح کا ردعمل سامنے آتا ہے اس ناول میں انہوں نے کماحقہ پیش کیا ہے کہنے کو تو یہ ناول ایک خاص تناظر میں لکھا گیا ہے لیکن اگر ہم دیگر ممالک کے بٹوارے کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ کیا وہاں بھی یہی صورت حال ہے جو ہندوستان اور پاکستان کے ساتھ تھی تو ہمیں جگہ،مقام اور آب و ہوا کے فرق کے علاوہ بہت کچھ مشابہ نظر آئے گا چاہے آپ روس کو لے لیں یا پھر کوریا کے بٹوارے کو، بہت کچھ مشابہت ملے گی جس میں آج بھی وہاں کے عوام ایک دوسرے سے ملنے کے لیے ترستے ہیں بالکل اسی طرح سے جس طرح ہندوستان اور پاکستان کے وہ خانوادے جو ہجرت کر کے گئے تھے آج انھیں یہاں ملاقات کی غرض سے آنے کے لیے کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں بطور مثال یہ اقتباس ملاحظہ ہو جس میں جواد اور عشرت کے مابین ناول نگار مکالمہ کرتے ہوئے دکھاتا ہے جس میں عشرت جواد سے شہر کا درد سنا رہی ہے

''وہ جو اس شہر میں ایک امی جمی تھی اچانک ہی غائب ہو گئی۔ ڈاکے، اغوا، قتل کی وارداتیں، بم دھماکے اچانک نقاب پوش نمودار ہوتے، بھرے بازار میں گولیاں چلاتے ایک یہاں گرا پڑا ہے دوسرا وہاں تڑپ رہا ہے گرم جسم دیکھتے دیکھتے ٹھنڈے پڑ جاتے، بازار میں بھگدڑ مچ جاتی، پھر سناٹا اور پھر اچانک ٹائر جلنا شروع ہو جاتے ٹائروں کے جلتے جلتے کوئی بس زد میں آجاتی اور منٹوں میں جل کر خاکستر ہو جاتی دوکانیں کھلتے کھلتے پھر بند ہو جاتیں اور کرفیو لگ جاتا کرفیو آج یہاں کل وہاں۔''

(بستی: انتظار حسین)

مذکورہ بالا اقتباس پیش کرنے کا صرف یہی مقصد ہے کہ کسی ملک کا بٹوارہ صرف زمینی بٹوارہ نہیں بلکہ دو دلوں سے لے کر خاندانوں اور تہذیبوں تک کا بھی بٹوارہ ہوتا ہے اور آگے چل کر جب نئی نسل تیار ہوتی ہے تو وہ ایک دوسرے سے شکوہ کناں نظر آتی ہے۔ایسے نہ جانے لوگ، کتنی مائیں، بہنیں اور لڑکیاں ہیں جو ہجرت نہیں کرنا چاہتی تھیں مبادا وہ اپنے والدین اور قریبی رشتہ داروں سے دور نہ ہو جائیں لیکن ان کے شوہر کو ہجرت کرنا تھی سو بصد مجبوری ہی سہی ان کو بھی جانا پڑا۔ایسے حالات میں عشرت کی زبانی یہ مکالمہ اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ اسے یہ جگہ پسند نہیں ایک مشرقی لڑکی اپنے شوہر کی بات کو نظر انداز کرنا گناہ کبیرہ سمجھتی ہے۔یہ اور اس قبیل کے دیگر مسائل کا سامنا ان ممالک کو ضرور ہوتا ہے جو تقسیم کے مرض سے دوچار ہوتے ہیں۔ہمارے اردو ادب میں تو تقسیم کے سانحہ پر ایسے ایسے لازوال شاہکار تصنیف کیے گئے ہیں جن کی مثال تلاش کرنا مشکل نہیں۔کہنے کو تو پاکستان سے بنگلہ دیش بھی بنا، تاہم ان کے قلمکاروں نے اسے عالمی مسئلہ کی شکل نہ دے کر خانہ جنگی پر اپنے قلم کو مرکوز رکھا۔

تانیثیت اور عالمی سماج کا مسئلہ: ایک سماج یا معاشرہ کم یا زیادہ کہیں نہ کہیں ابتدا میں بے ترتیبی کا شکار ہوسکتا ہے لیکن اگر اس معاشرہ کے سمجھ دار افراد مل بیٹھ کر کوئی بہتر لائحہ عمل تیار کریں تو بہت حد تک کشاکش سے نمٹا جاسکتا ہے منٹو نے ایک اہم سماجی مسئلہ جسے بین الاقوامی مسئلہ کہنا زیادہ بہتر ہے وہ ہے عریانیت وفحاشیت، اس پر اتنا کچھ لکھ دیا کہ ایک پی ایچ ڈی کا مقالہ تیار ہوسکتا ہے۔ زمانہ ترقی کر رہا ہے قومیں آگے بڑھ رہیں تاہم عریانیت وفحاشیت دنیا کے نقشہ پر ایسے ہی ثبت ہے جیسے کہ پہلے تھا،حالات بدل گئے تو لوگوں نے عیاشی کے ذرائع میں بھی تبدیلی کر دی، نئے نئے طریقے ایجاد کر لیے اور نیا نیا نام تجویز کر لیا۔مثلاً مجرا کی شکل موجودہ دور میں تبدیل ہو کر Dance Bar یا Night Club کی شکل اختیار کر چکی ہے اور ہمارے سماج کا نامور طبقہ ہی ان کلبوں کو زینت بخشتا ہے منٹو کہتا ہے'' ہمارے شہر کے معززین کو طوائفوں سے بہتر کون جان سکتا ہے'' یا پھر منٹو کا ہی افسانہ''بابو گوپی ناتھ کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو''رنڈی کا کوٹھا اور پیر کا مزار۔ یہی دو جگہیں جہاں میرے دل کو سکون ملتا ہے ان دونوں جگہوں پر فرش سے لے کر چھت تک دھوکہ ہی دھوکہ ہے۔ جو آدمی خود کو دھوکہ دینا چاہے اس کے لیے ان سے اچھا مقام اور کیا ہوسکتا ہے، رنڈی کے کوٹھے پر ماں باپ اپنی اولاد سے پیشہ کراتے ہیں اور مقبروں اور تکیوں میں انسان اپنے خدا سے۔''

(بابو گوپی ناتھ: سعادت حسن منٹو)

مذکورہ اقتباس بہت حد تک سچائی کا ضامن ہے وہیں دوسری طرف ہم آئے دن اخبارات میں پڑھتے ہیں کہ فلاں مٹھ سے اتنی لڑکیاں آزاد کرائی گئیں یا فلاں آشرم اور مزار یا خانقاہوں میں اس اس طرح کی حرکتیں اجاگر کی گئی۔ دراصل منٹو کا یہ اقتباس ایک ایسی علامت ہے جس کا شکار آج پوری دنیا ہے ایک طرف اس طرح کے کاموں کی مذمت تو دوسری طرف پس پردہ اپنے مفاد میں یہ سارے کام روا رکھنا ہی اس عجیب دنیا کا عالمی مسئلہ ہے۔

ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ موجودہ دور میں تانیثیت کے حوالے سے جہاں بہت سارے عالمی مسائل کے حل کی کوششیں جاری ہیں وہیں پر سماج کے کچھ عناصر ان کو عالمی مسئلہ نہ سمجھ کر کسی ایک ملک، ایک معاشرہ یا افراد سے جوڑ دیتے ہیں۔یہ بات ہمیں ہر حال میں یاد رکھنی چاہیے کہ''وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ''لیکن اگر ان رنگوں میں صرف مسائل ہی مسائل ہوں گے اور انھیں حل کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں ہوگی تو پھر کوئی مفید حل تلاش نہیں کیا جاسکتا۔

■

Mr. Asadullah C/o Mohd Mohsin
1444/45 Faiyaz Ganj
Azad Market
Old Delhi- 110006

ہندوستانی تناظر میں دیکھا جائے تو ایک طرف قرۃ العین حیدر کا ناول 'آگ کا دریا' جہاں اس میں شعور کی رو کا استعمال کرتے ہوئے ڈھائی ہزار سالہ تاریخ اور عالمی مسائل کو کبھی گوتم کی زبانی تو کبھی چمپک کی زبانی پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے وہیں انتظار حسین نے اپنے ناول 'بستی' میں بھی اس کو پیش کیا ہے۔

موجودہ دور میں تانیثیت کے حوالے سے جہاں بہت سارے عالمی مسائل کے حل کی کوششیں جاری ہیں وہیں پر سماج کے کچھ عناصر ان کو عالمی مسئلہ نہ سمجھ کر کسی ایک ملک، ایک معاشرہ یا افراد سے جوڑ دیتے ہیں۔یہ بات ہمیں ہر حال میں یاد رکھنی چاہیے کہ ''وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ ''لیکن اگر ان رنگوں میں صرف مسائل ہی مسائل ہوں گے اور انہیں حل کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں ہو گی تو پھر کوئی مفید حل تلاش نہیں کیا جاسکتا۔

عبدالحی

آیئے تعلیم کو سزا سے مزہ میں بدل دیں

پروفیسر ادریس صدیقی

ادریس صدیقی معاشیات کے پروفیسر رہے ہیں۔ انھوں نے 60 سے زائد کتابیں تحریر کی ہیں۔سائنس ان کا محبوب موضوع رہا ہے اور انھوں نے بچوں کے لیے ابتدائی سطح پر سائنس کی درجنوں کتابیں تحریر کی ہیں۔ سائنس جیسے خشک موضوع کو کہانیوں کی شکل میں ڈھال کر بچوں کے لیے دلچسپ بنانے کے لیے ادریس صدیقی کی کوششیں لائق صد ستائش ہیں۔ وہ کناڈا میں سکونت پذیر ہیں۔ گزشتہ دنوں وہ ہندوستان آئے ہوئے تھے ۔ ان سے اردو دنیا کے لیے عبدالحی نے خصوصی گفتگو کی جس کے اقتباسات قارئین اردو دنیا کے لیے پیش کیے جارہے ہیں۔ (ادارہ)

س: سب سے پہلے اپنے بارے میں بتائیں؟

ج: میں 1954 میں ضلع لکھیم پور کھیری کے قصبہ گولا گوکارن ناتھ میں پیدا ہوا۔ میرے والد مولوی انعام علی علاقے میں بااثر شخص کے طور پر جانے جاتے تھے۔ انھوں نے علاقے میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے مدارس بھی قائم کیے۔ اس دور میں لڑکیوں کی تعلیم پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی تھی لیکن میرے والد نے اس دور میں بھی لڑکیوں کی تعلیم پر زور دیا۔ میری والدہ تسنیم مجھے بچپن میں کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ اس وقت سے مجھے کہانیوں سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ میں اپنے خاندان میں سب سے چھوٹا ہوں۔ میرے بڑے بھائی پروفیسر مولانا محمد یٰسین مظہر صدیقی اسلامیات کے بڑے اسکالر ہیں اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر ایمرٹس ہیں۔ میں نے مختلف یونیورسٹیوں میں تقریباً 34 برسوں تک پڑھایا ہے۔ میں نے تقریباً 60 ممالک کا سفر کیا ہے۔ میرے دو بیٹے ہیں، سمیر اور عنبر۔ سمیر سماعت سے محروم ہے لیکن ہماری باتیں سمجھتا ہے، جواب دیتا ہے۔ مجھے اس کی کوششوں سے ترغیب ملتی ہے۔ میں اکنامکس کا پروفیسر رہا ہوں۔ میری دلچسپی Environmental Economics میں زیادہ رہی ہے۔ اور میری کہانیوں کے پانچ مجموعے اسی موضوع پر ہیں۔ ماحولیات اور کرۂ ارض کی حفاظت ایک بڑا مسئلہ بنتا جارہا ہے۔ اردو میری مادری زبان ہے۔ جب میں نویں جماعت میں تھا تو میرا افسانہ اخبار 'ملاپ' میں شائع ہوا تھا۔ اس تحریر کی اشاعت سے مجھے کافی حوصلہ ملا اور میں تواتر سے لکھنے لگا اور میری تحریریں شائع ہونے لگیں۔ جب میں Environmental Economics پڑھایا کرتا تھا تو میں نے دوبارہ لکھنا شروع کیا۔ ایک دن میرے بچے نے مجھ سے سوال کیا کہ اوزون کسے کہتے ہیں۔ میں نے اپنے بیٹے کو سمجھانے کے لیے ایک کہانی لکھی اور اسے رات کو سنایا۔ آج 27 سال بعد بھی اُسے وہ کہانی یاد ہے۔ کہانی میں میں نے اوزون کی تعریف بیان کی تھی۔ پھر میں نے سائنس کے مختلف موضوعات پر کہانیاں لکھنی شروع کی۔ ہلکے پھلکے عام فہم الفاظ میں سائنس کو سمجھانا میرا مقصد تھا۔ میں گزشتہ پانچ برسوں سے سائنس کو کہانیوں کی شکل میں ڈھالنے پر کام کر رہا ہوں۔

س: اپنی تعلیم کے بارے میں بتائیں؟

ج: میری ابتدائی تعلیم مدرسے میں ہوئی۔ بعد میں اے ایم یو سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ پی ایچ ڈی بھی یہیں سے کی۔ کناڈا میں اپنے بیٹوں کو سیٹل کرنے گیا تھا۔ وہاں میں کچھ دنوں تک رہا تھا۔ مجھے وہاں کا نظام تعلیم اور رہن سہن بہت اچھا لگا اور میں اس سے کافی متاثر ہوا۔ میں نے وہاں ایک قول سنا اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کی paying back to society، اس قول نے مجھے جیسے ایک جوش اور جذبہ دے دیا کہ میں کس طرح اپنے معاشرے کا اپنے سماج کا قرض ادا کروں اور اس طرح میں نے کچھ الگ کرنے کا سوچا اور سائنسی کہانیاں لکھنی شروع کی تاکہ اردو جاننے والے بچے سائنس جیسے خشک موضوع کی جانب زیادہ سے زیادہ راغب ہوں اور سائنس ان کے لیے مشکل موضوع نہ رہے۔

س: کہانیاں لکھنے کے لیے موضوعات کا انتخاب کس طرح کیا؟

ج: میں نے مختلف نصاب دیکھے لیکن مجھے ENESCO کا نصاب زیادہ بہتر لگا اور بنیادی تعلیم کے لیے سائنس کا نصاب بہت عمدہ ہے اور میں نے اس نصاب پر کہانیاں لکھنی شروع کی اور مجھے اس میں تین سال کا عرصہ لگا۔ میں نے پھر این سی ای آر ٹی کی سائنس کی کتابیں دیکھیں اور ان کے موضوعات پر بھی کہانیاں تحریر کی۔ میں نے مختلف مدارس کا دورہ کیا اور اپنی کتابیں پیش کی۔ میری کتابوں کو مدارس میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

س: آپ کناڈا میں طویل عرصے سے مقیم ہیں اور ہندوستان بھی آتے رہتے ہیں۔ یہاں اور وہاں کے نصاب تعلیم میں کیا فرق ہے؟

ج: یہاں کا نصاب بہت عمدہ ہے اور نصاب میں شامل مواد کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہوگی لیکن ہمارے پڑھانے کا طریقہ نہایت فرسودہ ہے جبکہ کناڈا کا جو نظام تعلیم ہے وہ بہتر ہے اور ابتدائی سطح پر تعلیم و تربیت کا جو نظم و نسق ہے وہ قابل ستائش ہے۔

س: آپ نے اس طرح کی کتنی کتابیں تیار کرلی ہیں؟

ج: میں نے پانچ برسوں میں آٹھ کتابیں تیار کرلی ہیں اور سائنس کے موضوعات کو Story Telling Method کے ذریعے سائنس کے اسباق کو آسان اور دلچسپ بنایا ہے اور بچوں کو پڑھتے ہوئے یہ احساس نہیں ہوگا کہ وہ سائنس جیسے خشک موضوع کو پڑھ رہے ہیں۔ میرا Slogan

ہے کہ آئیے تعلیم کو سزا سے مزہ میں بدل دیں۔ تو یہ میری کوشش ہے کہ تعلیم سزا نہ ہو کر مزہ لگے۔

س: کناڈا کے نصاب تعلیم پر تھوڑی روشنی ڈالیں؟

ج: کناڈا میں دو طرح کے بورڈ ہیں۔ انگلش میڈیم بورڈ اور کیتھولک بورڈ، یہ وہاں کے آئین میں کہا گیا ہے کہ کیتھولک بورڈ الگ سے ہوگا اور سرکار اس کی فنڈنگ کرے گی۔ میری اہلیہ ٹورنٹو ڈسٹرکٹ اسکول بورڈ میں پڑھاتی ہیں۔ ان سے جب مجھے معلوم ہوا کہ یہاں پر بچوں کو پڑھانے کا طریقہ تھوڑا مختلف ہے تو میں نے اسے جاننا شروع کیا کہ کیا فرق ہے تو مجھے اندازہ ہوا کہ ہمارے یہاں نصاب ہوتا ہے اور اسے پورا کرنا ضروری ہوتا ہے جبکہ ان کے یہاں ایک لیول ہے، معیار ہے کہ بچے کو اس معیار تک یہ پڑھانا ہے۔ وہ معیار کی جانچ کہانیوں، گیم اور پزل سے کرتے ہیں۔ پڑھانے کا طریقہ اتنا دلچسپ ہے کہ بچوں کو اسکول جانا سزا نہیں لگتا۔ کہانیاں ایک اہم رول ادا کر رہی ہیں۔ ایک فرق یہ ہے کہ ہمارے یہاں ہائی اسکول کا نصاب کہیں زیادہ ایڈوانس ہے کناڈا سے۔ ہمارا بچہ کہیں زیادہ جانتا ہے وہاں کے بچے سے لیکن پڑھانے کا طریقہ ہمارا ناقص ہے کہ ہم بچوں میں دلچسپی مشکل سے پیدا کر پاتے ہیں۔ یہی دلچسپی پیدا کرنے میں وہ کامیاب ہیں اور ہم سے آگے ہیں۔ تو یہی وجہ تھی کناڈا میں رہنے اور ملازمت کو قبل از وقت چھوڑنے کی۔

س: ہندوستان میں اردو کی صورت حال پر آپ کیا کہیں گے، آپ کا یہاں بھی آنا جانا لگا رہتا ہے اور کئی ممالک میں بھی آپ گھومتے رہے ہیں۔

ج: اردو کے جو دبستان لکھنؤ اور دہلی تھے وہ تو معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ خاص طور سے اتر پردیش میں اردو کی حالت بہت خراب ہے اور ہم خود ہی اسے ختم کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر اے ایم یو کے پروفیسران اور اساتذہ و اسٹاف کے بچے لیڈی فاطمہ میں پڑھنے جاتے ہیں جو وہاں کا سب سے اچھا اسکول ہے۔ اسکول میں تھرڈ لینگویج کا آپشن دیا جاتا ہے لیکن آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ جو اردو کے حامی ہیں ایسے لوگ اپنے بچوں کو فرنچ پڑھوانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ اردو نہیں لینا چاہتے۔ تو اردو کو ہم خود ختم کر رہے ہیں۔ لیکن میں جب مہاراشٹر گیا، مالیگاؤں، جلگاؤں، اورنگ آباد گیا تو مجھے دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہاں اردو میڈیم اسکول کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ مہاراشٹر کو آپ اردو کا نیا دبستان کہہ سکتے ہیں۔ وہاں میں نے کئی اسکولوں کا دورہ کیا اور میری کتابوں کی خاصی پذیرائی ہوئی۔ تو اردو میں امیدیں ختم نہیں ہوئی ہیں۔ لیکن میں مایوس ہوں کہ لکھنؤ جو میرا وطن ہے وہاں اردو کی حالت بہتر نہیں ہے۔ میں کوشاں ہوں کہ میری کتابوں کی بدولت ایک بار پھر اردو زندہ ہو سکے۔

س: آپ نے ابھی یہ کہا کہ یہاں کا نظام تعلیم فرسودہ ہے، ناقص ہے آپ نے جو نصاب تیار کیا ہے کیا وہ ہمارے نصاب سے میل کھاتا ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کا نصاب محض کہانی بن کر رہ جائے؟ اگر کوئی بچہ نصاب نہ پڑھے تو کیا صرف آپ کی کتابیں پڑھ کر کامیاب ہو سکتا ہے؟

ج: میں تین طرح کی کہانیاں لکھتا ہوں۔ پہلی وہ کہانیاں جو تفریحی ہوتی ہیں جنھیں Fun Story کہتے ہیں۔ ان کا کوئی مقصد ذہنی تفریح کے سوا نہیں ہوتا ہے۔ دوسری وہ کہانیاں ہیں جنھیں معلوماتی کہانیاں کہہ سکتے ہیں۔ سائنس کے موضوع پر میں نے بہت ساری معلوماتی کہانیاں لکھی ہیں۔ نیشنل بک ٹرسٹ نے بھی کتابیں شائع کی ہیں۔ تیسری کہانیاں جو اب میں نے لکھی ہیں وہ تدریسی کہانیاں ہیں۔ میں پہلے نصاب کا جو سبق ہوتا ہے اس کو پڑھ کر نوٹس بناتا ہوں کہ اس میں کیا کیا وضاحت کی جانی چاہیے اور اس کے بعد میں کہانیاں لکھتا ہوں جس میں وہ تمام نکات کور (cover) ہوتے ہیں۔ میری کہانیوں کے آخر میں سوالات دیے ہوتے ہیں جس سے اس سبق کے تمام اہم نکات واضح ہو جائیں۔ دوسرا حصہ ذہنی ورزش کا ہے جو بچے کو کرنی ہے۔ جس کے جواب میں نے نہیں دیے ہیں، اسے اپنا ذہن استعمال کرنا ہے تاکہ اس کی Imagination کی طاقت ختم نہ ہو جسے ہم نے نصاب کے ذریعے ختم کر دیا ہے اور اسے رٹنے پر مجبور کرتے ہیں اور تیسرا وہ ہے کہ آپ خود کر کے دیکھیے۔ وہ پریکٹیکل پر مرکوز ہے۔ اس طرح سے اگر وہ نصاب کی کتاب نہیں پڑھتا ہے صرف کہانی پڑھتا ہے تب بھی وہ امتحان میں اچھے نمبروں سے پاس ہو سکتا ہے۔

س: مجھے یہ بتائیں کہ ابھی تک آپ کو اس میں کتنی کامیابی ملی ہے؟ کیونکہ جو باتیں آپ کہہ رہے یا جو کام آپ کرنا چاہ رہے ہیں وہ بظاہر ناممکن سا لگتا ہے کیونکہ ہر حکومت کی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں اپنا ایجوکیشن سسٹم ہوتا ہے؟ آپ بتائیں کہ آخر کس طرح ان کتابوں کو اسکولوں میں یا نصاب میں شامل کرایا جا سکتا ہے؟

کوائف

نام: پروفیسر اودریس صدیقی

تعلیمی لیاقت: پی ایچ ڈی (اکنامکس)

پیشہ: پروفیسر اکنامکس (ریٹائرڈ)

کتابیں: ناول: تنہا ہم سفر (2009)، **سفرنامے:** امریکہ نامہ 2011، استنبول سے استنبول تک (ترکی) 2013، اے شہر میں تیرا نغمہ گار ہوں (کیوبا) 2014، ان دیکھے دیاروں کا سفر (بوسنیا اور ہرزگووینا) 2015، سب جلوہ روبرو ہے (چین) 2015، پھر نظر میں پھول مہکے (اسکینڈینیویا) 2017، موہن جوداڑو سے ہڑپا تک (پاکستان) 2018، **بچوں کی کتابیں:** پانی کی موت 2011، مورو آمی 2007، ابھی نہیں کبھی نہیں 2009، نئی راہیں 2009، راکٹ 2012، جادو 2012، بابا کہتے تھے 2015، پھلوں کی ٹوکری (سیریز 1 سے 5) 2015، بھورے بھیڑیے 2016، عقلمند بھالو 2016، سات سمندر پار کی کہانیاں 2015، ناراض سورج 2014-15 **بچوں کے لیے معلوماتی کتابیں:** پانی کی آلودگی 2010، عالمی حرارت 2010، معدوم شجر کاری 2010، اوزون سوراخ 2010، نیوکلیائی کثافت 2010، زمینی آلودگی پر مبنی کہانیاں، قومی اردو کونسل، کہانیاں سائنس کی (سیریز) درجہ 1 سے درجہ 5 تک۔

ج: میں سرکاری اسکول سے پہلے مدارس پر توجہ دینا چاہتا ہوں کہ وہاں ذریعہ تعلیم اردو ہے اور میری کتابیں بھی اردو میں ہیں۔ وہاں کوئی ایسا سسٹم بھی نہیں، تو وہ آسانی سے ان کتابوں کو متعارف کرا سکتے ہیں۔ خاص طور سے پرائمری سطح پر۔ 6,7 اور آٹھویں میں جو سائنس کا کورس ہے اس میں این سی ای آر ٹی کی کتابیں ہوتی ہیں۔ یہاں پر بتادوں کہ این سی ای آر ٹی کا کورس لازم ہے لیکن NCERT کی کتابیں لازم نہیں ہیں۔ تو ہم ان کے نصاب کو مکمل کر سکتے ہیں۔ کسی بھی کتاب سے کریں۔ سرکار نے آپ پر کوئی پابندی نہیں لگائی ہے۔ آپ خود سے کتابوں کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ کتابیں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک کورس کی کتابیں اور دوسری سپلیمنٹری کتابیں۔ جہاں پر کوئی قانونی بندش آڑے آرہی ہے وہاں سپلیمنٹری کتابیں چلا سکتے ہیں اور اس میں کوئی بھی پابندی نہیں ہے۔ اردو میڈیم اسکول آسانی سے میری کتابیں اپنے اسکول کے نصاب میں شامل کر سکتے ہیں۔

س: کوئی ایسا ادارہ جہاں آپ کی کتابیں نصاب میں شامل کی گئی ہوں؟

ج: نہیں ابھی تو شائع ہوئی ہیں اور پرائمری کی کتابیں ندوۃ العلما کے مکتبہ ندویہ سے شائع ہو رہی ہیں۔ سیکنڈری لیول کی کتابیں مکتبہ جامعہ سے شائع ہو رہی ہیں۔ یو پی کے مدرسہ بورڈ سے بات کی جائے گی کہ ان کتابوں کو اپنے نصاب میں شامل کریں اور ان کتابوں کی سفارش کریں۔ ان کے علاوہ مولانا وستانوی کا مدرسہ ہے اکل کنواں میں، وہ اس میں کافی دلچسپی لے رہے ہیں اور جب میں نے یہ بات رکھی تو وہ ان کتابوں کو اپنے نصاب تعلیم میں شامل کرنے پر آمادہ ہیں۔ مہاراشٹر کے اردو میڈیم اسکولوں میں اسمارٹ بورڈ اور ڈیجیٹل کلاس روم ہیں جو یقیناً قابل ستائش ہیں۔ وہ میری کتابوں کے ذریعے اچھی طرح سے بچوں کو سائنس کی تعلیم دے سکتے ہیں۔

س: کتابوں کی باتیں تو اچھی ہیں لیکن ابھی سب سے بڑا مسئلہ زبان کی بقا ہے۔ ہماری مادری زبان اردو اپنے ہی لوگوں کی بے اعتنائی کا شکار ہے۔ اس پر آپ کیا کہیں گے کیونکہ زبان ہی نہیں رہے گی تو ہم نہ سائنس پڑھ سکیں گے اور نہ ادب؟

ج: زبان ختم ہونے کے آثار تو نہیں دکھائی دے رہے ہیں۔ اگر شمالی ہند کے دبستان ختم ہو رہے ہیں تو مہاراشٹر میں زبان کے نئے دبستان قائم بھی ہو رہے ہیں۔ زبان کے تحفظ کے لیے اتنے ہی لوگ آمادہ ہیں اور پر جوش ہیں جتنا کہ زبان کو ختم کرنے والے۔ تو بہت مایوس کن صورت حال نہیں ہے۔ دوسری امید کی کرن یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں مڈل کلاس اور Lower مڈل کلاس میں مرد حضرات بھلے ہی ہندی کے الفاظ اپنے روزمرہ میں استعمال کریں لیکن مائیں ابھی بھی گھروں میں اردو زبان کا ہی استعمال کرتی ہیں جو خوش آئند بات ہے اور ماؤں کی وجہ سے مادری زبان اب بھی اردو کے طور پر زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ زبان کی شکل ضرور بدل جائے گی اور وہ ہمیشہ بدلتی رہی ہے جیسے ریختہ، ریختی، دکنی اردو، کھڑی بولی، اور اب بولی جانے والی زبان، تو یہ اسی طرح چلتا رہے گا۔ عام فہم زبان کے طور پر اردو ہمیشہ رائج رہے گی۔

س: آپ کے گھر میں بچے اردو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں؟

ج: میرا ایک بیٹا سماعت سے محروم ہے وہ کوئی زبان نہیں جانتا ہے۔ وہ امریکن سائن لینگویج (اشاروں کی زبان) استعمال کرتا ہے۔ مختلف ممالک میں سائن لینگویج الگ الگ ہوتی ہے۔ وہ تھوڑے الفاظ بولتا ہے جو اردو کے بھی ہیں۔ پوری طرح نہیں بول پاتا لیکن ہم کوشش کرتے ہیں کہ وہ مزید الفاظ سیکھ سکے۔ دوسرا بیٹا اردو بولتا ہے لیکن اردو لکھتا یا پڑھتا نہیں ہے کیونکہ کناڈا میں اردو زبان لکھنے اور پڑھنے کا اسے کوئی مقصد نہیں سمجھ میں آتا۔ گھر پر چونکہ اردو بولی جاتی ہے اس لیے وہ اردو بولتا ہے ویسے انگریزی میں ہی بات کرنا پسند کرتا ہے۔

س: بولنا تو سب جانتے ہیں لیکن اصل مسئلہ لکھنے اور زبان کی شناخت کا ہے اور ہماری زبان کی شناخت اس کا رسم الخط ہے۔ کناڈا میں بچوں کو رسم الخط نہیں سکھایا جاتا؟

ج: کناڈا میں بچوں کی دینی تعلیم کے لیے مولوی یا عالم کو رکھا جاتا ہے جو عربی سکھاتے ہیں قرآن پڑھاتے ہیں تو وہ ساتھ میں اردو رسم الخط بھی سکھاتے ہیں۔ تو اس طرح سے وہاں کے بچوں سے اردو کی واقفیت ضرور ہوتی ہے لیکن کناڈا میں استعمال نہ ہونے کی وجہ سے اس بابت زیادہ جوش نہیں پایا جاتا۔ باقاعدہ تعلیم اردو میں نہیں ہوتی اس کے باوجود وہاں اردو کے کچھ اخبارات نکلتے ہیں یا اردو کے رسائل نکلتے ہیں اور وہ مفت میں فراہم کیے جاتے ہیں تو وہ ہم لوگ لے کر پڑھتے ہیں اور بچوں کو پڑھاتے ہیں لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ بچے بھی انھیں شوق سے پڑھتے ہیں۔

س: کناڈا میں اردو کی کیا صورتِ حال ہے۔ آج کل 'اردو کی نئی بستیاں' جیسی اصطلاحات خوب چل پڑی ہیں اور اردو بہت پھل پھول رہی ہے۔ اس میں کس قدر سچائی ہے؟

ج: کناڈا میں مشاعروں سے اردو زندہ ہے۔ شاعری سے اردو زندہ ہے۔ باقاعدہ مشاعروں کا اہتمام ہوتا ہے۔ کناڈا میں بھی اور امریکہ میں بھی۔ میں ایک مشاعرے میں شرکت کرنے کے لیے ٹورنٹو سے امریکہ گیا تھا۔ امریکہ کے ڈیٹرائٹ میں وہ مشاعرہ تھا۔ علیگ برادری اور علی گڑھ والے جہاں بھی موجود ہیں وہ اردو کے کوئی نہ کوئی پروگرام کرتے رہتے ہیں۔ تو اس طرح سے یہ لوگ اردو کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ سرسید ڈے ضرور منایا جاتا ہے۔ وہاں زیادہ تر تقریبات سنیچر یا اتوار کو ہی ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ اگر کوئی مر بھی گیا تو اس کی تدفین سنیچر یا اتوار کو ہوتی ہے کیونکہ عام دنوں میں لوگ نہیں آپاتے۔ اس طرح اردو کے پروگرام بھی انہی دو دنوں میں ہوتے ہیں۔ داستان گوئی کا پروگرام ہوتا ہے۔ کلچرل پروگرام میں بھی اردو شامل ہوتی ہے۔ اردو وہاں ختم نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ دھیرے دھیرے مقبول ہو رہی ہے۔

س: کیا آپ بھی شاعری کرتے ہیں؟

ج: نہیں، میں صرف پڑھنے کی حد تک دلچسپی رکھتا ہوں۔ میں خود شاعری کی اہلیت نہیں رکھتا۔

س: ہندوستان آ کر کیسا محسوس کرتے ہیں جب آپ یہاں خود پروفیسر تھے اور اب اتنے برسوں بعد آئے ہیں تو یہاں کیسا لگا کہ پہلے کے مقابلے اردو بہتر حالت میں ہے یا صورت حال خراب ہو رہی ہے۔

ج: اردو جہاں پر پہلے تھی وہاں ختم ہو رہی اور جہاں نہیں تھی وہاں بڑھ رہی ہے۔ مثال کے طور پر مہاراشٹر کو دیکھ لیں۔ کیرالہ کے مدارس میں اردو پڑھائی جا رہی ہے۔ تو ان خطوں میں جہاں کبھی اردو کی آبیاری نہیں ہوئی وہاں پر اردو پنپ رہی ہے یہ زبان کی چاشنی کا اثر ہے۔

س: ہمارے قارئین کے لیے کوئی پیغام؟

ج: اردو سے اگر محبت ہے تو عملی طور پر اردو کو بچانے کی کوشش کیجیے۔ اردو کی کتابیں اور رسائل خرید کر پڑھیے کیونکہ اردو کا مسئلہ یہی ہے کہ قاری مانگ کر پڑھنا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ خریدنے کی زحمت نہیں کرتے۔ میرے آٹھ سفرنامے شائع ہوئے ہیں۔ زیادہ تر لوگ کہتے ہیں کہ ایک سفرنامہ اپنا بھیج دیجیے۔ میں کہتا ہوں کہ حضور خریدیں گے نہیں تو پبلشر کیوں شائع کرے گا۔ بچوں کی دنیا اور اردو دنیا انتہائی مقبول رسالے ہیں اور ان کی اشاعت بڑی تعداد میں ہو رہی ہے۔ بھٹکل سے ایک رسالہ پھول نکلتا ہے وہ بھی بہت خوبصورت ہے۔ گل بوٹے بھی بہت مقبول ہے۔ بہت بہت شکریہ عبدالحی صاحب کہ آپ نے میرے لیے وقت نکالا۔

■

M. Idris Siddiqui
40 Whiteleas Avenue, Scarborough
Ontario, M1B 1W7, Canada
misiddiqui@rediffmail.com
misiddiquitoronto@yahoo.com
Phone # 001 416 299 6831

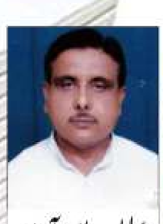

سلطان آزاد

کاغذ کی اہمیت اور اس کی افادیت

ابتدا ہی سے انسان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اس کے کارنامے دوسروں تک پہنچیں، اور اس سے زیادہ سے زیادہ لوگ فیضیاب ہوں، اس کے علاوہ اس کے افکار، خیالات، تجربات و مشاہدات کئی پشت تک محفوظ رہ سکیں۔ جب تک لکھنے کا رواج اور اس کے ذریعے نشر و اشاعت کا دور نہیں آیا تھا اس وقت تک لوگ آپس میں باتیں کر کے ایک جگہ کی خبر دوسری جگہ پہنچاتے تھے، جب انسان کو پڑھنے اور لکھنے کا شعور پیدا ہوا تو مختلف ڈھنگ سے لکھنے کا رواج نکالا، اس زمانے میں جن اشیا کو لکھنے کا آلہ بنایا گیا اس میں لکڑی، پتھر اور بھوج پتر (ایک خاص قسم کا بٹہ) کے نام خاص طور سے تذکرے کی شکل میں کہیں نہ کہیں ملتے ہیں، اس دور میں اگر کوئی قیمتی اور اہم دستاویزی مسودہ لکھنا مقصود ہوتا تو جانوروں کی کھال پر اسی کی مناسبت سے قلم سے لکھا جاتا تھا، اور لکھنے کے ساتھ ساتھ طباعت کی ابتدا لکڑی پر حرف کھود کر کی گئی۔

کاغذ بنانے کی ابتدا آٹھویں صدی کے اواخر میں ہوئی اور دنیا کی پہلی کتاب 868 میں چھپی جس کے چھاپنے والے مسٹر بام سینگ تھے، اس کے بعد کئی متبرک کتابیں چھپیں، اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت کاغذ عالم وجود میں آچکا تھا، لیکن اس کا ارتقا کئی صدی گزرنے کے بعد ہوا، جیسے جیسے کاغذ کی ضرورت محسوس ہوتی گئی ویسے ویسے مختلف نوعیت کے کاغذ تیار کیے گئے، کیونکہ کاغذ کی اہمیت اور ضرورت صرف کتاب لکھنے تک محدود نہ رہی بلکہ استعمال کئی صورتوں میں کیا جانے لگا۔

کاغذ تیار کرنے کے ارتقائی منازل میں اب جس ڈھنگ سے کاغذ تیار کیا جاتا ہے اس میں پہلے چھلکوں، جنگل کی لکڑیوں، گھاس، پتوں اور ردی چھیروں کو خوب کوٹ پیٹ کر گودا سا بنایا جاتا ہے، بعد میں یہ مشین کے ذریعے کاغذ کی شکل اختیار کرلیتا ہے، ترقی یافتہ دور اور انسانی عقل و شعور کی ارتقا کے تحت مختلف ضرورتوں کے پیش نظر کئی اقسام کے کاغذ تیار کیے جاتے ہیں جس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے، چنانچہ مقصد تحریر کے تحت پہلے ہم مختلف اقسام کے کاغذوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں گے، بعد ازاں ہم رائج کاغذوں کے سائز کے متعلق بھی معلومات حاصل کریں گے تو ملاحظہ ہو کاغذوں کے اقسام اور اس کی افادیت۔

(1) **اینٹک بووپیپر:** ایسے کاغذ کو کہتے ہیں جس کی سطح چکنی نہیں ہوتی ہے، بلکہ اس میں سیاہی کو بہ آسانی جذب کرنے کی خاصیت ہوتی ہے۔ آرٹ اور ایمیٹیشن آرٹ کو چھوڑ کر پیداوار کی پہلی حالت میں کاغذوں میں اینٹک بوڈ کی خاصیت مستقل رہتی ہے لیکن پسائی کے بعد اس میں چکناہٹ آجاتی ہے، جس کاغذ میں متوازی دوری پر واٹر مارک کا نشان ہوتا ہے اسے اینٹک لیڈیڈ کہتے ہیں جس میں یہ نشان نہیں رہتا اسے اینٹک بوڈ کہتے ہیں۔

(2) **ایم ایف پرنٹنگ پیپر:** اس کاغذ کی سطح اینٹک کے مقابلے میں چکنی ہوتی ہے، اور یہ اینٹک بوڈ سے پتلا ہوتا ہے، کیونکہ اسے مشین پر چکنانے پر اس کی موٹائی گھٹ جاتی ہے۔

(3) **سپر کلینڈر پیپر:** اس کاغذ میں چکناہٹ ہوتی ہے کیونکہ اس میں چینی مٹی کا جز پایا جاتا ہے، جس سے اس کی سطح میں چکناہٹ کے ساتھ ساتھ چمک بھی ظاہر ہوتی ہے۔

(4) **ان لے آرٹ پیپر:** یہ انامل کوٹیڈ کاغذ ہے جس کے ایک طرف ایک رنگ اور دوسری طرف دوسرا رنگ ہوتا ہے، اس قسم کا کاغذ زیادہ تر اشتہاری کاموں کے لیے کارآمد ہوتا ہے۔

(5) **آرٹ پیپر:** جو کاغذ چکنا کیا رہتا ہے اسے آرٹ پیپر کہتے ہیں۔ اس کاغذ میں چینی مٹی اور سریش کا جز شامل رہتا ہے، جس سے کاغذ یکساں اور چکنا ہوتا ہے، یہ کاغذ ٹائپ کے ذریعے سے طباعت کے لیے کافی موزوں مانا جاتا ہے۔ آرٹ پیپر کی ایک قسم کروم آرٹ پیپر بھی ہے۔ یہ کاغذ کافی چمکیلا ہوتا ہے۔ صرف آرٹ پیپر میں دونوں جانب چکناہٹ ہوتی ہے۔ جبکہ کروم آرٹ پیپر میں ایک جانب یہ کاغذ بلاک کے پروف کے لیے زیادہ موزوں ہے۔

(6) **ہینیڈ پیپر:** یہ کاغذ مشین کی بجائے ہاتھوں سے تیار کیا جاتا ہے، اس لیے اسے ہینڈ یڈ پیپر کہتے ہیں، ایسے کاغذ تیار کرنے کے لیے صاف کپڑوں کے چیتھڑوں کو سڑا کر لگدی تیار کی جاتی ہے، اس قسم کا کاغذ بہت ہی چکنا مضبوط اور ٹکاؤ ہوتا ہے، اسی لیے ایسے کاغذ کا استعمال ایسے کاموں میں بھی ہوتا ہے جنھیں بہت دنوں تک محفوظ رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسے سند (Certificate) یا دستاویزی اشیا۔

(7) **مولڈ میٹر پیپر:** یہ عام قسم کی مشین سے تیار کیا ہوا اینٹک لیڈیڈ کاغذ ہے، مضبوطی اور چڑا پت میں یہ قریب قریب ہاتھ سے بنے کاغذ کے ہم پلہ ہوتا ہے۔

(8) **کریم لیڈیڈ اور بوو:** یہ لکھنے کے لیے کافی موزوں کاغذ ہے، یہ کاغذ دو طرح کے تیار کیے جاتے ہیں، (الف) اے۔ ٹی۔ ایس (ب) (ای۔ ایس۔ اے۔ ٹی۔ ایس کاغذ کی بناوٹ میں چکناہٹ پیدا کرنے کے لیے لگدی میں ہی ریجن اور پھٹکری ملائی جاتی ہے۔ حقیقت میں کریم اور بووپیپر میں فرق صرف رنگ کا ہوتا ہے، ویسے یہ کریم ہی کے قسم کا کاغذ ہے۔

(9) **بانڈپیپر:** یہ پتلا ہوتا ہے، اس کی سطح میں چکناہٹ نہیں ہوتی یہ لکھنے اور ٹائپ کرنے کے لیے زیادہ مناسب کاغذ ہے۔

(10) یہ کاغذ بہت ہی مضبوط ہوتا ہے، اسی لیے اس کا استعمال زیادہ تر بنڈل وغیرہ لپیٹنے کے کاموں میں ہوتا ہے۔

(11) **کورپیپر:** یہ کاغذ وزنی موٹا اور مضبوط ہوتا ہے، اس کا زیادہ تر استعمال کتابوں کے Cover کے لیے ہوتا ہے۔

(12) **نیوز پیپر:** یہ کاغذ زیادہ تر اخبار چھاپنے کے کام آتا ہے، یہ چکنا اور روکھا بھی ہوتا ہے، چکنے نیوز پیپر کو میکینکل کہتے ہیں۔

(13) **بلاٹنگ پیپر:** یہ کاغذ چیتھڑوں سے تیار کیا جاتا ہے، اس میں سیاہی کو جذب کرنے کی خاص صلاحیت ہوتی ہے۔

(14) **کاف لیدر اور کلاتھ پیپر:** مذکورہ کاغذ دیکھنے میں کپڑے کی شکل کا ہوتا ہے، یہ سپاٹ اور ابھرا ہوا کاغذ ہے، اس قسم کا کاغذ جلد سازی میں کام آتا ہے۔

(15) **چیک پیپر:** یہ کاغذ اوسط درجے کا مانا جاتا ہے، جو لکھنے کے لیے زیادہ موزوں ہے۔

(16) **کریئن پیپر** (Crean Paper): کاٹریج پیپر کے اوسط گروپ کا کاغذ ہے، یہ کاغذ ڈرائنگ اور اسکیچ (Sketch) وغیرہ کاموں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

(17) **برسٹل بورڈ:** اس کاغذ کا نام برسٹل اس لیے رکھا گیا ہے کہ یہ پہلے پہل برسٹل میں تیار کیا گیا، یہ کاغذ بھی ڈرائنگ کے کام آتا ہے۔

(18) **ائیرین بورڈ:** یہ برسٹل بورڈ میں تھوڑا معمولی درجے کا ہے، اس کا استعمال پوسٹ کارڈ یا اس طرح کی چیزوں میں ہوتا ہے۔

(19) **گریز پروف پیپر:** یہ چکنا کاغذ ہے، اس پر گھی، تیل مکھن کا اثر نہیں پڑتا۔ اس لیے یہ چکنی اشیا پر لپیٹنے کے کام آتا ہے، یہ کاغذ لکڑی کی لگدی سے تیار کیا جاتا ہے۔

(20) **انڈیا پیپر:** مذکور کاغذ کا استعمال ایسی طباعت کے لیے کیا جاتا ہے جہاں کم جگہ میں زیادہ سے زیادہ مواد دیتا ہے، تاکہ مطبوعہ کتاب سستی ہو اور ضخامت بھی زیادہ نہ ہو۔

(21) **ڈپلیکینگ پیپر:** یہ لیڈیڈ یا بووقسم کا کاغذ ہے۔ اس میں سیاہی اور رقیق مادے کو جذب کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس قسم کے کاغذ پر طباعت کے دوران سیاہی نہیں پھیلتی۔

(22) **انامل پیپر:** یہ کاغذ ایک طرف کافی چکنا تیار کیا جاتا ہے اور دوسری طرف اس کے برعکس دفتی کے بکس پر لپیٹنے کے کام میں آتا ہے۔

(23) **فیدروھیٹ پیپر:** یہ کاغذ ایک خاص قسم کی گھاس کی لگدی سے تیار کیا جاتا ہے، لیڈیڈ اور بووونوں قسم کا ہوتا ہے۔ یہ کاغذ موٹا ہونے کے باوجود ہلکا ہوتا ہے۔

(24) **فلنٹ پیپر:** یہ کاغذ بھی ایک طرف چکنا ہوتا ہے اور یہ بھی دفتی کے لیے بکس پر لپیٹنے کے کام آتا ہے۔

(25) **کرافٹ پیپر:** یہ کاغذ کاٹھ کے لگدوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ یہ چکنا اور روکھا ہونے کے علاوہ کافی چمڑا بھی ہوتا ہے۔ مذکورہ کاغذ بنڈل باندھنے یا لپیٹنے کے کام میں آتا ہے۔

(26) **لیٹیکس پیپر:** مذکورہ کاغذ جس لگدی سے تیار کیا جاتا ہے اس میں ربر کا بھی جز وملایا جاتا ہے تاکہ چمڑا اور مضبوط ہو۔

(27) **ایم جی پیپر:** یہ کاغذ ایک طرف چکنا اور دوسری طرف روکھا ہوتا ہے، اسے پوسٹر پیپر بھی کہا جاتا ہے۔ یہ پوسٹر چھاپنے کے کام آتا ہے۔

(28) **منیلا پیپر:** یہ کاغذ منیلا پارٹ کی لگدی سے تیار کیا جاتا ہے، یہ کاغذ بنڈل لپیٹنے کے علاوہ لفافہ بنانے کے کام بھی آتا ہے۔

(29) **اونیئن اسکن پیپر:** یہ کاغذ چکنا اور عکسی ہوتا ہے، یہ ٹائپ کرنے کے علاوہ اور بھی کاموں میں آتا ہے۔

(30) **پارچمنٹ پیپر:** یہ حد سے زیادہ مضبوط ہونے کے علاوہ ٹکاؤ کاغذ ہے۔

(31) **اسٹران بورڈ پیپر:** معمولی دفتی کو اسٹران بورڈ کہتے ہیں، یہ جلد سازی کے کام آتا ہے۔

(32) **لیدر بورڈ پیپر:** یہ اسٹران بورڈ سے مضبوط دفتی کا کاغذ ہے یہ کاغذ بھی جلد سازی کے کام میں آتا ہے۔

(33) **ٹریسنگ پیپر:** یہ کاغذ چکنا چمڑا اور عکسی ہوتا ہے، اس اعتبار سے جس چیز کی نقل کرنی ہو تو اس کاغذ کو اس پر رکھ دینے سے اس کا عکس صاف نظر آتا ہے، جسے آسانی سے نقل کیا جاسکتا ہے۔ غرض یہ کہ مذکورہ کاغذ نقل کرنے کے کام آتا ہے۔

(34) **مشین فنش پیپر** (Machine Finish Paper): گرافس درجے کا ہوتا ہے، یہ کاغذ ہاف ٹون بلاک کے ذریعے طباعت میں کام آتا ہے۔

(35) **بل فنش پیپر** (Machine Finish paper) کی طرح کا ہوتا ہے اور استعمال بھی اسی کاغذ کی طرح ہوتا ہے، صرف نام کا فرق ہے۔

(36) **اینٹک لیڈ پیپر** (Antic led Paper): کاغذ روکھے قسم کا ہوتا ہے۔ مواد کم ہونے کے باعث کتاب کی موٹائی کے لیے اس کاغذ کا استعمال کیا جاتا ہے۔

(37) **فیدر لیڈ پیپر:** یہ کاغذ Anic led کی طرح کا ہوتا ہے مگر یہ بہت ہلکا ہوتا ہے۔

(38) **آبری فنش پیپر:** اس کاغذ کو بعض لوگ سپر کلینڈر جی کہتے ہیں، ویسے یہ الگ قسم کا کاغذ ہے مگر ساری صنعت سپر کلینڈر جیسی ہے۔

(39) **میکنیکل پیپر:** یہ ایک کمزور قسم کا کاغذ ہے جو سستا بھی ہوتا ہے۔

(40) **ریمیڈ پیپرس:** یہ قیمت کے لحاظ سے سستا لیکن موٹا اور مضبوط کاغذ ہے۔ یہ کاغذ عموماً پارسل وغیرہ باندھنے میں کام آتا ہے۔

(41) **ٹسو پیپر:** یہ کافی باریک کاغذ ہے جو ہر رنگ میں دستیاب ہوتا ہے، اس کا استعمال صرف پتنگ بنانے میں ہوتا ہے۔

(42) **باکس پیپر:** یہ ایک منفرد قسم کا خوبصورت اور چمکدار کاغذ ہے۔

(43) **کلاتھ لائن پیپر:** یہ کپڑے کا استر لگا ہوا کاغذ ہوتا ہے، یہ رجسٹری اور بیمہ کے لفافے بنانے میں کام آتا ہے۔

(44) **کاربن پیپر:** یہ ایک مہین قسم کا کاغذ ہے جس کے ایک طرف سیاہ یا رنگین مصالحہ لگا ہوتا ہے۔ یہ نقل کرنے کے استعمال میں آتا ہے۔

(45) **فائر پروف پیپر:** یہ کاغذ اسبٹس کے مصالحہ سے تیار ہوتا ہے اور قیمتی دستاویزوں پر لپیٹنے میں استعمال ہوتا ہے۔

اب ہم کاغذ کے مختلف سائزوں کے متعلق بھی معلومات حاصل کریں گے جو اس طرح ہے:

(1)	فل اسکیپ	13.50 X 17.00
(2)	کراؤن	15.00 X 20.00
(3)	ڈیمائی	17.50 X 23.50
(4)	ڈبل فل اسکیپ	17.00 X 27.00
(5)	ایمپیریل	22.00 X 30.00
(6)	رائل	20.00 X 25.00
(7)	سپر رائل	20.50 X 27.50
(8)	میڈیم	18.00 X 23.00
(9)	ڈبل ڈیمائی	22.00 X 30.00
(10)	ڈبل کراؤن	20.cc X 30.00
(11)	پوسٹ	15.75 X 19.50
(12)	لارج پوسٹ	1950 X 21.00

غرض کاغذ کے یہ مختصر اقسام بیسویں صدی کے درمیانی دور میں تیار کیے جاتے رہے ہیں، اب امید قوی ہے کہ جدید تکنیکی ڈھنگ سے اور بھی کاغذ تیار کیے جارہے ہوں یا کیے جائیں جسے اپنی افادیت میں انفرادیت حاصل ہو۔

■

Sultan Azad
Pannu Lane, Gulzarbagh
Patna - 7 (Bihar)
Mob.:8789934730

فضائی آلودگی

حمیدادیبی نانڈوروی

ہر جاندار کے لیے صاف ہوا کی سخت ضرورت ہے کیونکہ زندگی کا انحصار ہوا پر ہے۔ اگر سانس کے ذریعے جسم میں صاف ہوا کی بجائے خراب ہوا داخل ہو تو زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ آج کل پوری دنیا فضائی آلودگی کا شکار ہے۔ اس لیے ہر ملک میں فضا کو خوشگوار بنانے کی کوششیں تیز ہوگئی ہیں تا کہ وہاں کے شہری اچھے اور صحت مند رہیں۔ ہندوستان میں بھی ماحول کو صاف اور صحت مند رکھنے کی کوشش ہو رہی ہے۔

فضائی آلودگی نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا کا مسئلہ ہے۔ اس سے کئی امراض لاحق ہوکر انسانی زندگی کی ہلاکت کا پیش خیمہ ثابت ہو رہے ہیں۔ اس سے لاحق ہونے والے امراض میں دمہ، کھانسی، زکام، پھیپھڑوں کا سرطان، جگر کی کمزوری اور جگر پر سوجن وغیرہ شامل ہیں۔ فضائی آلودگی سے بچاؤ کے لیے گرد و پیش میں صاف صفائی کرنا اور اسے برقرار رکھنا زیادہ سے زیادہ پیڑ لگانا، سیر کرنا، روزانہ آٹھ دس نیم کے پتے کھانا اور روزانہ دو تین لیٹر پانی پینا ضروری ہے۔

گذشتہ دنوں فضائی آلودگی دارالسلطنت دہلی میں ایک قہر بن کر آئی تھی۔ اس کے تدارک کے لیے تدبیریں کی گئیں۔ سب سے پہلے تو شہریوں نے منہ اور ناک پر کپڑا لگایا تا کہ ہوا میں موجود صحت پر اثر انداز ہونے والی کثافت سانس کے ذریعے جسم میں داخل نہ ہونے پائے۔ وہاں کی حکومت نے بھی کافی کوشش کی تا کہ وہاں کی آب و ہوا جلد یا بدیر آلودگی سے پاک ہو جائے۔

ذرائع ابلاغ کے بموجب ملک میں صاف ہوا کے لیے مہاراشٹر دوسرے نمبر پر ہے مگر پھر بھی مہاراشٹر میں 2017 میں فضائی آلودگی کے سبب ایک لاکھ سے زائد افراد موت کے منہ میں چلے گئے۔ پوری ریاست اور خاص طور سے ضلع چندر پور فضائی آلودگی کے سبب ہوا کے معیار کے سلسلے میں سب سے خراب مانا گیا۔

چھ دسمبر 2018 کو ہندوستان کی فضائی آلودگی کا جائزہ لینے پر دی لین سیٹ پلینٹری ہیلتھ (The Lancet Planatary Health) یعنی کرۂ ارض پر صحت کے اعتبار سے ہوا کا معیار ناپنے والے ادارے نے اپنی رپورٹ میں انکشاف کیا ہے کہ ہندوستانی آبادی کا لگ بھگ ستر فیصدی حصہ معیاری ہوا کے تحفظی حدود کی سطح (Level) سے اوپر بیرونی فضائی آلودگی کا شکار ہوتا ہے جبکہ شمالی ہند کی ریاستیں اس سے بھی زیادہ بلند سطح پر متاثر ہوتی ہیں۔

ماحولیاتی آلودگی کے موضوع پر منعقدہ ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے مختلف ماہرین ماحولیات نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ وزارتِ صحت اور خاندانی بہبود کے متعلقہ محکمے کے سکریٹری پروفیسر بلرام بھارگوا نے کہا کہ ریاست میں اندرونی اور بیرونی فضائی آلودگی کے اثرات کا جائزہ لینا نہایت ضروری ہے۔ اس ضمن میں ماحولیاتی صحت برقرار رکھنے والے محکمے کی ڈائرکٹر پروفیسر کلپنا بال کرشنن Prof. Kalpana Balkrishana نے کہا ہے کہ ذرائع ابلاغ کے پاس عالمی اور ہندوستان کی ریاستوں میں فضائی آلودگی کے سبب قبل از وقت واقع ہونے والی اموات اور امراض کے بڑھتے شواہد موجود ہیں۔

تمام ماہرین کی آرا سے پتہ چلا کہ 265 مائکرون کی سائز کے اجزا پر مشتمل آلودگی سانس کے ذریعے انسان کے جسم کے اندر داخل ہوکر پھیپھڑوں کو بڑا نقصان پہنچاتی ہے اور اس سے طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔

گذشتہ برس ریاست مہاراشٹر میں صرف ماحولیاتی آلودگی کے سبب کم از کم 62,677 اموات واقع ہوئیں یعنی کل اموات میں سے ساٹھ فیصدی اموات فضائی

آلودگی کی وجہ سے ہوئیں۔ یہاں سوچنے والی بات یہ ہے کہ جب مہاراشٹر کا یہ حال ہے تو دوسری ریاستوں کا کیا حال ہوگا۔ ظاہر ہے کہ وہاں بھی کئی ہلاکتیں ہوئی ہوں گی۔ یعنی فضائی آلودگی کے سبب ملک بھر میں کروڑوں افراد جاں بحق ہو جاتے ہیں جو کہ ایک تشویشناک امر ہے اور اس کا تدارک ضروری ہے۔

میڈیکل سائنس کے کل ہند ادارے All India Institute of Medical کے ڈائرکٹر جناب رندیپ گلیریا Randeep Galeria نے بتایا کہ موسم سرما میں فضائی آلودگی اپنے شباب پر ہونے سے پیدا ہونے والی صورتِ حال سے ساری دنیا واقف ہے مگر ایسا سمجھا جا رہا ہے کہ خاص طور سے شمالی ہند میں یہ معاملہ اب سال بھر کی پریشانی والا بن گیا۔ فضائی آلودگی سے انسان کی صحت متاثر ہوتی ہے کہ یہ تو صحیح ہے مگر انسان کو موسمی ہواؤں سے ہونے والی بیماری سے زیادہ فضائی آلودگی متاثر کرتی ہے اور وقت بہ وقت بیماریاں پھیل جاتی ہیں۔ جناب گلیریا نے مزید کہا کہ فضائی آلودگی آج پھیپھڑوں کی متعدد بیماریاں پھیلا کر ایک خطرناک شکل اختیار کر گئی ہے۔ پھیپھڑے کے سرطان کے لیے تو یہ زیادہ خطرناک ثابت ہو رہی ہے۔ دنیا کی آبادی کے لیے یہ اٹھارہ فیصدی ہے، مگر صرف ہندوستان کے لیے چھبیس فیصدی ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے یہاں صحت کے نقصان ہونے سے قبل از وقت موت واقع ہو جاتی ہے۔ ذہن نشیں رہے کہ تحقیق کی فضائی آلودگی کے اسباب کا اب تک کوئی سراغ نہیں لگ سکا۔ مگر محققین کا دعویٰ ہے کہ کوئلہ جلنے سے اٹھنے والا دھواں، کارخانے اور فیکٹری سے نکلنے والی زہریلی کیمیائی گیس، سڑک و راستے کی کثیف دھول مٹی، نالیوں سے گندی اور بدبودار ہوا، کھیتوں میں بے کار پودوں کو جلانے سے اٹھنے والا دھواں، سڑک پر دوڑتی موٹر گاڑیوں سے نکلنے والا دھواں فضائی آلودگی پیدا کرنے میں پیش پیش ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ستر سال سے کم عمر والے افراد کو فضائی آلودگی کے اثرات زیادہ جھیلنے پڑتے ہیں اور وہ موت کے گھاٹ آسانی سے اتر جاتے ہیں کیونکہ جن افراد کی اموات واقع ہوئی ہیں، ان میں ستر سال سے کم عمر والے افراد کی تعداد نصف ہے۔ جائزہ رپورٹ میں یہ بھی انکشاف کیا گیا ہے کہ اب تمباکو نوشی سے ہونے والے امراض سے بھی زیادہ امراض فضائی آلودگی کے سبب رونما ہو رہے ہیں۔ اس کی وجہ سے تنفسی مرض، سانس کم پڑنا یا پھول جانا، حرکت قلب بند پڑنا، فالج، ذیابیطس اور پھیپھڑے کا سرطان وغیرہ جیسے امراض لاحق ہو جاتے ہیں۔

مرکزی وزارتِ صحت کے ماتحت خدمت انجام دینے والے محکمے کے ڈائرکٹر جنرل جناب ایس۔ وینکٹیش کہتے ہیں کہ وہ کئی ایک لائحۂ عمل مرتب کرنے والے ہیں، جو عوام میں بیداری پیدا کریں گے کہ کس طرح ماحول کی آلودگی پر قابو پایا جا سکتا ہے اور اس سے بچاؤ کیا جا سکتا ہے تاکہ وہ عوام کی صحت پر اثر انداز نہ ہو سکے۔

سینہ تحقیقاتی ادارہ (Chest Research Foundation) کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سندیپ سالوی نے کہا ہے کہ اب مہاراشٹر میں ہونے والی اموات میں اضافہ ہو رہا ہے کیونکہ عوام میں فضائی آلودگی کے سلسلے میں بیداری نہیں ہے۔ عوام نہیں جانتے کہ فضائی آلودگی انسان کی صحت پر کس قدر بری طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ اگر یہ معلوم ہو جائے تو عوام ضرور فضائی آلودگی کے بارے میں پیش بندی سے کام لیں گے۔ اس لیے ہم تلقین کرتے ہیں کہ لوگ فضائی آلودگی سے نہ صرف تحفظ کی تدابیر اختیار کریں، بلکہ اسے پیدا بھی نہ کریں کیونکہ پیش بندی علاج سے بہتر ہے۔

انسان کے مختلف افعال کے نتیجے میں بے کار مادّے پیدا ہوتے ہیں۔ روزمرہ زندگی میں انسان کئی اشیا استعمال کرتا ہے۔ یہ اشیا کئی قسم کی ہوتی ہیں۔ ان میں سے کچھ بے کار ہوتی ہیں اور کچھ دوبارہ استعمال کے قابل ہوتی ہیں۔ بے کار اشیا یا مادّوں کی نکاسی کرنی پڑتی ہے۔ اگر نکاسی مناسب طریقے سے نہیں کی گئی تو بیکار چیزیں یا مادّے پانی، زمین اور ہوا میں گھل مل کر فضائی آلودگی پیدا کرتے ہیں۔ یہ بات معاشی ترقی، خوشگوار ماحول اور حفظانِ صحت کے نقطۂ نظر سے سنگین مسئلہ ہی نہیں، فطرتی (Natural) اور انسانی مسکن کے لیے بھی ایک خطرہ ہے۔ اس لیے فطرتی خوشگوار اور صحت مند زندگی کا تقاضا ہے کہ

فضائی آلودگی سے انسان کی صحت متاثر ہوتی ہے کہ یہ تو صحیح ہے مگر انسان کو موسمی ہواؤں سے ہونے والی بیماری سے زیادہ فضائی آلودگی متاثر کرتی ہے اور وقت بہ وقت بیماریاں پھیل جاتی ہیں. جناب گلیریا نے مزید کہا کہ فضائی آلودگی آج پھیپھڑوں کی متعدد بیماریاں پھیلا کر ایک خطرناک شکل اختیار کرگئی ہے۔ پھیپھڑے کے سرطان کے لیے تو یہ زیادہ خطرناک ثابت ہورہی ہے۔ دنیا کی آبادی کے لیے یہ اٹھارہ فیصدی ہے، مگر صرف ہندوستان کے لیے چھبیس فیصدی ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے یہاں صحت کے نقصان ہونے سے قبل از وقت موت واقع ہوجاتی ہے۔

تازہ اور صاف ہوا کا ہمیشہ خیال رکھا جائے۔ خراب ہوا یعنی فضائی آلودگی سے ماحول کو پاک رکھنا ہم سب کی ذمے داری بھی ہے۔

ماحولیات کے تئیں بیداری کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی اچھی صحت کا دار و مدار صاف ہوا پر ہے اور ہوا میں آلودگی اس کے لیے ایک خطرہ ہے۔ اگر ہوا صاف اور بہتر بنانے کی کوشش نہیں کی گئی تو ایک دن ایسا آئے گا، جب انسان صاف ہوا کے لیے ترسے گا اور دھیرے دھیرے اس کا وجود ختم ہو جائے گا۔ فضائی آلودگی اسی وقت ختم ہوگی جب حکومت اور ذمے دار ادارے کمر بستہ ہو کر اس کا مقابلہ ایک چیلنج کی صورت میں کریں گے۔

■

Hameed Adeebi Nandorvi
Gulshan-e-Urdu, Room Nom: 27
Bangri Wala Chaal, Quraish Nagar
Kurla (w)
Mumbai - 456001 (MS)

عظیم اقبال

اوزون کو درپیش خطرہ

اوزون کیا ھے؟

اوزون وہ پرت ہے جو آفتاب کی بالا بنفشی (Ultra Violet) شعاعوں کو زمین تک آنے سے پہلے 97 سے 99 فی صد تک جذب کر لیتی ہے۔ یہ پرت زمین سے اوپر 30 سے 40 کیلومیٹر تک پر واقع ہے۔

اوزون کی مزید تفصیل

اس کے متعلق بتایا گیا ہے:

"A blue gaseous allotrope of Oxygen No, Derived or formed naturally from diatomic oxygen by electric discharge or exposure to ultra violet radiation."

تشکیل

ظاہر ہے یہ آکسیجن کی ایک شکل ہے جس کی تشکیل سابقہ بنفشی شعاعوں کی تابکاری سے ہوتی ہے۔

کھوج

اوزون گیس کی پرت کی کھوج فرانسیسی ماہر طبیعیات 'چارلس فیبری' اور 'ہیزن بن' نے کی تھی۔ اس کے اوصاف کے متعلق تفصیلی تفتیش برطانوی سائنس داں، جو موسموں کا مطالعہ کر رہے تھے، جی، ایم، بی، ڈالسیف کے ذریعے ہوئی۔ اس کے لیے انھوں نے ایک 'اسپیکلو فوٹو میٹر' تیار کی۔ اس کی مدد سے زمین کے اوپر واقع اوزون پرت کے فاصلے کی پیمائش ہو سکتی ہے۔

نیٹ ورک کی تیاری

اس فاصلے کی پیمائش اور اوزون کی آگہی کے لیے ڈالسیف نے 1928 سے 1958 کے درمیان ساری دنیا میں اوزون کی شناخت اور پیمائش کے لیے پورا نیٹ ورک (Network) یا ڈھانچہ تیار کیا۔ وہ آج تک عمل پیرا ہے۔ ڈابسن نے دنیا کے مختلف مقامات پر اوزون کی پیمائش کے مستقر (Station) قائم کیے تھے، جو اوزون کی موجودگی کی پیمائش کرتے ہیں اور اس کے حجم کو ڈالسیف پوائنٹ کی شکل میں بتاتے ہیں۔

ڈابسن پوائنٹ

اوزون کے حجم کا یہ یونٹ نام ڈابسن کے اعزاز میں رکھا گیا تھا۔ اوزون کی فوٹو کیمیکل میکانزم کو 1930 میں برطانوی ماہر طبیعیات، سڈنی جیپ مین کی تلاش سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کی تحقیق سے پتہ چلا کہ یہ آکسیجن کی اعلیٰ شکل (ایلوٹروپ) ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس گیس میں آکسیجن کے ہی جوہر ہوتے ہیں، لیکن ان کی تعداد اور انصرام آکسیجن سے مختلف ہوتی ہے۔

اوزون کی پرت کو جن بنیادی اشیا سے خطرہ ہے، وہ ہیں نائٹرک، آکسائڈ، نائٹرس آکسائڈ، ہائڈروکسل، ایٹامک کلورین اور ایٹامک برومائن۔ اگرچہ یہ اشیا قدرتی شکل میں زمین پر موجود ہیں، تاہم حال کے دنوں میں انسان کے ذریعے تیار شدہ 'آرگے نوہیلوزرین' کے کمپاؤنڈ بڑی تعداد میں تیار ہونے کے سبب اوزون کی پرت کو بھاری نقصان پہنچا ہے۔ ان اشیا کے ایک جوہر میں ایک لاکھ اوزون جوہروں کو برباد کرنے کی صلاحیت ہوتی۔

آکسیجن کے ایک جوہر میں دو ماتحت جوہر ہوتے ہیں، جبکہ اوزون میں آکسیجن کے تین ماتحت جوہر ہوتے ہیں۔

انصرام

یہ جوہر ایک مثلث کی شکل میں منظم ہوتے ہیں۔ کرۂ ارض کی اوپری پرتوں میں اس کی تشکیل آفتاب سے آنے والی بالا بنفشی روشنی کے آکسیجن پر ردعمل سے ہوتا ہے۔ یہ اوزون پرت آفتاب سے آنے والی بالا بنفشی شعاعوں کو جذب کر لیتی ہے۔

شعاعوں کا رنگ

آفتاب کی بے رنگ روشنی میں سات رنگ کی شعاعیں نہاں ہوتی ہیں۔ بیگن، جامن، نیلی، سبز، زرد، نارنجی اور سرخ— ان سات رنگوں میں بیگن رنگ کی آمیزش سب سے کم ہوتی ہے۔ بیگنی رنگ کی شعاعوں کی ویولینتھ (Wave Length) سب سے کم ہوتی ہے۔

بالا بنفشی شعاعیں

بالا بنفشی شعاعوں میں بہت زیادہ توانائی ہوتی ہے۔ ان شعاعوں کی زیادہ مقدار کے رابطے میں آنے سے جسم کی جلد جھلس جاتی ہے۔ اتنا ہی نہیں ان سے جلد کا سرطان (Cancer) بھی ہو سکتا ہے۔ آفتاب کی شعاعوں میں ان شعاعوں کی بہت زیادہ مقدار ہوتی ہے۔ لیکن کرۂ ارض کے بالائی حصے میں موجود اوزون گیس کی پرت انھیں جذب کر لیتی ہے۔ اس سے زمین تک ان کی بہت کم مقدار آپاتی ہے۔ کم مقدار میں ان کے آنے سے کچھ فائدہ بھی ہے۔ اس سے کچھ جراثیم (Bacteria) فوت ہو جاتے ہیں۔ پھر انھیں کے وسیلے سے جلد میں موجود سادہ وٹامن ڈی میں بدل جاتا ہے۔

آنکھوں کو ضیاع

بالا بنفشی شعاعیں آنکھوں کے لیے بہت مضر ہیں۔ ان کے اثر سے محفوظ رہنے کے لیے رنگین شیشے کا چشمہ لگانا ضروری ہے۔

اوزون کو خطرہ

اوزون کی پرت کو جن بنیادی اشیا سے خطرہ ہے، وہ ہیں نائٹرک، آکسائڈ، نائٹرس آکسائڈ، ہائڈروکسل، ایٹامک کلورین اور ایٹامک برومائن۔ اگرچہ یہ اشیا قدرتی شکل میں زمین پر موجود ہیں، تاہم حال کے دنوں میں انسان کے ذریعے تیار شدہ 'آرگے نوہیلوزرین' کے کمپاؤنڈ بڑی تعداد میں تیار ہونے کے سبب اوزون کی پرت کو بھاری نقصان پہنچا ہے۔ ان اشیا کے ایک جوہر میں ایک لاکھ اوزون جوہروں کو برباد کرنے کی صلاحیت ہوتی۔

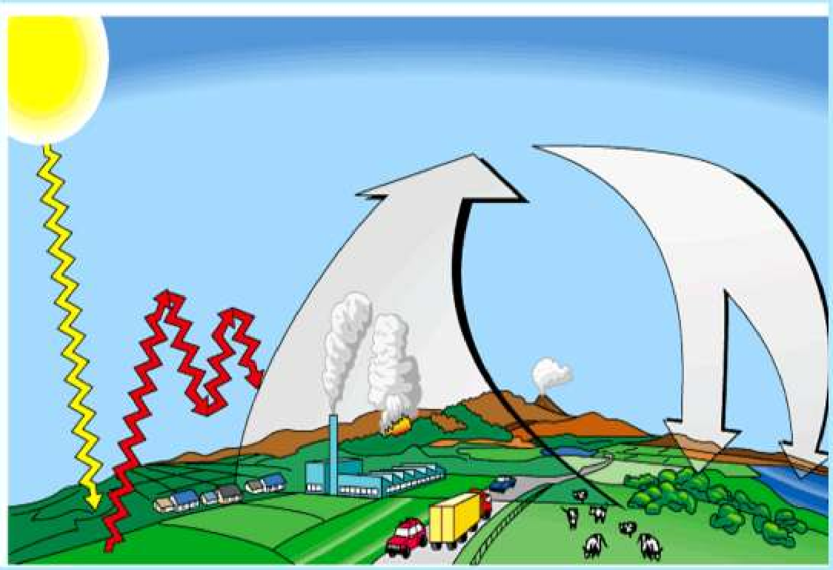

اثرات

اوزون کے جوہروں کے برباد ہونے سے اس میں بالا بنفشی شعاعوں کو جذب کرنے کی صلاحیت گھٹ جاتی ہے۔ نتیجتاً غیر جذب شدہ خطرناک بالا بنفشی شعاعیں راست زمین پر آتی ہیں۔

زمین کے شمالی قطب میں اوزون کی چھتری سوفی صد دہے (Decade) کی در سے کم ہو رہی ہے۔ اس طرح شمالی قطبین کے اوپر یہ 5 فی صد (5%) کی در سے کم ہو رہی ہے۔ وہاں یہ اتنی کم ہوگئی ہے کہ اس میں بڑے، بڑے سوراخ ہوگئے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ انسانی سرگرمیوں کے ذریعے نائٹرس آکسائڈ کی سب سے زیادہ پیداوار کے نتیجے میں اوزون پرت کو کافی نقصان ہوا ہے۔

ممانعت

اسپرے (Spray) میں استعمال ہونے والی گیس، اوزون کو سب سے زیادہ نقصان پہنچاتی ہے۔ لہٰذا 1978 میں امریکہ، کناڈا، ناروے نے ہوا ملی ہون اسپرے، پر پابندی لگا دی، کیونکہ اوزون کو نقصان اس سے ہوتا ہے۔ پھر بھی پرفیوم اور دوسرے اسپرے کے چلن کو روکا نہیں جا سکتا۔ یوروپ کے ممالک نے اس ممانعت کو قبول نہیں کیا تو اقوام متحدہ نے کلورو فلورو کاربن گیسوں کا استعمال بند نہیں کیا۔

تشویش

آخرکار 1985 میں انٹارکٹک کے خطے کے اوپر اوزون میں ایک بڑا سوراخ بن گیا، جو بالا بنفشی شعاعوں کے زمین پر پہنچنے میں بڑا خطرہ بن گیا ہے۔ نتیجتاً 1995 میں عالمی سطح پر سی، ایف سی کے استعمال پر پابندی لگانے کے لیے ترقی یافتہ ممالک کے درمیان ایک مفاہمت ہوگئی۔ تقریباً پونے دو سو ممالک اس مفاہمت پر دستخط کر چکے ہیں لیکن امریکہ نے اس کے استعمال پر پابندی نہیں عائد کی ہے۔

عزیز دوستو!

قرآنِ کریم میں قدرت کے عوامل کا جائزہ لینے کی بڑی تاکید ہے۔ جس قدر ان عوامل پر نگاہ ڈالیں گے، خدا کی عظمت کے قائل ہوں گے۔ آیئے یہ عہد کریں کہ قدرت کے عوامل سے چھیڑ چھاڑ سے حتی الامکان گریز کریں گے!

■

Azim Iqbal
Adabistan Ganj No 1
Bettiah - 845438 (Bihar)

گرافکس
(Graphics)

ایم ایس-ورڈ میں گرافکس سے متعلق کئی سہولیات دستیاب ہیں، جن کی مدد سے آپ تصویر وغیرہ بنا سکتے ہیں، ان کا سائز بدل سکتے ہیں، انھیں خواہش کے مطابق کہیں بھی لگا سکتے ہیں اور سجا سکتے ہیں۔ آپ اپنی بنائی تصویروں کے علاوہ ایم ایس-ایکسیل، پاور پوائنٹ اور دیگر پیکجوں کے بنائے چارٹ، اسکینر کے ذریعے کھینچے گئے فوٹو یا کوئی بھی تصویر وغیرہ، جو کمپیوٹر میں اسٹور کی جا سکے، اس میں استعمال کر سکتے ہیں۔ درحقیقت، ایم ایس-آفس کئی پہلے سے بنی تصویروں کے ساتھ بھی آتا ہے، جنھیں کلپ آرٹ (Clip Art) کہتے ہیں۔ آپ کلپ آرٹ گیلری میں سے کسی بھی تصویر کو چن کر اس کا خواہش کے مطابق استعمال کر سکتے ہیں۔

اس باب میں ہم ایم ایس-ورڈ میں تصویر بنانا بتائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی کلپ آرٹ، اسمارٹ آرٹ اور چارٹ گیلری کا استعمال اور ورڈ آرٹ (Word Art) کے بارے میں بھی بتائیں گے۔

ایم ایس ورڈ میں تصویر لگانا (Illustrations in MS-Word)

ایم ایس-ورڈ میں عام تصویر (Drawing) بنانے کا کام اس کے Insert ٹیب

تصویر WD-5.1: انسرٹ ٹیب

کے Illustrations حصہ میں موجود بٹنوں کی مدد سے کیا جاتا ہے۔

اس حصہ کی مدد سے آپ ہر طرح کی ڈرائنگ بنا سکتے ہیں اور ان پر مختلف قسم کے کام کر سکتے ہیں، جن کے بارے میں ہم آگے بتائیں گے۔ ہر ایک بٹن کسی خاص کام کے لیے ہے، یہ اس کے نام سے پتہ چلتا ہے۔ ماؤس پوائنٹر کو کسی بٹن پر لا کر تھوڑا رکنے پر اس بٹن کا نام نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی جیسے ٹیبل بناتے وقت ربن میں نئے ٹیب نمودار ہو جاتے ہیں، ویسے ہی تصویر بناتے وقت بھی ضرورت کے مطابق نئے ٹیب آ جاتے ہیں۔ ان بٹنوں اور ان کے ناموں کو ٹھیک طرح سے سمجھ لینا چاہیے۔ آگے کی سطور میں جگہ جگہ ان کا حوالہ دیا جائے گا۔

باہر کی تصویر لگانا (Importing Graphics)

ایم ایس-ورڈ کی السٹریشن سہولیات سے آپ دیگر پروگراموں جیسے کورل ڈرا، پینٹ، فوٹو شاپ، فوٹو ایڈیٹر وغیرہ کے ذریعے بنائی گئی تصویروں، گرافوں وغیرہ کو اپنی دستاویزوں میں کہیں بھی لگا سکتے ہیں۔ باہر سے لائی جانے والی تصویر آپ کے کمپیوٹر میں فائل کی شکل میں موجود ہونی چاہیے۔ انھیں دستاویز میں ڈالنے کے لیے پہلے نقطہ شمول (کرسر) کو وہاں لے جایئے، جہاں آپ تصویر کو ڈالنا چاہتے ہیں۔ اب 'Insert' ٹیب کے Illustration حصہ میں 'Picture' ہدایت دیجیے۔

اس سے آپ کی اسکرین پر تصویر WD-5.2 کی طرح 'Insert Picture' کا ڈائیلاگ باکس نظر آئے گا۔ اس میں 'Look in' باکس میں فولڈر کا نام بھریے اور اس میں مطلوبہ فائل کو کلک کیجیے۔ مطمئن ہونے پر 'Insert' بٹن کلک کیجیے، جس سے وہ تصویر آپ کی تصویر میں لگ جائے گی۔

تصویر WD-5.2: Insert Picture کا ڈائیلاگ باکس

فارمیٹ ٹیب (Format Tab)

ایم ایس-ورڈ میں کوئی بھی تصویر جوڑنے پر ربن میں Picture Tools ٹائٹل کے تحت فارمیٹ ٹیب (Format Tab) جڑ جاتا ہے، جس میں تصویر کو ایڈیٹ کرنے کے لیے بٹن دیے گئے ہیں۔ اس ٹیب میں کل چار حصے ہیں۔ منظم کرنا (Adjust)، تصویر کی بناوٹ (Picture Styles)، ترتیب دینا (Arrange) اور سائز (Size)۔

تصویر WD-5.3: Picture Tools کا فارمیٹ ٹیب

ایڈجسٹ حصہ میں بائیں طرف دیے گئے بٹنوں کی مدد سے آپ تصویر کی چمک (Brightness)، کنٹراسٹ (Contrast) اور رنگ (Recolor) سیٹ کر سکتے ہیں۔ دائیں طرف دیے گئے Compress Picture بٹن سے آپ تصویر کا سائز اپنی ضرورت کے مطابق ایڈجسٹ کر سکتے ہیں۔ اس بٹن پر کلک کرنے سے Compress Pictures ڈائیلاگ باکس (تصویر WD-5.4) کھلے گا۔ اس باکس کے 'Options' بٹن پر کلک کرنے سے ایک دیگر Compression Settings ڈائیلاگ باکس (تصویر WD-5.5) کھلتا ہے، جس کے چیک باکسوں اور ریڈیو بٹنوں کی مدد سے آپ تصویر کو ایڈجسٹ کر سکتے ہیں۔ جب آپ مطمئن ہو جائیں، تو OK بٹن پر کلک کر دیں۔ Change Picture اور Reset Picture کی مدد سے

تصویر WD-5.4: کمپریس پکچر کا ڈائیلاگ باکس

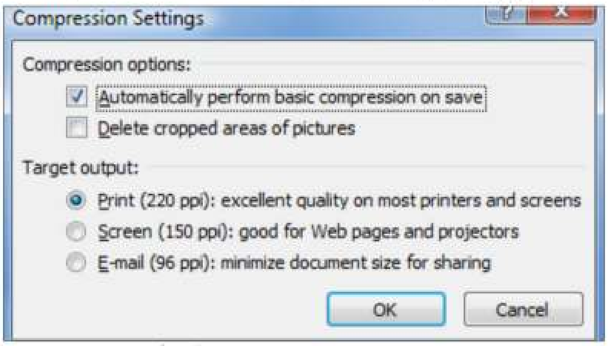

تصویر WD-5.5: کمپریشن سیٹنگ کا ڈائیلاگ باکس

آپ تصویر کو بالترتیب بدل یا پرانی شکل میں واپس لا سکتے ہیں۔

پکچر اسٹائلس حصہ ٹیبل اسٹائلس حصہ سے ملتا جلتا ہے، جس کے ذریعے آپ دیے گئے آپشنز سے تصویر کا من پسند اسٹائل چن سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ تصویر کی فارمیٹنگ برقرار رکھتے ہوئے اس کا سائز، بارڈر کا رنگ اور خاص اثر (Special Effects) بھی سیٹ کر سکتے ہیں۔

اگر آپ ورڈ دستاویز میں تصویر دے رہے ہیں، تو آس پاس ٹیکسٹ بھی ضرور ہوگا۔ ارینج حصہ کو دیے گئے بٹنوں کی مدد سے آپ تصویر کی پوزیشن ٹیکسٹ میں سیٹ کر سکتے ہیں۔ Position کے ڈراپ ڈاؤن بٹن پر کلک کرنے سے آپ کو ٹیکسٹ کو تصویر کے آس پاس سیٹ کرنے کے لیے متعدد آپشنز نظر آئیں گے (تصویر WD-5.6) آپ اس میں سے کوئی بھی اسٹائل چن سکتے ہیں۔ 'More Layout Options...' پر کلک کرنے سے دو ٹیب شیٹ (Picture Position اور Text Wrapping) والا Advanced Layout ڈائیلاگ باکس (تصویر WD-5.7) کھلتا ہے، جس میں آپ تصویر کی ٹیکسٹ میں پوزیشن سیٹ کر سکتے ہیں۔

تصویر WD-5.7: Advanced Layout ڈائیلاگ باکس میں Picture Position ٹیب شیٹ

ارینج حصہ میں ہی Bring to Front بٹن سے آپ چنی ہوئی تصویر کو دیگر سبھی تصویروں یا ٹیکسٹ سے آگے لا سکتے ہیں، جس سے چنی ہوئی تصویر کا کوئی بھی حصہ چھپا ہوا دکھائی نہ دے۔

Send to Back بٹن کا کام Bring to Front کے برعکس ہے۔ یہ بٹن چنی ہوئی تصویر کو دیگر تصویروں/ٹیکسٹ کو پیچھے پہنچا دیتا ہے۔ Text Wrapping بٹن سے

تصویر WD-5.8: Advanced Layout ڈائیلاگ باکس میں Text Wrapping ٹیب شیٹ

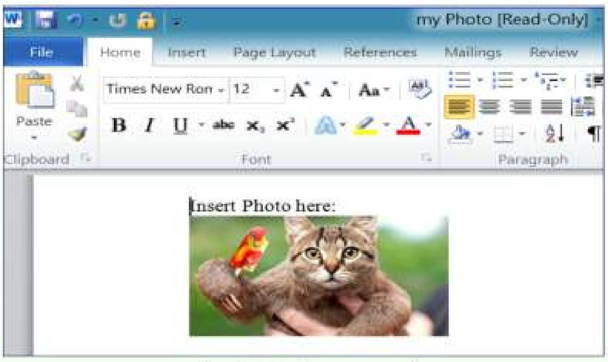

تصویر WD-5.9: تصویر کا کانٹا چھانٹنا

آپ ٹیکسٹ کو تصویر کے آس پاس سیٹ کرنے کا اسٹائل چن سکتے ہیں۔ Text Wrapping مینو کے آخری آپشن 'More Layut Options..' پر کلک کرنے سے Advanced Layout ڈائیلاگ باکس (تصویر WD-5.8) پھر سے کھلتا ہے۔

ان سب کے علاوہ اس حصہ کے بٹنوں کے کچھ چھوٹے موٹے کام ہیں جنھیں آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔

سائز حصہ کا کام بہت اہم ہے۔ اس کے ذریعے آپ تصویر کی لمبائی (Height) اور چوڑائی (Width) سیٹ کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے آپ کو صرف من چاہا سائز Height اور Width کے اسپن کنٹرول باکس میں بھرنے کی ضرورت ہے۔

تصویر WD-5.10: تصویر کا سائز متعین کرنے کے لیے سائز کا ڈائیلاگ باکس

تصویر کے Crop، یعنی اس کے غیر ضروری حصے کاٹنا، سائز حصہ میں دیے گئے Crop بٹن کا کام ہے۔ اس کے لیے سب سے پہلے تصویر کو چن لیں۔ پھر Size حصہ کے Crop بٹن پر کلک کریں۔ آپ دیکھیں گے کہ تصویر کے چاروں طرف لگے ہوئے آٹھ ہینڈلوں کی شکل بدل گئی ہے (تصویر WD-5.9) آپ جہاں سے تصویر کو کاٹنا چاہتے ہیں وہاں کے ہینڈلوں پر اپنا ماؤس پوائنٹر لے کر جائیں۔ اب اس ہینڈل کو ماؤس پوائنٹر سے پکڑ کر اندر کی طرف کھینچیں۔ تصویر آپ کے ہینڈل کھینچنے کے مطابق کٹ جائے گی۔ جب آپ مطمئن ہو جائیں، تو ماؤس پوائنٹر چھوڑ دیں۔ Size کے ڈائیلاگ باکس (تصویر WD-5.10) لانچر پر کلک کرنے سے Size ڈائیلاگ باکس کھلتا ہے، جس سے آپ اوپر بتائے گئے کاٹنے چھانٹنے کے کام ایک ساتھ کر سکتے ہیں۔

کلپ آرٹ گیلری (Clip Art Gallery)

ایم ایس- آفس میں بہت سی تصویریں پہلے سے بنی ہوئی موجود ہوتی ہیں، جنھیں آپ اپنی دستاویز میں کہیں ڈال سکتے ہیں۔ تصویروں کے اس مجموعہ کو کلپ آرٹ گیلری کہتے ہیں۔ کلپ آرٹ گیلری کو دیکھنے یا ان میں سے کوئی تصویر اپنی دستاویز میں ڈالنے کے لیے Insert ٹیب کے Illustration حصہ میں 'Clip Art' ہدایت دیجیے۔ اس سے آپ کی اسکرین کی دائیں طرف تصویر WD-5.11 کی طرح انسرٹ کلپ آرٹ کا ڈائیلاگ باکس نظر آئے گا۔

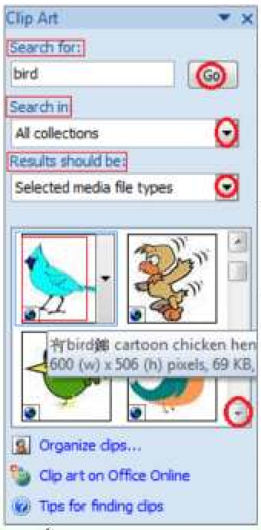

تصویر WD-5.11: کلپ آرٹ گیلری

اس کے Search For ٹیکسٹ باکس میں آپ اس چیز کا نام ٹائپ کرتے ہیں، جس کی تصویر آپ دستاویز میں جوڑنا چاہتے ہیں۔ Search in: کے ڈراپ ڈاؤن مینو کے ذریعے آپ تصویر کی جگہ بتا سکتے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ اس باکس میں کوئی تبدیلی نہ کریں۔ Results should be: ڈراپ ڈاؤن مینو کے ذریعے آپ کلپ آرٹ، فوٹوگراف، ویڈیو اور آوازوں کے ٹکڑے چن سکتے ہیں۔

اب مان لیجیے، آپ کو ایک پھول کی تصویر چاہیے۔ اس کے لیے آپ Search for: باکس میں 'Folder' ٹائپ کیجیے اور Results should be: کے ڈراپ ڈاؤن مینو میں Clip Art چیک باکس کو کلک کیجیے۔ اب Search for: کے بغل میں دیے Go بٹن پر کلک کیجیے۔ ڈائیلاگ باکس کی نیچے کی ونڈو میں پھول کی بہت سی تصویریں نظر آ جائیں گی۔ آپ کسی بھی تصویر کو چن لیں۔ اس سے آپ کی چنی ہوئی تصویر آپ کی دستاویز میں کرسر کی جگہ جڑ جائے گی۔ Clipt Art کے ڈائیلاگ باکس کو بند کرنے کے لیے اس کے دائیں کونے میں دیے گئے Close بٹن (x) پر کلک کیجیے۔

آپ اس تصویر کو چن کر کہیں بھی لگا سکتے ہیں یا چھوٹا بڑا کر سکتے ہیں۔ کلپ آرٹ جوڑنے کے بعد بھی ربن میں فارمیٹ ٹیب جڑ جاتا ہے، جس کے بارے میں ہم آپ کو بتا چکے ہیں۔ ان تصویروں پر بھی آپ عام تصویروں کی طرح بہت سے کام کر سکتے ہیں۔

اسمارٹ آرٹ گیلری (Smart Art Gallery)

ایم ایس- آفس میں بہت سے بنے بنائے گرافکس اور ڈائیگرام دیے گئے ہیں، جن کی مدد سے آپ تصویروں کے ذریعے کسی بھی جانکاری کو واضح کر سکتے ہیں۔ اسمارٹ آرٹ گیلری میں گرافیکل لسٹ اور پروسیس ڈائیگراموں سے لے کر ٹھوس گرافکس اور چارٹ بھی دیے گئے ہیں۔

Insert ٹیب کے Illustrations حصہ میں Smart Art بٹن کلک کرنے سے Choose a Smart Art Graphics ڈائیلاگ باکس (تصویر WD-5.11) کھلتا ہے۔ اس باکس میں بائیں طرف اسمارٹ آرٹ گرافکس کی قسمیں لکھی ہوتی ہیں، جیسے فہرست (List)، عمل (Process)، دور (Cycle)، درجہ بندی (Hierarchy)، رشتہ (Relationship)، میٹرکس (Matrix) اور پرامڈ (Pyramid)۔ کسی بھی نام پر کلک کرنے سے اس درجہ کے تحت سبھی گرافکس نمودار ہو جاتے ہیں حالانکہ آپ All پر کلک کریں، تو باری باری سے سبھی درجے اپنی اپنی گرافکس سمیت ایک کے نیچے ایک نمودار ہو جاتے ہیں۔ کسی بھی گرافک پر کلک کرنے سے اس کا پریوار دائیں طرف نظر آتا ہے۔ آپ کوئی بھی گرافک چن کر OK بٹن پر کلک کر دیں۔ چنا ہوا گرافک آپ کی دستاویز میں کرسر کی جگہ جڑ جائے گا۔

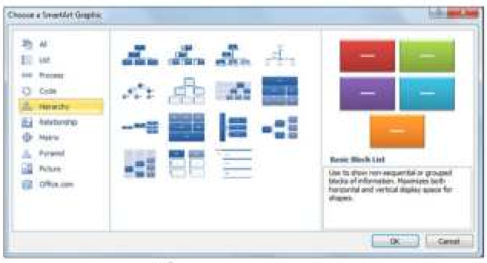

تصویر WD-5.12: اسمارٹ آرٹ گیلری

اسمارٹ آرٹ جڑنے کے فوراً بعد دو نئے ٹیب- ڈیزائن (Design) اور فارمیٹ (Format)- ربن میں جڑ جاتے ہیں۔ ان ٹیبوں میں دیے گئے حصے اور بٹن خود توضیح (Self explanatory) اور Picture Tools کے فارمیٹ ٹیب سے ملتے جلتے ہیں، جنھیں آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔ (جاری)

به شکریه: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8/ آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2

فون نمبر: 011-23275434,23262683

فرہنگ ادبیات (لسانی وادبی اصطلاحات کا توضیحی وتنقیدی مطالعہ)

مصنف: سلیم شہزاد

صفحات: 831، قیمت: 345 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ثوبان سعید
خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی، لکھنؤ

محترم سلیم شہزاد ادبی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ محقق، ناقد، شاعر، ماہر لسانیات اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے وہ خاص شہرت کے مالک ہیں۔ بنیادی طور پر وہ درس وتدریس کے پیشے سے وابستہ رہ چکے ہیں، انگریزی ادب ان کے مستقل مطالعے کا حصہ تھا۔ متعدد کتابیں ان کے قلم کی مرہونِ منت ہیں جن میں تین ناول، پانچ تنقیدی مضامین کے مجموعے، فرہنگ اور لغت کے موضوع پر چار کتابیں، شاعری کے تین مجموعے اور ایک کتاب لسانیات کے موضوع پر؛ گویا سلیم شہزاد صاحب نے ادب وتنقید، ادب وشاعری، ادب وفرہنگ نویسی کے حوالے سے اردو ادب کے خزانے کو متمول کیا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی سے حال میں ہی ایک نئی کتاب شائع ہوکر منظر عام پر آئی ہے۔ اس کا بنیادی موضوع بھی فرہنگ نویسی ہے۔

فرہنگ کے موضوع پر اردو میں جو چند کتابیں دست یاب ہیں، سلیم شہزاد نے مقدمے میں ان کا ذکر کیا ہے، اور ان کتابوں کی موجودگی میں اس فرہنگ کی ضرورت وافادیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ سلیم شہزاد نے تقریباً ساڑھے آٹھ سو صفحات میں اردو زبان وادب کی مختلف اصطلاحوں کا توضیحی اشاریہ تیار کیا ہے۔

اس کتاب کی پہلی خصوصیت تو یہی ہے کہ سابقہ فرہنگوں کے مقابل اس میں تفصیلات بہت زیادہ ہیں۔ اس فرہنگ کا دائرہ مختلف ادبیات اور مختلف علوم وفنون کی اصطلاحات کی تفصیلات کو بھی سمیٹے ہوئے ہے۔ ان بیشتر سیاسی، سماجی، ادبی اور تنقیدی اصطلاحوں پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے جو ادب کے مطالعے کے دوران قاری کے لیے مفید ہوسکتی ہیں۔ اردو زبان وادب کی جتنی شاخیں یا جتنی جہات یا اصناف ہیں، ان پر بھی قابل قدر معلومات جمع کردی گئی ہیں۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ سابقہ فرہنگوں میں عام طور پر مثالیں سینہ بہ سینہ چلے آنے والے انداز میں درج کی جاتی تھیں، یعنی کسی اصطلاح کے تحت اگر کسی سابقہ فرہنگ میں کوئی شعر بطور مثال درج کیا گیا ہے تو وہی اشعار اس فرہنگ سے ماخوذ ومستفاد کتابوں میں شامل ہوتے چلے آتے تھے، اور کسی نئی مثال کی طرف قاری کا ذہن منعطف نہیں ہو پاتا تھا۔ اس کتاب میں یہ شعوری کوشش کی گئی ہے کہ مثالیں عہد حاضر کے ادب سے پیش کی جائیں۔ ظاہری طور سے اس سے دو فائدے مرتب ہوں گے اولاً: مثال جاتی نمونوں میں اضافہ ہوگا، ثانیاً: قاری معاصر ادبیات کی وسعت وگہرائی سے واقف ہوسکے گا۔ یقینی طور سے یہ قابل ستائش کام ہے، اور لازمی طور سے مشکل بھی؛ سلیم شہزاد نے اس تعلق سے بھی اپنی تخلیقیت کا ثبوت پیش کیا ہے۔

سلیم شہزاد بنیادی طور سے تخلیق کار ہیں۔ یہی تخلیقیت فرہنگ نویسی کے اسلوب پر بھی بعض مقامات پر حاوی نظر آتی ہے۔ میں صرف ایک مثال (موازنہ نہیں) پیش کرنا چاہتا ہوں۔ 'شکست ناروا' کے بارے میں کشاف تنقیدی اصطلاحات کے مرتب لکھتے ہیں: شکست ناروا شعر کا ایک عیب ہے، مولانا حسرت موہانی نے اس کی توضیح ان الفاظ میں کی ہے: فارسی اور اردو کی شاعری میں جو بحریں مروج ہیں، ان میں سے بعض کی خصوصیت یہ ہے کہ پڑھنے میں ہر مصرعے کے دو ٹکڑے ہوجایا کرتے ہیں۔ ایسے تمام اشعار میں اگر مصرعوں کے ٹکڑے علاحدہ علاحدہ نہ ہوسکیں بلکہ ایسا ہو کہ کسی لفظ یا فقرے کا ایک حصہ ایک ٹکڑے میں اور دوسرا حصہ دوسرے ٹکڑے میں لازمی طور پر آتا ہو تو یہ بات یقیناً معیوب سمجھی جائے گی، اور شاعر کی کمزوری پر دلالت کرے گی۔ شکست ناروا اسی عیب کا نام ہے۔" مرتب کشاف نے شاعری کے ایک اہم ستون اور ناقد حسرت موہانی کا ایک اقتباس پیش کرکے صورت حال کی وضاحت کردی، اور بہتر انداز میں کردی۔ مثالیں بھی درج کی ہیں۔

اب سلیم شہزاد کا اسلوب بیان ملاحظہ کیجیے: "شکست ناروا: ایسے مصرع کا ناموزوں لسانی دروبست جو مختلف عروضی ارکان کی تکرار سے کیا جاتا ہو، یعنی یہ ارکان مصرع میں ایک جوڑی کی صورت میں آتے ہوں اور اس کے ہر قطعے میں لسانی تعمل مکمل پایا جاتا ہو۔" [فرہنگ ادبیات، ص 519] بس مثال دینا میرا کام اور فیصلہ قارئین کا۔

زیر تبصرہ فرہنگ کا دامن اشاریوں اور کتابیات کی گراں باریوں کا متحمل نہیں۔ میں ایسا سمجھتا ہوں کہ شاید اصل کتاب کی ضخامت کی وجہ سے ان ضروری ضمیمہ جات کے لیے گنجائش کا دامن تنگ ہوگیا ہو۔ حالاں کہ مصنف موصوف نے فرہنگ کے متن میں بے شمار کتابوں سے استفادہ کیا ہے اور متون بغیر کسی حوالے اور سند کے نقل کیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے فرہنگیں استناد کا درجہ رکھتی ہیں، اور حوالوں کے بغیر ان کی استنادی حیثیت مشکوک مانی جاتی ہے۔ اس لیے میں یہ بات تسلیم کرتا ہوں کہ اس قسم کی حوالہ جاتی کتابوں میں سند واستناد کے ضابطوں کی پابندی کی جانی چاہیے۔ کتاب میں چند ایک مقامات پر ٹائپنگ کی معمولی خامیاں بشریت کے تقاضوں کی تکمیل کی خاطر شاید باقی رکھی گئی ہیں۔

یہ کتاب ادبی وتنقیدی اصطلاحوں کی بہتر طور پر تشریح کرتی ہے، اور مثالوں سے اس کی تفہیم کو آسان بناتی ہے۔ کیا اساتذہ اور کیا طلبہ؛ سبھی کے لیے یہ کتاب ایک مرجع کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایک ایسی ریفرنس ہینڈ بک ہے جو کسی بھی اصطلاح کی تفہیم میں فوری طور سے قاری کی معاونت کرتی ہے۔ میرے خیال میں ایک فرہنگ کا بنیادی مقصد یہی ہوتا بھی ہے۔

تحقیق و تنقید

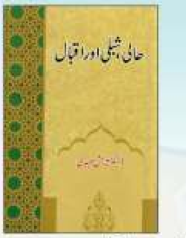

حالی، شبلی اور اقبال

مصنف: ڈاکٹر تابش مہدی

صفحات: 128، قیمت: 150 روپے

ناشر: ادبیات عالیہ اکادمی، نئی دہلی

مبصر: شاہدہ شاہد پی آر ٹی (اردو) نئی دہلی 25

جدید اردو ادب کی تاریخ میں جن شخصیات کو معمار کی حیثیت حاصل ہے ان میں الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی اور علامہ اقبال کا درجہ بہت بلند ہے۔ حالی نے اردو شعر وادب کو اپنی شاعری کے ساتھ اپنی نثر خاص طور پر سوانح نگاری اور تنقید نگاری سے ثروت مند بنانے کی اولین کوشش کی، اسی زمانے میں شبلی نعمانی نے سیرت نگاری، تاریخ نویسی اور تنقید کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کا اظہار کیا۔ علامہ اقبال نے اپنی شاعری کی مدد سے کارہائے نمایاں انجام دیے ان سے ایک دنیا واقف ہے۔ گزشتہ سو برس سے ان تینوں شخصیات کا سایہ ہماری زبان کے شعر وادب پر اس قدر گہرا رہا ہے کہ شعر وادب کی کوئی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ اس وقت میرے سامنے ڈاکٹر تابش مہدی کی تنقیدی کتاب 'حالی، شبلی اور اقبال' ہے۔ جس میں حالی سے متعلق دو، شبلی نعمانی سے متعلق چار اور اقبال سے متعلق پانچ مضامین شامل ہیں۔ تابش مہدی کی شناخت ان کی شاعری خاص طور پر نعت گوئی سے قائم ہے۔ ان کی شعر گوئی سے ہم پہلے بھی واقف تھے لیکن ان کی تنقیدی کتاب دیکھ کر مسرت ہوئی کہ انھوں نے تنقید کے لیے ایسی شخصیات کا انتخاب کیا جن سے انھیں ایک طرح کی نسبت بھی ہے۔ حالی کے تصور تنقید اور ان کی تنقید نگاری سے متعلق بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، لیکن ایسا بھی نہیں کہ اب کوئی نیا نکتہ دریافت نہیں کیا جاسکتا۔ تابش مہدی کا خیال ہے کہ اردو تنقید حالی کی کتاب کے بعد تقریباً ایک صدی کا سفر طے کرچکی ہے لیکن آج بھی حالی کے اثر سے باہر نہیں آسکی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ''حالی خود ایک دبستان تھے اور انھوں نے ذوق شعری کی جو بنا ڈالی ہے وہ کم وبیش آج بھی جاری ہے۔'' حالی سے متعلق دوسرا مضمون ان کے تصور حب الوطنی پر ہے۔ یہ بات کم لوگوں کے علم میں ہے کہ اردو میں وطنی شاعری کا باضابطہ آغاز حالی کی شاعری سے ہوتا ہے۔ تابش مہدی نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے حالی کے ایسے اشعار اور نظموں کو پیش کیا ہے جن میں حب الوطنی کا جذبہ ملتا ہے۔ انھوں نے حالی کی قومی اور وطنی شاعری کے تعلق سے لکھا ہے کہ ''انھیں اولیت کا شرف حاصل ہے کہ انھوں نے اردو شاعری میں سب سے پہلے اور باقاعدہ طور پر حب الوطنی اور مذہبی رواداری کا تصور پیش کیا۔'' کتاب کا دوسرا حصہ شبلی نعمانی سے متعلق ہے اس میں چار مضامین (شبلی کی تنقید، شبلی کی سیرت نگاری، شبلی کی نثر اور شبلی کی شاعری) شامل ہیں۔ شبلی کی اولین شناخت ان کی تنقید نگاری ہے۔ مصنف نے شبلی کی تنقیدی کتابوں کی مدد سے ان کی تنقید کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اسی طرح 'سیرت النبی' کے سیاق میں شبلی نعمانی کی سیرت نگاری کا بھی جائزہ لیا ہے۔ شبلی کی نثر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اردو میں رومانی اور جمالیاتی اسلوب کا بہترین اظہار ان کی نثر میں ہوا ہے۔ مصنف نے اس پہلو سے شبلی کی نثر نگاری کی خصوصیات کی نشاندہی کی ہے۔ اسی طرح سے ان کی شاعری کا بھی تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

کتاب کے تیسرے حصے میں اقبال سے متعلق پانچ مضامین ہیں، جن میں براہ راست اقبال سے متعلق دو مضامین 'اقبال اور ان کی شاعری' اور 'عرفان اقبال' ہیں۔ ان میں مصنف نے اقبال کی اردو اور فارسی شاعری کے اہم نکات سے بحث کی ہے۔ ان کے علاوہ تین مضامین کا تعلق اقبال شناسی سے ہے۔ جس میں سید سلیمان ندوی کی اقبال شناسی اور سید احمد ایثار کی اقبال شناسی کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے ان تینوں شخصیات کے اہم کارناموں کا علم ہوتا ہے۔ ایک طالب علم کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ آخر میں اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ تابش مہدی کی زبان شاعری کی طرح نثر میں بھی رواں اور سلیس ہے۔ کسی موضوع اور مسئلہ پر جب وہ گفتگو کرتے ہیں تو اسے بہت ہی وضاحت اور صراحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اس سے ان کے تنقیدی ذہن اور ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے۔ کتاب کی ابتدا میں سخن گفتنی کے عنوان سے شاہ اجمل فاروق ندوی کی ایک تحریر شامل ہے، جس میں انھوں نے تابش مہدی کے فکر وفن پر اظہار خیال کیا ہے۔ کتاب کا سرورق دیدہ زیب ہے۔ قیمت بھی مناسب ہے۔

رشید حسن خاں تحریروں کے آئینے میں (جلد اول)

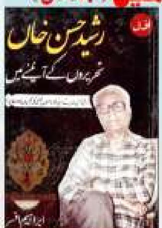

مرتب: ابراہیم افسر

صفحات: 556، قیمت: 323 روپے، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: کتابی دنیا، دہلی 110006

مبصر: ڈاکٹر خالد ظہیر، s/o ڈاکٹر ظہیر احمد خان، محلّہ اسلام آباد شیام پور روڈ، نگر پنچایت سکھور، ضلع میرٹھ 250104

زیر تبصرہ کتاب 'رشید حسن خاں تحریروں کے آئینے میں (جلد اول)' جو رشید حسن خاں کے ادبی کارناموں پر لکھی گئی تحریروں کی دستاویز ہے، جسے نسلِ نو کے ادبی اُفق پر اُبھرنے والے جواں سال مبصر، مرتب اور محقق ابراہیم افسر نے ترتیب دیا ہے۔ ابراہیم افسر ہونہار پی ایچ ڈی اسکالر ہیں جن کا موضوع 'رشید حسن خاں کی ادبی جہات' ہے۔ لہٰذا ان کو ماہرِ رشید حسن کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے اس کتاب کا مقدمہ ہی کافی ہے جو 81 صفحات کو محیط معلومات سے بھرپور اور پُر مغز مقالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں مقدمہ اور تقریظ کے علاوہ 47 اہم مضامین ہیں۔ مرتب ابراہیم افسر نے اس کتاب میں اُن تحریروں کو شامل کیا ہے جو رشید حسن خاں کی زندگی میں یا ان کی وفات کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ اُردو دنیائے ادب میں رشید حسن خاں کی علمی خدمات کے اعتراف یا اعتراضات کی شکل میں لکھی گئیں تقریباً 2500 صفحات پر مشتمل یہ ضخیم کتاب پانچ جلدوں پر مشتمل ہے، جس کی پہلی جلد حاضرِ مطالعہ ہے۔ اس پہلی جلد میں تنقید تحقیق اور تدوین کے موضوعات کے ساتھ ساتھ رشید حسن خاں کی شخصیت و سیرت پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ رشید حسن خاں ادب دوست، اعلیٰ درجے کے محقق ونقاد، تدوین میں ان کا کوئی مد مقابل نہیں۔ ان کی تدوینی فتوحات کے سلسلے میں پروفیسر گیان چند جین نے انھیں 'خدائے تدوین' کے لقب سے یاد کیا۔

کتاب کی ابتدا ابراہیم افسر کے 81 صفحات پر مشتمل وسیع اور بلیغ مقدمے سے ہوتی ہے۔ جس میں انھوں نے رشید حسن خاں کے بارے میں بہت سی دل چسپ معلومات فراہم کی ہیں۔ ان کی تحقیق وتنقید، خطوط، دوست واحباب وغیرہ پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ وہ رشید حسن خاں کی شخصیت اور مختلف پہلوؤں کو قارئین کے سامنے پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''رشید حسن خاں کو اُردو دنیا میں بہ طور محقق و مدون ید طولیٰ حاصل رہا ہے۔ انھوں نے اپنی ذاتی تحقیقی کاوشوں سے اُردو تحقیق وتدوین کو نئی سمت و جہت عطا کی۔ تحقیق وتدوین کو انھوں نے تا عمر اوڑھنا اور بچھونا بنایا۔ ان کی تحقیقی و تدوینی کاوشیں نئی نسل اور آنے

والی نسلوں کے لیے نہ صرف ایک مثالی نمونہ ہے بلکہ میری نظر میں یہ مشعل راہ ہیں۔ رشید حسن خاں کی ان تحقیقی کاوشوں کو سامنے رکھ کر نئی نسل تحقیق کے آداب سیکھ رہی ہے۔ موصوف نے اپنی عمر عزیز کا بیش تر حصہ قدیم اور کلاسیکل مخطوطوں کے غائر مطالعے میں گزرا۔ دراصل کلاسیکل مزاج ان کی روح میں سرایت کر گیا تھا۔ رشید حسن خاں کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اگر وہ کسی کلاسیکی فن پارے کی تحقیق و تدوین کا ارادہ کرتے تو اس کی اطلاع اپنے ادب نواز دوستوں کو بہ ذریعہ خط ضرور دیتے ان کی اس ادبی اور شعوری عادت نے اُردو مخطوطات شناسی میں گراں بہا اضافہ کیا۔''

کتاب کی تقریظ محترم انیس احمد حسینی انیس میرٹھی نے تحریر کی ہے۔ جس میں انھوں نے اُردو تحقیق و تنقید کے علاوہ اور حالتِ حاضرہ کو مدنظر رکھتے ہوئے اُردو زبان و ادب کے گرتے ہوئے معیار پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے رشید حسن خاں کے ادبی کارناموں کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ علاوہ ازیں کتاب کے مرتب ابراہیم افسر کا مختصر تعارف پیش کیا ہے۔

رشید حسن خاں نے اپنی ذاتی معلومات کو 'کچھ اپنے بارے میں' کے عنوان سے تحریر کیا تھا اس مضمون کو ابراہیم افسر نے کتاب میں شامل کیا ہے۔ اس مضمون کے ذریعے خاں صاحب مرحوم کے بارے میں بہت سی معلومات قارئین کو حاصل ہوئی ہیں۔

ابراہیم افسر نے رشید حسن کی سوانح و شخصیت کے باب میں، شاہ جہاں پور کی علمی و ادبی اہمیت، آرڈیننس کلودنگ فیکٹری کی تاریخی حیثیت رشید حسن کے خاندانی پس منظر، تعلیم و تربیت، ملازمت، ادبی زندگی کا آغاز، ازدواجی زندگی، اولادیں، ریٹائرمنٹ، وصال، شخصیت، کھیلوں سے دلچسپی، معمولاتِ زندگی، شوق، ادبی کاوشیں، تصنیفات/ تالیفات/تدوینات، املا ورک شاپ کا انعقاد، وزیٹنگ فیلو، اور انعامات و اعزازات یعنی رشید حسن خاں کی ذات و صفات کا مکمل احاطہ کیا ہے۔ اسی طرح خورشید حسن خاں فرزندِ اکبر رشید حسن خاں نے اپنے مضمون 'رشید حسن خاں کی شخصیت کے مختلف پہلو' میں رشید حسن خاں کی بہت سی ایسی باتوں کو اُجاگر کیا جن سے اُردو قارئین ناواقف تھے۔

اس کتاب میں دیگر مضامین بھی اہمیت کے حامل ہیں جن میں نیر مسعود اطہر فاروقی، اسلم پرویز، عبداللہ ولی بخش قادری، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، صدیق الرحمٰن قدوائی، مجتبیٰ حسین، مخمور سعیدی، قمر رئیس، نامی انصاری، رفعت سروش، شمس بدایونی، ایوب واقف، ٹی آر رینا، خلیق انجم، وضاحت حسین رضوی، تابش مہدی، شبیر عثمانی، علی احمد فاطمی، ارجمند آرا، افتخار امام صدیقی، شمیم حنفی، اور کالی داس گپتا رضا وغیرہ کے مضامین جو رشید حسن خاں کے مختلف پہلوؤں پر لکھے گئے ہیں اور دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

کتاب دبیز سفید کاغذ پر مجلد، رشید حسن خاں کی تصویر اور مناسب قیمت کے ساتھ دستیاب ہے۔ کہیں کہیں پروف ریڈنگ کی غلطیاں در آئی ہیں۔ یہ کتاب رشید حسن خاں کی زندگی اور شخصیت کی مکمل عکاسی کرتی ہے اور ان بارے میں اہم معلومات فراہم کراتی ہے۔ میں یہ اُمید بھی کرتا ہوں کہ اس سیریز کی باقی چار جلدیں بھی منظرِ عام پر آ جائیں گی۔

ادب اطفال

مصنف: امیر حمزہ

صفحات: 383، قیمت: -/400، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: عذرا بک ٹریڈرس، دریا گنج، دہلی

مبصر: عمران عراقی (ریسرچ اسکالر) شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی

بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں عہد جدید کے ماہرین تعلیم نے طفل مرکوز نظام تعلیم کو ترجیح دی ہے۔ تعلیمی نظام کی سب سے بہتر شکل اسے ہی مانا گیا ہے۔ لیکن اس سے قبل یہ بے حد ضروری قرار دیا گیا ہے کہ بچوں کی نفسیات، ذہنی کیفیات اور دلچسپیوں کا بغور مطالعہ کیا جائے۔ ظاہر ہے اس مطالعہ کے بعد جو نتیجہ اخذ کیا جائے گا ضروری نہیں کہ اس میں تمام بچوں کے افکار، دلچسپیوں کا دائرہ کار اور ذہنی و نفسیاتی کیفیات کی نوعیت ایک سی ہوگی۔ جب ایسا نہیں ہے تو پھر ہمارے ادبا اور ادب اطفال میں اپنی عمریں قلیل کرنے والے کس طرح یہ تصور کر لیتے ہیں کہ تمام بچوں کو ادبی مواد کے طور پر وہی ایک سی نظمیں اور کہانیوں کی دنیا کی سیر کرائی جائے جنھیں صرف اخلاق ملمعے میں لپیٹ کر پروسا جاتا ہے؟ ان میں نہ تو فکر کو پرواز دینے والے مواد شامل ہوتے ہیں اور نہ ہی سائنسی متحیرات کی کوئی فضا قائم کی جاتی ہے۔ دیکھا جائے تو اردو زبان میں تخلیق پانے والے ادب اطفال ان عناصر سے تہی دامن ہی نظر آتے ہیں۔ اردو زبان کی اس کم مائگی کے وجوہات کو سمجھتے ہوئے ادب اطفال میں ممکنات کے دروازے وا کرنے کا کام ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی نے اپنے مضمون ''نئی صدی...... نیا ادب اور نئے موضوعات'' میں کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا یہ مضمون امیر حمزہ کی مرتب کردہ کتاب ''ادب اطفال: ادب اور ادیب'' میں کلید کی حیثیت رکھتا ہے۔ خود جناب امیر حمزہ کتاب کے مقدمہ میں اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''ڈاکٹر آفتاب عالم صدیقی کے مضمون.....کو اگر کتاب کا مقدمہ ہی سمجھ لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہوگا کیونکہ ان کے مضمون میں نئی صدی، نیا ادب اور نئے موضوعات کی نشاندہی جس ژرف نگاہی سے کی گئی ہے ویسی تحریریں بہت ہی کم پڑھنے کو ملتی ہیں۔'' (ص 15)

پیش نظر کتاب، ادب اطفال کے ضمن میں لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے۔ کتاب میں شامل مضامین کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں وہ مضامین شامل ہیں جن میں بچوں کے لیے لکھی گئی منظوم اور نثری تحریروں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس حصے میں کل 19 مضامین شامل ہیں۔ دوسرے حصے کے مضامین ان تخلیق کاروں پر مشتمل ہیں، جو ادب اطفال میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان میں اہم نام شفیع الدین نیر، حافظ کرناٹکی، ظفر کمالی وغیرہ کا لیا جا سکتا ہے۔ اس حصے میں ان تخلیق کاروں کی تخلیقی کاوشوں کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ اس حصے میں کل 16 مضامین شامل ہیں۔ پہلے حصے میں شامل مضامین میں نہ صرف نظم و نثر سے تعلق رکھنے والی ان تحریروں کا، جو خاص طور پر بچوں کے لیے لکھی گئی ہیں، تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے بلکہ بچوں کی تعلیمی صورت حال، بچوں کی نفسیات، بچوں کے لیے شائع ہونے والے رسائل و جرائد اور خصوصاً ڈیجیٹل دنیا میں بچوں کے لیے کس طرح کے ادب کو فروغ دیا جائے، جیسے مسائل اور اس کے تدارک پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ ان مضامین کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ یہ تمام مضامین ایسے قلم کاروں کی تحقیقی اور تنقیدی کاوشوں کا نتیجہ ہے جو واقعی اکیسویں صدی کے اس دہائی میں ابھرتے ہوئے نوجوان قلم کار کہلانے کے مستحق ہیں۔

مضامین کی بات کی جائے تو ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی کا مضمون ادب اطفال کے ضمن میں اگر حال کا سخت گیری کے ساتھ تنقیدی جائزہ لیتا ہے تو مستقبل کی راہیں بھی ہموار کرنے میں معاون نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر عادل حیات کا مضمون ''ادب اطفال اور اس کے مسائل'' پر سنجیدگی سے گفتگو کرتا ہے۔ عادل حیات نے اپنے مضمون میں زبان اور موضوعات کی ترسیل میں حائل لفظیات کے مسائل اور اس کی اہمیت پر بات کرتے ہوئے بچوں کی نفسیات اور رجحانات کے مطابق ادب تخلیق کرنے پر زور دیا ہے۔

عہد حاضر میں بچوں کا اردو سائنسی و طبی ادب، عہد حاضر میں بچوں کی تعلیمی صورت حال، بچوں کی نفسیات اور ادب اطفال، ادب اطفال کی موجودہ صورت حال، موجودہ دور میں بچوں کے ادبی رسائل، بچوں کا سائنسی ادب اور قومی کونسل کی خدمات: ایک مختصر جائزہ،

بچوں کی لسانی تربیت میں آڈیوز اور ویڈیوز کا کردار، اور، ڈیجیٹل دنیا میں بچوں کا ادب وغیرہ بے حد اہم مضامین ہیں۔ عمران عاکف خاں اور امیر حمزہ کے مضامین میں جس کا تعلق ڈیجیٹل دنیا کی آڈیوز اور ویڈیوز کے استعمال سے ہے، بے حد اہم اور معلوماتی ہیں۔

الغرض چند ایک مضامین کو چھوڑ کر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو امیر حمزہ نے ادب اطفال کے حوالے سے ایک بہترین کتاب مرتب کی ہے۔ ایسے دور میں جب کہ انسان صرف خود کو مرکز میں رکھ کر مادیت پرست دنیا کی خیرہ کرنے والی روشنی میں اپنے بچوں کی بھی مارکٹنگ کرنے سے نہیں ہچکچاتا ہے، بچوں کی معصومیت کو فروخت کرنے پر آمادہ ہو گیا ہے، امیر حمزہ نے بچوں کی تعلیم و تربیت سے تعلق رکھنے والے ادب کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے، جو یقیناً قابل مبارکباد ہے۔

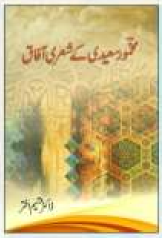

مخمور سعیدی کے شعری آفاق

مصنف: ڈاکٹر قسیم اختر

صفحات: 276، قیمت: 300، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: خان محمد رضوان، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

'مخمور سعیدی کے شعری آفاق' ڈاکٹر قسیم اختر کی تحقیقی کتاب ہے۔ آپ صالح فکر کے جری اور بے باک قلم کار ہیں۔ ان کی شخصیت خلوص و محبت کا پیکر ہے اور ذات مہر و وفا کی دلدادہ ہے۔ ان کی ذات کا عکس ان کی شاعری میں منعکس ہے۔ وہ ایک اچھے اور تازہ دم شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں مکر و ریا کے بجائے حق و صداقت اور جدت طرازی کا گہرا رنگ دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ ایک شاعر نے شاعر کے شعری ابعاد دیکھنے کی سعی کی ہے۔ مخمور سعیدی کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے ادب کی تقریباً اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ طے کرنا مشکل ہے کہ وہ کیا تھے اور کیا نہیں تھے۔ ادب کے افق پر ایسی شخصیتیں خال خال ہی روشن ہوئی ہیں، جنھوں نے اصنافِ ادب کو کامیابی کے ساتھ برتا ہو۔ وہ ایک ایسے ہی ادیب ہیں جنھوں نے کوشش کی اور کامیاب بھی رہے۔ آپ جدیدیت پسند تو تھے مگر جدیدیت کی لایعنیت سے دور رہے۔ ان کی شاعری گروہ بندی سے آزاد تھی۔ ان کا انداز سبک اور عام فہم ہے۔ مشکل پسندی ان کے یہاں نہیں ہے، خواہ لفظیات کی سطح پر ہو یا محاورات، تلمیحات، استعارات، تشبیہات اور علامات کے استعمال کی سطح پر ہو، وہ اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ کہیں قاری کے لیے گرانیِ طبع کا باعث نہ ہو۔ اس کا خیال رکھتے ہوئے سادہ، سلیس اور عام فہم لہجے میں بات کرتے ہیں۔ نمونے کے چند اشعار ملاحظہ کریں۔

بہہ گئے راستے کے شور میں ہم　　　اس نے رک کر ہمیں پکارا بھی
میں گریزاں اپنی ہی پرچھائیں سے　　　اپنی ہی آہٹ سے کترا رہا ہوں میں
قدم قدم پہ تصادم ہوا خود اپنے سے　　　تو اپنی راہ کی دیوار ایک میں بھی تھا؟
اپنی پہچان ہوئی جاتی ہے دشوار مجھے　　　آج یوں میری طرف دیکھ رہا ہے کوئی

مخمور سعیدی کے یہاں شاعری کے کئی رنگ ابھرتے ہیں ایک تو یہ رنگ ہے جس میں شاعر خود بے چہرگی کا شکار ہے۔ حالات کے جبر، زمانے کی دست برد اور جور و جفا سے شاعر ذہنی کشمکش کا شکار ہے اس کا باطن ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے، جس کے اظہار پر شاعر مجبور ہے۔ یہ کشمکش دراصل تنہائی، افسردگی، بے گھری، فرسٹریشن، نا آسودگی، ذات کی گمشدگی سے عبارت ہے۔ مخمور سعیدی کی شاعری مختلف کیفیات کی شاعری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اظہار کا بیانیہ بھی مختلف النوع ہے، کہیں تہذیب و ثقافت کے مٹ جانے کا غم تو کہیں اضطرابِ باطن کا اظہار ہے۔

انھوں نے نظموں اور غزلوں دونوں اصناف میں کامیاب تجربے کے ساتھ ہی اپنا رشتہ صنفِ رباعی سے بھی رکھا۔ قسیم اختر نے اس کتاب میں مخمور سعیدی کی نظموں اور غزلوں کا خوبصورت تطابق پیش کیا ہے۔ ان میں جو فکری اور فنی ارتباط ہے اس کو شعری بساط میں اجاگر کرتے ہوئے کامیاب تجزیہ پیش کیا ہے۔

'پیش گفتار' کے تحت مصنف نے اپنے تجربات، مشاہدات اور جذبات کا اظہار کیا ہے۔ 'مخمور سعیدی کے حالات زندگی' کے ضمن میں ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے جو عموماً پردۂ خفا میں رکھے جاتے ہیں یا وہاں تک مصنفین کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ 'مخمور سعیدی کے عہد کا شعری رجحان' کے حوالے سے مصنف نے بے حد معلوماتی اور علمی گفتگو کی ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس موضوع کے تحت مصنف نے انصاف کرتے ہوئے جدیدیت، ترقی پسندی اور جنگ آزادی کے بعد کے رجحانات پر عہد حاضر کے اہم ناقدین کے حوالے سے تشفی بخش کام کیا ہے۔ اس کے تحت مخمور سعیدی کے ہم عصر شعرا کے ایسے اشعار کو بھی حوالہ بنایا گیا ہے جو اس رجحان سے میل کھاتے ہوں۔ اس کتاب کا دوسرا اہم موضوع 'مخمور سعیدی کی تخلیقیت' ہے۔ اس کے ذیل میں 'کائنات غزل' کے نام سے ایک عنوان قائم کیا گیا ہے جس میں مخمور سعیدی کی غزل گوئی کو ان کے عہد کے رجحانات اور ہم عصر شعری رویے کے حوالے سے تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس سے ان کا امتیازی پہلو ابھر کر سامنے آسکے۔ اسی ضمن میں مصنف نے 'ارتباط نظم' کے تحت مخمور سعیدی کی نظم گوئی اور غزل گوئی میں امتیاز قائم کرنے کی کوشش کی ہے مگر تشنگی باقی ہے وہ اس وجہ سے کہ بحث مفصل نہیں ہے، ان کی نظم گوئی کو ان کے فکری رجحان کے تناظر میں دیکھ کر نظموں کا محاکمہ کیا جاتا تو زیادہ مفید ہوتا بہر کیف نظموں پر مصنف نے اچھی بحث کی ہے۔ اسی کے ساتھ 'اصناف دیگر' کے تحت مخمور سعیدی کی رباعیات اور قطعات جو کہ کمیت میں بہت کم ہیں باوجود اس کے ایک تعارف کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بعد منتخب کلام کا عمدہ انتخاب شامل کتاب کیا گیا ہے۔ جس میں غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی شامل ہیں۔

اس طور پر اگر دیکھا جائے تو یہ کتاب 'مخمور سعیدی کے شعری آفاق' مخمور سعیدی پر نہ صرف عمدہ اور معلوماتی کتاب ہے بلکہ بے حد محنت اور لگن سے تیار کی گئی کتاب ہے، جو کہ مخمور سعیدی پر کام کرنے والوں کے لیے مفید اور کارگر ثابت ہونے کے ساتھ مخمور سعیدی کی تخلیقات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے گراں قدر سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

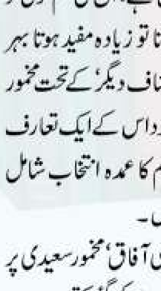

اردو کی عصری صدائیں

ناشر مصنف: غلام نبی کمار

صفحات: 368، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ڈاکٹر پریمی رومانی

مدیر: سہ ماہی عالمی میراث 1806 ڈی اساوری، نائنڈ یڈسٹی سنھگڈ روڈ، پونے 411068

غلام نبی کمار ایک ایسے قلمکار ہیں جنھوں نے ادبی دنیا میں اپنی محنت اور ریاضت سے ایک طویل سفر طے کیا ہے۔ وہ آج کل کے لکھنے والوں میں فعال ہیں اور تواتر کے ساتھ رسائل و اخبارات میں چھپتے ہیں۔

اردو کی عصری صدائیں ان کا اولین تحقیقی و تنقیدی مقالات اور تبصروں کا مجموعہ ہے جو حال ہی میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا ہے اور ادبی محفلوں میں

موضوع بحث بن گیا ہے۔ یہ کتاب صرف چند دنوں کے بعد ہی پاکستان کے ایک بڑے ادارے نے بھی شائع کی ہے۔ اس طرح سے اس نوجوان ادیب کی ذہنی اپج کا پتہ چلتا ہے اس کتاب میں انھوں نے اردو کے بعض شہرت یافتہ ادیبوں پر بڑی جانفشانی سے مقالات اور تبصرے لکھے ہیں اور چند تازہ کار ادیبوں کو بھی اردو کی عالمی بستی سے متعارف کرایا ہے۔ کتاب کے سرنامے (تقریظ) میں پروفیسر صادق تبصروں کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے اور ان کی اہمیت متعین کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ہمارے یہاں تبصرہ نگاری کو عموماً دوسرے درجے کا ادب بھی نہیں مانا جاتا جبکہ اس فن کی بھی ایک قابل قدر روایت اردو ادب میں موجود ہے۔ تبصرے نئی کتابوں کی طرف متوجہ کرتے ہیں، انھیں پڑھنے کی ترغیب دیتے ہیں اور اس طور نئے ادب کی ترقی و ترویج میں معاونت کرتے ہیں۔'' اس لحاظ سے دیکھا جائے تو غلام نبی کمار کی کتاب اردو ادب کے اس شعبے کو ترقی و ترویج دینے میں بڑی کارآمد کوشش ہے۔

بہر حال غلام نبی کمار کی اس کوشش کو صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنے دُھن کے پکے ہیں جو ادبی فریضہ انجام دیتے ہیں۔ اس میں وزن اور وقار ہوتا ہے۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں خود رقمطراز ہیں: ''اردو کی عصری صدائیں میں مختلف موضوعات اور اصناف کی کتابوں پر پختہ تبصرے نما مضامین شامل ہیں جو رواں صدی کی شائع شدہ کتابوں پر تحریر کیے گئے ہیں اور ان کتابوں کے قلمکار اور ادیب و شاعر حضرات بھی اسی عہد کے ہیں۔''

مصنف کے اس بیان سے پتہ چلتا ہے اور خود کتاب کے نام سے بھی اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ اس کتاب میں عصر حاضر کے تخلیق کاروں کی شخصیت اور ان کے فن پر سیر حاصل تبصرے شامل ہیں۔

اردو کی عصری صدائیں کے مندرجات درج ذیل ہیں:

1۔ تحقیق و تنقید کے شوشے گوشے 2۔ رواں صدی کی رواں شاعری 3۔ عصری فکشن کے جھلملاتے ستارے 4۔ باب خودنوشت نگاری 5۔ باب مکتوب نگاری 6۔ باب ادب اطفال 7۔ باب فن تبصرہ نگاری۔ 8۔ رواں صدی کی ادبی صحافت۔ یعنی یہ تمام ذیلی عنوانات آٹھ ابواب پر مشتمل ہیں۔ یہ ابواب تحقیق، تنقید، خود نوشت، مکاتیب نگاری، صحافت، اور تبصرہ نگاری پر دال ہیں اور گہری معنویت رکھتے ہیں۔ پہلے باب میں مناظر عاشق ہرگانوی، پروفیسر ارتضیٰ کریم، پروفیسر مجید بیدار، ڈاکٹر قمر جہاں، ظہیر غازی پوری، ناوک حمزہ پوری، شوکت پردیسی، حسن نعیم، سلام بن رزاق، دیپک بدکی ہمایوں اشرف، خورشید حیات، محبوب راہی، جیسے نامور شعرا اور ناقدین کے فن پر فکر انگیز مقالات ملتے ہیں، جن میں ان کے فکری و فنی گوشوں کو نمایاں کیا گیا ہے وہیں عصر حاضر کے قلمکاروں پر بھی خامہ فرسائی کی گئی ہے اور ان کے تخلیقی دریچوں کو بھی وا کر دیا گیا ہے اور یہ سب ان کے قلم کا اعجاز ہے کہ انھوں نے عصر حاضر کے چنندہ ستاروں کے ساتھ ساتھ کم شہرت یافتہ ادیبوں اور شاعروں کو بھی ان کی شعری اور نثری خدمات کا اعتراف کرنے میں فراخ دلی سے کام لیا ہے اور ان کے نظریات اور فنی خصوصیات کو قارئین تک پہنچایا ہے۔

اردو کی عصری صدائیں کا دوسرا گوشہ رواں صدی کی رواں شاعری کے ذیلی عنوانات سے کتاب میں شامل ہے۔ یہ باب مختلف شعرا کے شعری مجموعوں پر مشتمل ہے جن کے فکر و فن پر غلام نبی کمار نے بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ یہ شعرا اپنے زمانے میں کہنہ مشق شعرا ہونے کے باوجود گمنامی کے بازار میں کھو گئے تھے، کیونکہ نہ تو وہ اپنی حیات میں اپنا کوئی شعری مجموعہ شائع کر سکے اور نہ ان کے لواحقین میں سے کسی نے اپنے ورثے کو بچانے کی کوشش کی ہے، لیکن بعض شعرا کے فرزندوں نے یہ کام بہ طرز احسن انجام دیا ہے جن میں شوکت پردیسی کے فرزند ندیم احمد جونپوری، محمد یعقوب ساقی، محمد اسلم غازی، ڈاکٹر نعیم صبا وغیرہ چند نام ہیں جنھوں نے اپنے بزرگوں کے کلام کو ترتیب دے کر شائع کر کے ایک اہم فریضہ انجام دیا ہے اور غلام نبی کمار جیسے ہونہار ادیب اور تبصرہ نگار نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے ان تمام شعری مجموعوں پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اس باب میں انھوں نے میں محمد یعقوب، سید صفدر رضا، چمن آہوجہ، عبدالمتین جامی، م۔ شین نجمی، ابن غوری، کلیم اختر، انور آفاقی ہارن شامی، فاروق انور فاروق، سالک جمیل براڈ اور سلیمان فراز حسن پوری کے ساتھ ساتھ اردو کے عصر حاضر کے مستند شعرا شوکت پردیسی، ڈاکٹر حافظ کرناٹکی اور ڈاکٹر حنیف ترین کی شاعری کا احاطہ بھی کیا ہے۔

تیسرا باب عصری فکشن کے جھلملاتے ستارے کے عنوان سے اس کتاب میں نمایاں طور پر جھلکتا ہے۔ کتاب کے اس گوشے میں ڈاکٹر قیام نیر بحیثیت افسانہ نگار، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد اور سلطان آزاد کے فن پاروں کو بھی زیر بحث لایا ہے۔ اس باب میں بھی بعض تازہ دم اور بعض کہنہ مشق شعرا پر تبصرہ کیا گیا ہے اور ان کی شعری خصوصات کے ساتھ ساتھ ان کی کوتاہیوں کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

خود نوشت، مکتوب نگاری، ادب اطفال، تبصرہ نگاری، رواں صدی کی ادبی صحافت، جیسے ابواب کو ایک ہی زمرے میں رکھا جا سکتا ہے کیونکہ ان نثری اصناف پر نوجوان ادیب بہت کم قلم اٹھاتے ہیں، اس لحاظ سے اس باب کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ غلام نبی کمار کی یہ کوشش قابل مستحسن ہے اور انھوں نے بڑی محنت اور جانفشانی سے ان تمام نثری فن پاروں پر روشنی ڈالی ہے اور ان کی اہمیت متعین کی ہے۔ یہ تمام ابواب ان کی گہری سوچ و فکر کی غمازی کرتے ہیں۔

اردو کی عصری صدائیں میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس میں ایسے ادیبوں کو پڑھنے کا موقع ملتا ہے جن کو زمانے کی بے اعتنائی نے فراموش کر دیا ہے۔ میں غلام نبی کمار کو اس ادبی تحقیقی و تنقیدی کام کو منظر عام پر لانے کے لیے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

رتن سنگھ: ایک مطالعہ

مصنف/ ناشر: ڈاکٹر شاذیہ ہدایت

صفحات: 416، قیمت: 85 روپے، سنہ اشاعت: 2017

مبصر: عمران عاکف خان

259، تاپتی ہاسٹل، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی 67

اردو ادب میں صنف افسانہ کو متعدد خصوصیات و امتیازات کے سبب اہم مقام و حیثیت حاصل ہے۔ حالانکہ اس کا سفر نامانوس ماحول، محدود موضوعات، مخصوص اسلوب اور سہمی ہوئی طرز میں ہوا تھا مگر بہت جلد اسے قاری کا سہارا مل گیا جس کی گوناگوں طلب نے نہ صرف اس کے ماحول کو تبدیل کیا بلکہ اس کے موضوعات و اسالیب کو وسعت دینے کا تقاضا کیا جس پر لبیک کہتے ہوئے افسانہ نگاروں نے اسے مزدروں، غریبوں، کسانوں، گاؤں دیہات کے باشندوں کا ترجمان بنا دیا۔ اس تقاضے کی تکمیل میں افسانہ نگار بڑے گھرانوں، اونچی ذات کے افراد اور حکومتوں تک کو ان کے بلند اور ناقابل تسخیر مکانوں و محلوں سے باہر گھسیٹ لائے۔ افسانے کے اگلے پڑاؤ نے روایت پسندوں اور فرسودہ خیالات کے حامل افراد میں ارتعاش مچا دیا۔ 'انگارے' اس پڑاؤ کی پہلی منزل تھی۔ مگر بہت جلد اسے حقیقت پسندی اور ترقی پسندی کا ترجمان بنا کر سامراج اور فرنگی چالبازیوں کے خلاف محنت مزدوری کرنے والے اور بے گار دینے والے غریب کسانوں کی آواز بنا دیا گیا۔ پھر ہندوستان دولخت ہوا اور اس تقسیم کے نتیجے میں رونما ہونے والے فسادات نے عظیم ہندوستان کو جگہ جگہ سے خاکستر کر دیا۔ اس کے سینے پر انسان کراہتے پھر رہے تھے اور اس کی زمین کو اپنے ناحق خون سے تر کر رہے تھے۔ عصمتیں لٹ لٹ کر اس کی ردائے عفت کی لاج بچا رہی تھیں اور چیخیں و سسکیاں

اسے ترنگ ورس عطا کررہی تھیں۔ یہ اردو افسانے کا چوتھا پڑاؤ تھا جب اسے سلگتے اور آگ لگاتے موضوعات واسالیب، پلاٹ اور کردار ملے۔ پھر یہ دور بدلا اور افسانہ جدید دور میں داخل ہوگیا۔اس دور میں اس کے سائنسی انقلاب اور اقدار کی آخری حد تک پامالی اس کا موضوع بنی۔افسانے کا سفر ابھی جاری ہے۔حالاں کہ اب تک افسانہ اپنی عمر کے 100 سال سے زائد برس مکمل کر چکا ہے مگر اس کی پیشانی پر تھکن اور کسل مندی کا نشان تک موجود نہیں ہے۔اس کے برعکس اس کے چہرے پر وہ خوشی دمک رہی ہے جو کسی مسافر کے چہرے پر اعصاب شکن تھکن کے بعد اپنی منزل نظر آجانے پر دمکتی ہے۔

زیر مطالعہ کتاب 'رتن سنگھ: ایک مطالعہ' ایک ایسے ہی شخص کی داستان حیات، علمی و ادبی خدمات کا بیان ہے جس کی شناخت افسانہ نگاری کے حوالے سے ہی ہے۔رتن سنگھ کا شمار ہمارے عہد کے بڑے اور اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے ہجری اور تقسیم کے نتیجے میں پنپنے والے مسائل کی عکس بندی والی روش کو فروغ دیا ہے۔یوں تو انھوں نے ناولٹ اور نظمیں بھی لکھی ہیں مگر ان کا افسانوی سرمایہ سب سے زیادہ ہے۔

یہ کتاب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ اردو سے وابستہ ڈاکٹر شاذیہ ہدایت کی جانب سے اردو دنیا کو دی جانے والی عظیم الشان اور بے مثال سوغات ہے۔انھوں نے اس میں رتن سنگھ کی افسانہ نگاری اور ان کی ادبی حیثیت و مقام کا تعارف مناسب اور مقبول انداز میں کرایا ہے۔اس کتاب کو انھوں نے پانچ خاص اور تیرہ ضمنی ابواب کی کہکشاں سے سجایا ہے۔جن کی تفصیل حسب ذیل ہے: باب اول: رتن سنگھ، شخصیت اور ادبی سفر (اس باب میں رتن سنگھ کی زندگی اور ادبی سفر کا بیان ہے)

باب دوم: رتن سنگھ بحیثیت افسانہ نگار (اس باب میں رتن سنگھ کی افسانہ نگاری، موضوعات کا انتخاب اور فنی خصوصیات کا مفصل تذکرے کے ساتھ ساتھ ان کے چند اہم افسانوں کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے) باب سوم: رتن سنگھ کے افسانچوں کا تنقیدی جائزہ (اس باب میں رتن سنگھ کے افسانچے مانک موتی پر خامہ فرسائی کی گئی ہے) باب چہارم: رتن سنگھ کے ناولٹ (دربدری، اڑن کھٹولا، سانسوں کا سنگیت، تین ناولٹ اس باب میں مذکور ہیں) باب پنجم: رتن سنگھ کا منظوم کلام، تراجم اور دیگر فن کاروں پر رتن سنگھ کی تحریریں (جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے۔اس میں رتن سنگھ کی غیر متداول تحریروں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے)

ڈاکٹر شاذیہ ہدایت کی یہ کتاب اپنے موضوع اور عنوان سے کہاں تک انصاف کر تی ہے، آیا اس میں اسلوب وطرز کی کہاں تک رعایت ہے، یا اسے ادبی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد کیا مقام مل سکتا ہے، یہ تعین تو نقادوں کا حق ہے۔ تاہم اس کے مطالعے اور عبارت و بین عبارت یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ رتن سنگھ جیسے عظیم افسانہ نگار کی ابتدائی اور ارتقائی زندگی، ان کی افسانہ نگاری کے فن و موضوعات کے انتخاب کے حوالے سے تعارف میں یہ کتاب ضرور معاون ثابت ہوگی اسی طرح رتن سنگھ فہمی میں بھی یہ سنگ میل بنے گی۔

مجھے امید ہے کہ اردو دنیا اس پیش کش کا والہانہ استقبال کرے گی نیز اس کو خاطر خواہ پذیرائی حاصل ہوگی۔

نشاط قلم

مصنف: ڈاکٹر شکیل احمد

صفحات: 320، قیمت: 240 روپے

ناشر: مکتبۃ الفہیم مئوناتھ بھنجن یوپی

مبصر: صالحہ صدیقی، ریسرچ اسکالر جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'نشاط قلم' مختلف سمیناروں کے لیے لکھے گئے پینتیس مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو ڈاکٹر شکیل احمد کی کاوش کا ثمرہ ہے۔اس کتاب کو مصنف نے دو حصوں میں منقسم کیا ہے پہلا 'مطالعۂ نظم' اس حصے میں کل اٹھارہ مضامین شامل ہیں۔حصہ دوم 'مطالعۂ نثر' ہے جس میں مصنف کے سترہ مضامین شامل ہیں۔دونوں حصوں میں غزل، نظم، مسدس، نعت، ناول، داستان، افسانہ، سوانح، صحافت، خاکہ اور سفر نامہ سے متعلق نثر و نظم کے مختلف گوشوں کو منور کیا گیا ہیں۔

اس کتاب کے دونوں ہی حصوں میں بے حد معلوماتی مضامین شامل ہیں۔حصہ اول میں ایک اہم مضمون 'اردو شاعری میں بارہ ماسہ: سرسری جائزہ' ہے جس میں مصنف نے مختصر تعارف کے ساتھ اس کی اردو ادب میں روایت اور مشہور و مقبول بارہ ماسوں پر بھی اہم و بھرپور گفتگو کی ہے۔ پہلے حصے میں اس ذیل کے مضامین میں فانی بدایونی کی شاعری اور زندگی، میر کا استفہامیہ لہجہ، کبیر داس اور اردو شاعری، عصر حاضر میں مسدس حالی کی معنویت وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔اس حصے میں اردو کے کلاسیکل و جدید شاعروں کی حیات و خدمات اور ان کے شاعرانہ کمالات پر بھی مضامین شامل ہیں مثلاً فضا ابن فیضی کی نظم گوئی، مولانا عامر عثانی کی شاعری، ماہر عبدالحئی کی غزل گوئی، سردار شفیق کا شعری سفر، مشتاق شبنم شخصیت اور شاعری، زندگی کی سرگرمیوں کا شاعر: ڈاکٹر آفاق فاخری، اختر مسلمی کی شاعری، فاخر جلال پوری کی نظم نگاری، رئیس الشاکری کی نعتیہ شاعری اور اختر بستوی کی مختصر نظمیں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اس طرح اس کتاب میں قدیم و جدید دونوں ہی شعرا و ادبا کا حسین سنگم دکھائی دیتا ہے۔

اسی طرح حصہ دوم میں شامل مضمون پریم چند کے افسانوں میں بھوک کے مارے لوگ، راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری، اکرام اعظمی کی افسانہ نگاری وغیرہ انتہائی معلوماتی اور اہم مضامین ہیں۔اس حصہ میں شامل 'شہر میں کرفیو: ایک ناول کئی پہلو' انتہائی اہم مضمون ہے اس سلسلے میں شکیل احمد رقم طراز ہیں کہ 'شہر میں کرفیو' ہندی کے نامور مصنف، فکشن نگار اور سینئر آئی۔پی۔ ایس افسر وبھوتی نرائن رائے کا ہندی ناول ہے جس میں انسانی درد نئے عنوان اور نئے تناظر کے ساتھ موجود ہے۔اس کے مطالعہ سے انسانی مصائب مجبوری اور مفلوک الحالی کا انمٹ احساس پیدا ہوتا ہے۔اردو قاری کو اس درد میں شریک کرنے کے لیے ناول کے اردو ترجمہ کی بنیاد پر تجزیہ پیش کیا گیا ہے جس سے ناول نگاری کی کردار نگاری، جزئیات نگاری اور انصاف پسندی سامنے آتی ہے۔'' اسی طرح لکھنؤ کی پانچ راتیں اور نشاط آبلہ منفرد اصناف ادب کی نمائندہ ہے لیکن اس میں بھی تہذیبی و فکری اوصاف دیکھے جا سکتے ہیں۔

اس کتاب کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی عیاں ہو جاتی ہیں کہ ڈاکٹر شکیل احمد ایک سنجیدہ قلم کار ہے ان کی تحریروں میں صداقت کا عنصر نمایاں ہے۔ان کے تمام مضامین تحقیق کی روشنی میں لکھے گئے ہیں، انھوں نے منصفانہ انداز بیان اختیار کیا جس سے ان کی تحریروں میں مباحث اور استدلال پایا جاتا ہیں۔

اس مختصر تبصرے میں تمام مضامین پر الگ الگ تفصیلی گفتگو کرنا ممکن نہیں۔لہٰذا یہاں مجموعی طور پر ان کے مضامین پر گفتگو کی گئی ہیں، اس مجموعہ میں بعض ایسے مضامین بھی شامل ہیں جن پر عموماً کم گفتگو ملتی ہے اور کچھ ایسے بھی ہیں جن پر شاید ہی لکھا گیا ہو وہ موضوعات کون کون سے ہیں؟ اس کے لیے آپ لوگوں کو 'نشاط قلم' کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ زبان آسان استعمال کی گئی ہیں جس سے مصنف کے افکار و خیال کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہیں۔اس کتاب میں مصنف کی یہ کوشش قابل ستائش ہیں کہ اس نے اپنی ہر بات مدلل انداز میں کہی ہیں۔ یہ مضامین کا مجموعہ یقیناً ہمارے ادبی سرمایے میں اہم اضافہ ہے۔ جسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جانا چاہیے۔ امید ہے ادبی حلقوں میں بھی اس مجموعہ کا اسی طرح استقبال کیا جائے گا جس کی یہ مستحق ہے۔

ذکر رفتگان

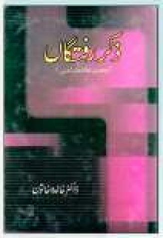

مرتب: ڈاکٹر خالدہ خاتون
صفحات: 192، قیمت: 250 روپے
ناشر: ارم پبلشنگ ہاؤس، دریاپور، پٹنہ 4
مبصر: متین اچل پوری بیابانی
اچل پور، 444806، ضلع امراوتی مہاراشٹر

ذکر رفتگان، ڈاکٹر خالدہ خاتون کے مختلف اوقات میں تحریر کردہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین تحقیقی یا تنقیدی نوعیت کے نہیں ہیں۔ ان مضامین کی نوعیت تعارفی، تاثراتی اور معلوماتی ہے۔ ڈاکٹر خالدہ خاتون ایک ایسی خوش نصیب قلم کار رہی ہیں جنھیں اپنے ادبی سفر کے دوران بیش بہا شجر ہائے سایہ دار سے مستفیض ہونے کے مواقع فراہم ہوتے رہے ہیں جہاں وہ پروفیسر وہاب اشرفی اور پروفیسر لطف الرحمن کی سحر انگیز شخصیت سے ذاتی طور پر متاثر رہی ہیں۔ وہیں پروفیسر قمر اعظم ہاشمی جیسے جہاندیدہ استاد کی شاگردی کا شرف بھی انھیں حاصل ہوا ہے۔

یادِ رفتگاں میں ان شخصیات پر مضامین شامل ہیں جن سے موصوفہ کے شخصی مراسم رہے ہیں۔ اور پھر بعض مضامین اردو زبان وادب کی پسندیدہ شخصیات پر لکھے گئے ہیں۔

کتاب کے شروع میں 'میرا تاثر' کے عنوان سے پروفیسر علیم اللہ حالی کی مختصر سی ایسی تحریر جو مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ پیش لفظ کے عنوان سے پروفیسر اعجاز علی ارشد، وائس چانسلر، مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی پٹنہ کی تحریر کتاب کی زینت ہے۔ حرفِ آغاز کے عنوان سے موصوفہ کتاب کے تعارف کے ساتھ کچھ شخصیات سے متعلق اپنے احساسات بھی رقم کرتی چلی گئی ہیں۔ اس کتاب میں بیس مضامین شامل کیے گئے ہیں۔

'سرسید کی ادبی خدمات' یہ کتاب کا پہلا مضمون ہے۔ مضمون نگار سرسید کے مشن پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں کہ ''انھیں زندگی کے اعلیٰ مقاصد وعزائم عزیز تھے، جن کو وہ خاص وعام تک پہنچانے کے متمنی تھے۔'' اپنے اس بیان کی حمایت میں پروفیسر سید احتشام حسین کا حوالہ دیا کہ ''انھوں نے ادب کو بدلا اور قاری کی اہمیت کو سمجھا۔'' کتاب کے دوسرے مضمون کا عنوان ہے عہد ساز ادبی شخصیت 'مولانا الطاف حسین حالی'۔ اس مضمون میں مولانا حالی کی ادبی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے ان سے متعلق مشاہیر کی آرا کو بھی بطور حوالہ پیش کیا۔

ڈاکٹر محمد حسن اور ان کی ڈرامہ نگاری موصوفہ کی پی ایچ ڈی تحقیق کے مقالے کا عنوان رہا ہے۔ لہٰذا 'پروفیسر محمد حسن، شخصیت اور ادبی خدمات' کے عنوان سے ایک مضمون شامل کتاب ہے۔

ذکر رفتگاں کے درمیان ڈاکٹر خالدہ خاتون نے کائناتِ شعر میں قدم رکھا تو شاعرانہ عظمت کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے شاد عظیم آبادی سے ملاقات کروادی۔ پروفیسر سید احتشام حسین کے اس بلیغ قول کے ساتھ کہ ''انھوں نے غزل کو نہ صرف سنبھالا بلکہ اس میں ایسی رنگینی اور شیرینی بھردی کہ غزل پھر سے زندہ ہوگئی''۔ آگے قدم بڑھایا تو 'پرویز شاہدی شخص اور شاعر' کے عنوان سے شاعرِ مذکورہ کی کئی خانوں میں بٹی شاعری کا سرسری جائزہ پیش کیا۔ آگے چل کر ممتاز شاعر و نقاد مظہر امام پر بصد عقیدت مندی قلم اٹھاتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ کے معتبر الفاظ کی روشنی اپنے مداح کی کثیر الجہات اور بلند و بالا شخصیت پر اس طرح ڈالی کہ ''انھوں نے پوری زندگی ادبی دشت کی سیاحی میں گزاری۔ نثر نگاری کے میدان میں بھی اپنا لوہا منوا چکے ہیں''۔ ملک محمد جائسی، حفیظ بنارسی اور منصور عمر کی ادبی کاوشات کا مختصراً ذکر کر کے شہریار اور اختر الایمان کی شاعری کا حاصلِ مطالعہ پیش کیا۔ فلمی دنیا کے دو قد آور شعرا مجروح سلطانپوری اور ساحر لدھیانوی کی پرچھائیوں پر چشمِ بصیرت ٹھہری تو فلمی گلیاروں اور ادبی گھواروں میں ان کی بے پناہ مقبولیت کی گواہی دی۔

فکشن کے متعلق جن قلم کاروں پر مضامین بھی شاملِ کتاب ہیں وہ مضامین مضمون نگار کی متعلقہ شخصیات سے گہری عقیدت مندی اور وسیع وعمیق مطالعے کے غماز ہیں۔

پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر لطف الرحمان، پروفیسر قمر اعظم ہاشمی اور پروفیسر منصور عمر ریاست بہار کی نامور اور کثیر الجہات شخصیات رہی ہیں۔ ان پر تحریر کردہ مضامین موصوفہ کے بے پناہ قلمی لگاؤ اور گہری عقیدت مندی کے آئینہ دار ہیں۔

آخر میں ہم ڈاکٹر قمر رئیس پر لکھے گئے مضمون کا ذکر کرنا چاہیں گے۔ اس لیے کہ یہاں قاری تین باتیں خصوصی طور پر نوٹ کرتا ہے۔ پہلی بات یہ کہ ڈاکٹر قمر رئیس نے ازبکستان کے قیام کے دوران ازبکی زبان بصد شوق اس خوبی کے ساتھ سیکھی کہ براہ راست ترجمے کیے۔ دوسری خاص بات ان کی وہ نہایت گراں قدر کتاب جس کا عنوان ہے 'ظہیر الدین بابر... شخص اور شاعری'، یہ دو خاص باتیں جان کر قاری کا ذہن حیرت کدہ بن جاتا ہے جبکہ تیسری خاص بات اس کے علم میں آتی ہے کہ لوگ پیار سے انھیں 'چھکّن' کہتے تھے۔

کتاب کے مضامین میں جہاں مذکورہ بالا شخصیات کے حالاتِ زندگی اور فکر وفن پر تاثرات ومحسوسات رقم کیے گئے ہیں وہیں مختلف مشاہیر ادب کی قیمتی آرا کے حوالوں سے ان نگارشات کی حنابندی کی گئی ہے۔ یہ مضامین سادہ اور رواں دواں زبان میں لکھے گئے ہیں۔ مضمون نگاری کے آئینہ خانے میں زبان وبیان نے سنگھار تو کیا ہے مگر اسے سولہ سنگھار نہیں کہا جاسکتا۔ اگر یہ سنگھار، سولہ سنگھار کے درجے کو پہنچ جائے تو سونے پر سہاگہ ہو۔

کتاب کا ٹائٹل عمدہ اور طباعت روشن ہے۔ پروف ریڈنگ پر کچھ اور توجہ دی جاتی تو بہتر ہوتا۔

فکشن

پیج ندی کا مچھیرا (افسانوی مجموعہ)

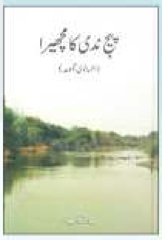

مصنفہ: صادقہ نواب سحر
صفحات: 152، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2018
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: اسماء، ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'پیج ندی کا مچھیرا' عہد جدید کی معروف فکشن نگار صادقہ نواب سحر کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جو 2018 میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی کے زیر اہتمام منظر عام پر آیا۔ اس سے قبل 'خلش بے نام سی' کے عنوان سے ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 2012 میں منظر عام پر آچکا ہے۔ جسے ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی حاصل ہوئی۔

1980 کے بعد اردو فکشن نگار خواتین میں ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کا نام اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ انھوں نے اپنے قلم کے ذریعہ ادبی دنیا میں اپنی ایک مستحکم شناخت قائم کی۔ مصنفہ بیک وقت اردو، ہندی، انگریزی اور تیلگو زبانوں پر قدرت رکھتی ہیں۔ ان کی تقریباً ڈیڑھ درجن سے زائد کتابیں شائع ہوکر مقبول ہوچکی ہیں۔ انہیں علمی وادبی کارناموں کے سبب مختلف اداروں اور اکادمیوں کی جانب سے متعدد اعزازات و اکرامات سے بھی نوازا گیا۔ صادقہ نواب سحر نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا اس کے بعد ناول، ڈرامے، افسانے اور دیگر اصناف (نظم ونثر) کی طرف متوجہ ہوئیں، ان کی دیگر زبانوں میں کئی اہم تصانیف بھی طبع ہوچکی ہے۔ ناول 'کہانی کوئی سناؤ متاشا' 2008 اور 'جس دن سے' دسمبر 2016 نے ناول کے میدان میں ان کی شہرت کا علم بلند کیا۔

زیر مطالعہ کتاب 'پیج ندی کا مچھیرا' مصنفہ کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے جس کی

اشاعت سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ نے فکشن کی جانب دیگر اصناف کے مقابلہ تاخیر سے توجہ دی جس کا ذکر مصنفہ نے کتاب کے ابتدائیہ میں بھی کیا ہے لکھتی ہیں: ''اچھا ہے کہ فکشن کی طرف دیر سے آئی۔ اب رومانی نیم رومانی زندگی میں انیسویں صدی کی نئی دنیا گھل مل جو گئی ہے۔ دیرآید درست آید۔''

'بیچ ندی کا مچھیرا' 152 صفحات پر مشتمل اور 12 کہانیوں پر محیط ہے، جس کی فہرست بالترتیب اس طرح ہے۔ سہمے ہوئے کیوں ہو انکش، وہیل چیئر پر بیٹھا شخص، راکھ سے بنی انگلیاں، ٹمٹماتے ہوئے دیے، شیشے کا دروازہ، پہاڑوں کے بادل، دیوار گیر پینٹنگ، اکنامکس، بیچ ندی کا مچھیرا، الو کا پٹھا، ہوٹل کے کاؤنٹر پر اور ٹوٹی شاخ کا پتہ قابل ذکر ہے۔

درج بالا افسانوں کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ صادقہ نواب سحر کے افسانوں کی فضا سماج کی کڑوی کسیلی مگر حقیقت نگاری کی اساس پر ٹکی ہوئی ہے، جہاں بے شمار سماجی اور اقتصادی مسائل درپیش ہیں۔ انھوں نے انسانی فطرت میں موجود داخلی احساسات و کرب کو اپنے افسانوی قالب میں ڈھال کر نئے معنی و مطالب عطا کیے۔ ان کے یہاں گہرا معاشرتی، اقتصادی اور نفسیاتی شعور ہے جس کی بنا پر انھوں نے عصری حالات و کوائف سے قاری کو روشناش کرایا۔ یہ افسانے موجودہ معاشرے کی حقیقی تصویریں بیان کرتے ہیں۔ یہ کہانیاں ہندوستانی معاشرے کے سماجی حالات، سیاست، بدلتے ہوئے تہذیبی اقدار اور اس تبدیلی کے زیر اثر بدلتے ہوئے سماجی، اقتصادی، نفسیاتی اور جنسی مسائل کو بطور موضوع پیش کرتے ہیں۔

افسانہ 'ٹوٹی شاخ کا پتہ' ایک ایسی عورت کی کہانی پر مبنی ہے جس کی بیوہ ماں نے غربت کے سبب اپنی چھوٹی بیٹی کو 40 سال بڑے عمر کے آدمی سے نکاح کردیا۔ جس کے نتیجہ میں رئیسہ تمام عمر نفسیاتی اور روحانی طور پر مایوس زندگی کا سامنا کرتی ہے۔ شوہر کی بڑھتی عمر، بے اولادی کا غم اور نا آسودہ خواہشات کی تکمیل نے اس کو ایک ایسے راستے کا مسافر بنادیا جہاں عورت محض تماشائی، نمائش اور دل بہلانے کا ذریعہ کے سوا کچھ نہیں۔ اولاد کی خواہش نے اس کو اس حد تک اندھا کردیا کہ وہ اپنے بچپن کے عاشق سے اولاد کی خواہش کی تکمیل کرتی ہے لیکن شوہر کی موت کے بعد اس پر یہ راز عیاں ہوتا ہے کہ اس کا شوہر اس راز سے واقف ہونے کے باوجود اس سے اور اس کی بیٹی سے بے حد محبت کرتا ہے۔ اس افسانے میں مصنفہ نے عورت کی نفسیات کی جو تصویر پیش کی ہے وہ اپنی فطری خواہشات کی تکمیل کی آرزومند ہے۔ عورت ان کے یہاں معاشرے میں اپنے مقام اور حیثیت کے سبب غیر مطمئن اور احساس تنہائی کا شکار معلوم ہوتی ہے۔ عورت کے اسی درد کو افسانہ ٹمٹماتے ہوئے دیے، دیوار گیر پینٹنگ، الو کا پٹھا اور شیشے کا دروازہ، میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔

افسانہ 'شیشے کا دروازہ' ایک ایسی لڑکی کی کہانی بیان کرتا ہے جو گاؤں کے ماحول کی پروردہ سیدھی سادی معمولی شکل وصورت والی لڑکی ہے لیکن جب وہ شہر آتی ہے تو اپنی تعلیم اور دیگر اخراجات کی تکمیل کے لیے ایک کاسمیٹک شاپ میں ملازمت کرتی ہے جہاں اس کو بہت سے تلخ تجربات کا سامنا ہوتا ہے لیکن وہ حالات سے ہمت نہیں ہارتی بالآخر اپنے کام میں مہارت حاصل کرلیتی ہے۔ شیشے کی دکان اس کے لیے ایک ایسا بازار ثابت ہوتی ہے جہاں مختلف قسم کے اچھے برے لوگوں سے اس کا سامنا ہوتا ہے کس طرح وہ تمام حالات کا سامنا کرتی اور اس سے ابھرتی ہے اس بات کو اس افسانے میں بتایا گیا ہے۔

اقتباس دیکھیے: ''اتنی خوبصورت دوکان میں سانولی، گول چہرے پر مہاسوں کے داغوں والی معمولی سی سوتی یا سستے سنتھے ٹک کپڑوں میں غریب ضرور دکھائی دیتی ہوں، کم حیثیت والی، مگر کوئی مجھ سے جیت کر تو دکھادے۔'' (ص 70)

یہی وہ مثبت رجحان ہے جس کی عکاسی اس افسانے میں کی گئی ہے۔

افسانہ 'راکھ سے بنی انگلیاں' ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو ایک شرابی شوہر کی بیوی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک افسانہ نگار بھی ہے جس کی کہانیاں آزادی نسواں، عورتوں کے مسائل و حالات کے گرد بنی ہوتی ہے جہاں عورت بے بس و مجبور نہیں بلکہ حالات سے ابھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہاں مصنفہ نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ آج کی عورت عہد حاضر سے خود کو ہمکنار تو کرنا چاہتی ہے لیکن اپنے اندر کی نسوانیت کو مارنے سے قاصر ہے۔

مجموعے میں شامل دیگر افسانے اپنی انفرادیت کے سبب نمایاں ہیں۔ کہیں کالج کے طلبا میں پنپنے والی محبت کا ذکر ہے تو کہیں اعلی عہدوں پر مقیم ان اساتذہ کا بیان ہے جو اپنی تدریسی زمینداریوں کی تکمیل میں ناکام ہیں کہیں عشق کی تلاش تو کہیں ازدواجی زندگی کے مسائل، الغرض تمام افسانے عہد حاضر کے مسائل و حالات سے نبرد آزما قاری کو ایک ایسی دنیا کی سیر کراتے ہیں جو حقیقی ہے اور جہاں سے ہر روز ہمارا گزر تو ہوتا ہے لیکن غور و فکر کا مرحلہ بہت کم ملتا ہے۔

امید ہے کہ علمی و ادبی حلقے میں صادقہ نواب سحر کی دیگر نگارشات کی طرح متذکرہ مجموعے کی بھی خاطر خواہ پذیرائی کی جائے گی۔

پورٹریٹ (افسانے)

مصنف: اقبال حسن آزاد

صفحات: 192، قیمت: 125 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصرہ: عالیہ خانم، D-31، لین نمبر 1، نور الہی نارتھ گھونڈہ، دہلی 53

اردو افسانہ تقریباً ایک سو بیس برس کا سفر طے کرچکا ہے اور آج اردو کی اہم ترین صنف میں شمار ہوتا ہے۔ گزشتہ دہائیوں میں جو اہم افسانہ نگار سامنے آئے ان میں سے اکثر افسانہ نگاروں کا تعلق صوبۂ بہار سے ہے۔ مثلاً عبدالصمد، حسین الحق، ذکیہ مشہدی، غضنفر، مشرف عالم ذوقی، پیغام آفاقی، شوکت حیات اور شموئل احمد وغیرہ۔ اس علاقہ کے افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام اقبال حسن آزاد کا بھی ہے جو اپنی تخلیقی صلاحیت کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے اردو افسانے کو بلندی پر پہنچانے کے لیے کوشاں ہیں۔

اقبال حسین آزاد کا افسانوی مجموعہ 'پورٹریٹ' تئیس افسانوں پر مشتمل ہے جن میں کچھ افسانے قابل ذکر ہیں۔ اقبال حسن آزاد اپنے افسانوں میں کسی ایک پہلو پر ہی نگاہ مرکوز نہیں رکھتے بلکہ ایک مختصر افسانے میں ہی کئی پہلوؤں کو سمیٹنے کا فن جانتے ہیں۔ سماجی عدم توازن پر ان کی گہری نگاہ ہے وہ سماج کی غلاظت سے منہ نہیں پھیرتے بلکہ اس کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں اور صاف لفظوں میں یہ کہنے سے نہیں چوکتے کہ ''کرپشن کو ہمارے پورے سماج نے قبول کرلیا ہے''۔ 'افسانہ شریف آدمی' میں انھوں نے ملک و سماج میں بڑھتے کرپشن کو ہی موضوع بنایا ہے اور قارئین کے سامنے معاشرے کی ان ناہمواریوں کو پیش کیا ہے جو آج سماجی سطح پر قبول کی جاچکی ہیں۔

ان کا افسانہ 'حصار' بھی ایک ایسے معاشرے کی عکاسی کرتا ہے جس میں اخلاقیات ناپید ہے اور معاشرے میں ہر طرف ایک بدبو پھیلی ہوئی ہے یہ بو دراصل اخلاقی زوال کی علامت ہے جو معاشرے کے اندر اور باہر موجود ہے لیکن انسان یہ سمجھنے میں قاصر ہے کہ یہ بوئے بد کہاں سے آرہی ہے لیکن یہ بو دراصل اس کے ضمیر کے اندر کی ہے۔ اقبال حسن آزاد اپنے معاشرے سے مایوس نظر آتے ہیں جو اخلاقی طور پر سڑ چکا ہے۔

اقبال حسن آزاد نے افسانے کے فن کا لحاظ رکھتے ہوئے بیانیہ اسلوب اختیار کیا ہے۔ ان کی یہ خوبی ہے کہ وہ کسی بھی واقعہ یا منظر کو مکمل احساس و جذبات میں ڈوب کر بیان کرتے ہیں جس سے کہانی قاری کی دلچسپی میں اضافہ کرتی ہے۔ ان کے بعض افسانے ایسے بھی ہیں جو قاری کو زندگی گزارنے اور زندگی میں آنے والے مسائل سے سمجھوتہ کرنے کی

تعلیم دیتے ہیں۔'مردم گزیدہ'، 'سوختہ ساماں' اور 'آسیب' قاری کو زندگی کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کراتے ہیں۔ مثلاً 'مردم گزیدہ' میں وہ یہ پیغام دیتے ہیں کہ ہر انسان اذیت میں مبتلا ہے اور زندگی کا دوسرا نام ہی پریشانی ہے۔ نتیجتاً ہمیں سماج میں رہنے کے لیے ہر طرح کی اذیت میں صبر کرنا ہوگا۔ حالانکہ افسانہ نگار کے صبر کرنے کے فلسفے کو تسلیم کرنا مشکل ہے کیونکہ سماج میں یا زندگی میں ہو رہی ہر طرح کی اذیت پر صبر نہیں کیا جاسکتا۔

ان کا افسانہ 'آسیب' زندگی کی تلخ حقیقتوں پر مبنی ہے۔ دراصل یہ افسانہ ہندوستان میں پھیل رہی بے روزگاری کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ بھی بے روزگاری کا شکار ہے۔ تعلیم یافتہ لوگ بھی ایسے کام کرنے پر مجبور ہیں جو ایک ناخواندہ شخص کرسکتا ہے۔ اسی قسم کے لوگ مکمل طور پر تقدیر یا قسمت پر یقین رکھتے ہیں چونکہ اس کے علاوہ ان کے دل کی تسکین کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ افسانے میں زندگی کی کامیابی اور ناکامیابی کا حصول سب تقدیر پر قائم دکھایا گیا ہے اس میں ایک تعلیم یافتہ شخص اپنی تمام زندگی ایک گھریلو ملازم بن کر گزار دیتا ہے۔

اقبال حسن آزاد کا اہم افسانہ 'پورٹریٹ' ہے جو غالباً ہنری جیمس کے ناول 'The Portrait of a Lady' (1881) سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ حالانکہ دونوں کا تھیم مختلف ہے پھر بھی کچھ چیزیں مشترک معلوم ہوتی ہیں۔ اقبال حسن آزاد نے فنی چابکدستی سے افسانے کو بالکل مختلف انداز سے پیش کیا ہے۔ افسانہ میں پوری ایک نسل کا فاصلہ یعنی جنریشن گیپ دکھایا گیا ہے۔ جس طرح قدیم لوگ اپنی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے انس اور محبت رکھتے ہیں لیکن ان کی اولاد کو اس محبت کا احساس نہیں ہوتا۔ مگر جب وہ خود اس عمر کو پہنچتے ہیں تو حقیقت سے روشناس ہوتے ہیں۔ افسانے میں گھر کی قدیم چیزوں کی قدر، آبائی مکان کی محبت اور اپنی آبائی زمین سے لگاؤ کا جذبہ نمایاں ہے۔ اسی کے ساتھ افسانہ نگار دنیا بھر میں پھیلی مذہبی شدت پسندی کی بھی مخالفت کرتا ہے اور اس بات پر مصر ہے کہ تاریخ خود کو ضرور دہراتی ہے مگر کچھ چیزیں من و عن ویسی ہی رہتی ہیں جیسے پہلے تھیں۔ مثلاً: ''کبھی کبھی کسی نیوز چینل کی تلاش میں ریموٹ کنٹرول کا بٹن دباتے وقت اسے عجیب بے ہنگم کپڑوں میں ملبوس اچھلتے کودتے طالب علم نظر آئے تو اسے لگتا جیسے واقعی بہت کچھ بدل گیا ہے لیکن جب اسے خبروں کے درمیان خون کے دھبے اور دھوئیں کے بادل دکھائی دیے تو محسوس ہوتا کہ کچھ بھی نہیں بدلا ہے۔''

یعنی کیلنڈر کی تاریخیں تو بدل رہی ہیں لیکن حادثات، بدعنوانی، قتل و غارت گری اور فسادات میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اسی طرح اقبال حسن آزاد کے زیادہ تر افسانے عصری سماج کی کڑوی حقیقتوں کا آئینہ دکھاتے ہیں لیکن کچھ افسانے جیسے 'مرد' اور 'کھنڈر' فنی طور پر کمزور ہیں۔ علاوہ ازیں عریاں نگاری مصنف کے یہاں فحش نگاری بن گئی ہے۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ اقبال حسن آزاد کا مجموعہ 'پورٹریٹ' اشاعت و طباعت کے لحاظ سے جاذب نظر ہے لیکن پروف کی غلطیاں گراں گزرتی ہیں۔

اب صبح نہیں ہوگی

مصنف: ابواللیث جاوید
صفحات: 149، قیمت: 150 روپے
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
مبصر: ظفر عالم، F41، فلیٹ نمبر 402، نفیس روڈ، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'اب صبح نہیں ہوگی'، ابواللیث جاوید کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس سے پیشتر ان کے تین افسانوی مجموعے 'کانچ کا درخت' 'کنارے کٹ رہے ہیں' 'جاگتی آنکھوں کا خواب' منظر عام پر آچکے ہیں۔ مذکورہ افسانوی مجموعہ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مصنف سماج میں رہنے والے اس حساس شخص کی مانند ہے جو اپنے اطراف و جوانب کے ماحول سے مکمل طور پر باخبر رہتا ہے کیونکہ جس طرح سے موصوف نے اپنے افسانوں کے ذریعہ مسائل حیات کے پہلوؤں پر غور و فکر کرکے مختلف النوع تمثیل و استعارات کے توسط سے ترسیل و ابلاغ کا ذریعہ اپنایا ہے، اس سے ان کی وسیع النظری ذکی الحسی اور حساس قلبی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ طریقہ کار سہل پسندی کا حامل نہیں بلکہ اس کے لیے فن کار کو اپنا خون جگر صرف کرنا پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے ایسے افسانے عدیم المثالی کے باکمال درجے تک پہنچ جاتے ہیں۔

کتاب میں شامل پہلا افسانہ 'چراغ کی لو' جو کہ موجودہ ہندوستانی معاشرے کی بہ خوبی عکاسی کرتا ہے۔ ہندوستان ایک کثیر المذاہب ملک ہے۔ انگریزوں کے آنے سے قبل یہاں کی زندگی امن و امان کا گہوارہ تھی لیکن ان کے آنے کے بعد ہندوستانی فضا زہر آلود ہوگئی، کیونکہ فرنگیوں نے اس ملک پر حکومت کرنے کے لیے جس حربے کا کثرت سے استعمال کیا وہ مذہبی منافرت تھی۔ تب سے آج تک ملک میں گاہے بہ گاہے مذہبی شدت پسندی کسی نہ کسی شکل میں رونما ہوتی رہتی ہے۔ ابولیث جاوید کا مذکورہ افسانہ بھی اسی بات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ 'زبان یار من ترکی' ایک نفسیاتی افسانہ ہے جس میں مصنف نے مشرقی اور مغربی تہذیب کے فرق کو بڑے خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔ 'کیسے سمجھاؤں' اصلاح معاشرہ پر مبنی کہانی ہے جس میں سماج کی اہم برائی رشوت خوری کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ 'عالم پناہ' افسانہ کے ذریعے انسان کی بے جا خواہشات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور ساتھ ہی روحانی طرز زندگی کی تلقین بھی ملتی ہے۔ 'احساس' ایک ایسا افسانہ ہے جس میں دنیا کی بے ثباتی اور خوف خدا کا احساس کرایا گیا ہے۔

'نصیب دشمناں' میں مصنف نے اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ بچپن سے بچوں کو اگر دین کی تعلیم نہ دی جائے تو بڑے ہونے پر بچے غیر شرعی کام انجام دینے لگتے ہیں اور والدین کی لاکھ کوششوں کے باوجود بچے راہ راست پر نہیں آتے۔ ابولیث کا یہ افسانہ اردو کے پہلے ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کے ناول 'توبۃ النصوح' کی یاد دلاتا ہے۔ یہ افسانہ ایک ایسے والدین کی کہانی پر مبنی ہے، جن کا اکلوتا لڑکا 'جلال' جو کہ کانونٹ سے فارغ ہے اور ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد والدین کی مرضی کے خلاف غیر مسلم لڑکی سے شادی کرلیتا ہے۔ اسی غم میں اس کی والدہ 'مریم' دنیا سے کوچ کرجاتی ہیں اور والد تنہا زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ 'وائلڈ لائف' منفرد طرز اسلوب پر مبنی افسانہ ہے۔ موصوف نے یہ واضح کیا ہے کہ حسن اخلاق کے ذریعہ شقی القلب انسان کے دل میں رحم کا جذبہ موجزن کیا جاسکتا ہے۔ 'گردش' ایک ایسا افسانہ ہے جس کے مطالعے سے اقبال کا یہ شعر خود بہ خود گردش کرنے لگتا ہے کہ ''تجھے کیوں فکر ہے اے گل دل صد چاک بلبل کی۔ تو اپنے پیرہن کے چاک تو پہلے رفو کرلے۔ دراصل یہ افسانہ ایک ایسے گروجی پر مبنی ہے جو دنیا کی مصیبتیں دور کرنے میں اتنے منہمک ہیں کہ انھیں اپنے گھر کا ذرا بھی خیال نہیں۔

'اب صبح نہیں ہوگی' جو پورے مجموعے کا عنوان بھی ہے۔ موصوف نے تمثیلی پیرائے بیان میں پرندوں کی مدد سے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان کے جیسے عمل ہوتے ہیں ویسے ہی اس پر فیصلوں کا نزول ہوتا ہے۔ افسانہ 'بن باس' میں ایک فرنگی عورت کے ذریعہ مشرقی اور مغربی تہذیب کو منکشف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مصنف نے اس کہانی کے ذریعہ یہ واضح کیا ہے کہ مشرقی ماحول میں والدین کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ایام پیری میں پورا خاندان، ان کے ارد گرد جمع رہتا ہے۔ جب کہ مغربی معاشرے میں ساری سہولتیں دستیاب ہونے کے باوجود کنبہ پروری نہ ہونے کے باعث بزرگوں کو کسمپرسی کی حالت میں زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔

یوں تو عصری مسائل کا شاید ہی کوئی گوشہ ہو جو ابواللیث جاوید کی نظر سے اوجھل ہو ان کا افسانہ 'سناٹا بولتا ہے' موجودہ دور کے سب سے اہم مسئلے نکسل واد کی ترجمانی کرتا

ہے جس میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نکسل واد کا وجود سرمایہ داروں کے ظلم و بربریت کا نتیجہ ہے۔ ابولیث نے اس افسانے کے ذریعہ یہ پیغام دیا ہے کہ اگر آج دنیا کو امن کا گہوارا بنانا ہے تو مساوات کو اولیت دینی ہوگی۔

جہیز نہ لینے کی بات تو سبھی کرتے ہیں لیکن عملی زندگی میں نیک اور زہد و تقویٰ سے معمور لوگ بھی اس عیب سے نہ بچ سکے۔ اسی مسئلے کو مصنف نے 'میری بھی ایک بات' کا موضوع بنایا ہے۔ کتاب میں شامل آخری افسانہ 'بیچ تھری' ہم جنس پرستی کے مسائل پر مبنی ہے۔ مصنف نے تاریخی واقعات کے ذریعے کہانی کا تانا بانا بنا ہے۔ قوم لوط کے فعل اور ان کی سزا کا ذکر اور فحش نگاری کی ابتدا کرنے والے مغربی اخبار 'The Sun' کا ذکر کیا ہے۔ مغرب کے اس نحوست زدہ فعل میں کس طرح سے مشرقی قوم ملوث ہو رہی ہے اس طرف بھی اشارہ ملتا ہے۔

چودہ افسانوں پر مشتمل یہ کتاب ان تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے، جو انسانی زندگی کے لیے کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ موصوف کے افسانوں کے بارے میں حقانی القاسمی کی یہ رائے کہ ''انھوں (ابواللیث جاوید) نے جھوٹے عہد کی سچی کہانیاں لکھی ہیں ہر فرد اپنے حرکات کا عکس اس افسانوی آئینہ میں دیکھ سکے'' صحیح معلوم ہوتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ ابواللیث جاوید کے افسانے قارئین کو متحرک کرنے میں ضرور معاون ثابت ہوں گے۔

عروض

ہندی چھند عربی فارسی عروض :ایک مطالعہ

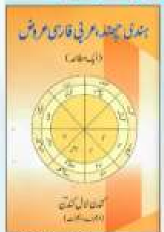

مصنف: کندن لال کندن

صفحات: 196، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: کندن لال کندن

مبصر: امتیاز احمد علیمی

ریسرچ فیلو، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

کندن لال کندن ایک ذی علم، متحرک اور فعال شخصیت کا نام ہے۔ وہ نثری و شعری دونوں اصناف پر کامل عبور رکھتے ہیں۔ ان کی بنیادی شناخت ایک ماہر علم عروض اور ایک اچھے رباعی گو کی ہے۔ صنف رباعی میں اب تک ان کے چار مجموعے منظر عام پر آ کر داد و تحسین وصول کر چکے ہیں۔ 'رباعیات کندن' کندن لال کندن کے عروضی سفر کا گرانقدر کارنامہ ہے کیونکہ اس میں مصنف نے رباعی کے 54 آہنگ اور اوزان کی مشکل سے مشکل ترین بحث کو بہت ہی آسان اور سلیس اسلوب میں پیش کیا ہے جس سے تفہیم میں دشواری پیش نہیں آتی۔ علم عروض سے متعلق مصنف کی تازہ ترین چوتھی تصنیف 'ہندی چھند عربی فارسی عروض: ایک مطالعہ' ہے۔ اس سے قبل علم عروض پر ان کی تین کتابیں 'ارمغان عروض'، 'معراج فن'، 'عروض و پنگل و خلیل' شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہو چکی ہیں۔ مذکورہ کتابوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ کندن لال کندن ایک شخص نہیں بلکہ ایک ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے جو کسی بڑے علمی اور تدریسی ادارے سے منسلک ہونے کے بجائے محکمہ ڈاک سے منسلک رہ کر اتنی بڑی اور اہم تصانیف کے ذریعہ نہ صرف اردو ادب کی سمت و رفتار کو آگے بڑھایا بلکہ طلبا و اساتذہ دونوں کے لیے اپنی بیش بہا تصانیف سے علم عروض کے افہام و تفہیم کے مرحلے کو بہت ہی آسان کر دیا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں علم عروض کا سہ لسانی مشترکہ مطالعہ بہت ہی باریک بینی کے ساتھ تحقیقی و تجزیاتی انداز میں پیش کیا ہے۔ مصنف نے اپنے قارئین کے لیے علم عروض سے متعلق جہاں آسانیاں پیدا کی ہیں وہیں علم عروض کے فن اور اس کے اصولوں کی افہام و تفہیم اور اس کے برتنے میں نت نئے طریقے بھی ایجاد کیے ہیں جس کا تفصیلی ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ مصنف کی یہ کتاب ایک سہ لسانی تجربہ کے طور پر اہل اردو کے لیے کسی نایاب تحفہ سے کم نہیں ہے۔

علم عروض سے متعلق ویسے تو اردو میں کئی کتابیں لکھی گئی ہیں جن کا ذکر مصنف نے کیا ہے اور ان سے استفادہ بھی کیا ہے لیکن ان تمام کتابوں سے الگ مصنف کی یہ کتاب الگ نوعیت کی ہے۔ علم عروض کی دوسری کتابوں کے زیادہ تر مآخذ عربی اور فارسی کے ہیں لیکن مصنف نے اس کتاب میں عربی، فارسی کے ساتھ اردو اور ہندی چھند سے استفادہ کر کے مثالوں کے ساتھ آسان اسلوب میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں مصنف کے ذریعہ ان تمام شکوک و شبہات کا ازالہ کیا گیا ہے جو وقتاً فوقتاً طلبا کے ذریعہ ظاہر کیے گئے تھے۔ کتاب میں شامل بیشتر مضامین کا تعلق علم عروض سے ہے۔

کتاب میں شامل پہلا مضمون 'ہندی چھند عربی فارسی عروض :ایک مطالعہ' ہے۔ اس میں مصنف نے اپنی علمی سفر کا ذکر کرتے ہوئے علم عروض سے متعلق اپنے تمام ماخذات کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ علم عروض جسے سنسکرت اور ہندی بھاشا میں ''پنگل' قافیہ کو 'انپر اس' علم بدیع کو 'النکار' حالات و معاملات کو اور عاشق و معشوق کو 'نائیکا بھید' اور علم موسیقی کو 'سنگیت' کہا جاتا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے اپنے آپ کو اردو ہندی شاعری کے عروضی تقابلی مطالعے تک محدود رکھا ہے۔ علم عروض سے متعلق یہ ایک اہم مضمون ہے جسے پڑھا جانا چاہیے تاکہ علم عروض کے ماخذات تک رسائی حاصل کی جا سکے۔ یہی مضمون ہے جو کتاب کا عنوان بھی ہے۔ دوسرا مضمون 'صرف و نحو عروضی اصطلاحات حسب ضرورت' اور تیسرا مضمون 'پنگل/علم عروض میں اجزائے اولین کا ذکر' ہے۔ اس میں عروضی اصطلاحات کو اس کے صرفی و نحوی ضرورت اور تقاضوں کے تحت کس طرح برتا جاتا ہے اس کو مثالوں کے ذریعہ سمجھانے کی بھرپور کوشش کی ہے اور ساتھ ہی اجزائے پنگل و عروض پر بھی خاطر خواہ روشنی ڈالی ہے جس سے تقطیع اور بنٹ کا سمجھنا آسان ہو گیا ہے۔ چوتھا مضمون 'بھاشا میں تشکیل ارکان' ہے۔ اس میں ہندی بھاشا میں ارکان کتنے طریقے سے حاصل ہوتے ہیں اور ان کا محل استعمال کیا ہے اس کے اصول اور ضابطے کیا ہیں ان سب پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ پانچواں مضمون 'زحاف و مزاحف اور تسبیغ زحاف' ہے۔ اس میں زحاف کسے کہتے ہیں، مزاحف کسے کہتے ہیں اور تسبیغ زحاف کیا ہے۔ اس کی تعریف اور اس کے اصول کا ذکر کرتے ہوئے ارکان و بحور کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ زحافات کے حوالے سے مصنف نے اس مضمون میں عروضی مشاہدے اور تجربے کو بہت جامع اور موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ مضمون بھی بہت اہم ہے۔ اس کے علاوہ 'اصول تقطیع (بنٹ کا بیان)'، 'برٹ کی قسمیں اور حدود'، 'چھندوں (بحور) کا بیان' وغیرہ بھی اہم مضامین ہیں جن کے مطالعے سے بہت سی اہم معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ مذکورہ تمام مضامین سے قبل ساحل احمد کا مضمون 'کندن لال جی کے فکری و نظری اثبات' اور راشد عزیز کا مضمون 'عروض و چھند کے اسرار اور کندن کی پتوار' کے عنوان سے ہے جس میں مصنف کی علمی و فکری جہات کے ساتھ ان کی تخلیقی نگارشات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ مذکورہ مضامین کے بعد مختلف بحور مثلاً بحر متقارب، بحر متدارک، بحر ہزج، بحر رجز، بحر رمل، بحر کامل، بحر مضارع، بحر مقتضب اور بحر منسرح کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے اس کے اصل اور رعایتی اوزان کے سہارے ہندی چھندوں کے قالب میں وہی شبیہیں دریافت کی گئی ہیں جو عروضی ارکان کی قرأت سے دریافت ہوتی ہیں وہی غنائی وصف جو ہندی چھندوں میں پایا جاتا ہے اس کی نشاندہی اردو میں مستعملہ اوزان و ارکان سے دریافت کیا گیا ہے۔ ان سب کا تفصیلی ذکر مختلف بحور کے ذکر میں کیا گیا ہے اور اس کو مثالوں سے سمجھانے کی مکمل سعی کی گئی ہے۔ یہ کتاب ہر اعتبار سے لائق مطالعہ ہے۔ کتابت و طباعت بھی بہتر ہے۔ پروف ریڈنگ کی غلطیاں نا کے برابر ہیں البتہ تین سو روپے قیمت مناسب نہیں ہے۔ امید قوی ہے کہ علمی اور ادبی حلقوں میں اس کی حد درجہ پذیرائی ہوگی۔

■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں
خبرنامہ

National Council for Promotion of Urdu Language

خبرنامہ

’بچوں کی دنیا‘ ایک رسالہ ہی نہیں، نسلِ نو کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی ایک تحریک بھی ہے

جلیاں والا باغ سانحہ کے سو سال مکمل ہونے سے متعلق بچوں کی دنیا کی خصوصی اشاعت پر قومی کونسل کے ڈائرکٹر کا اظہار خیال

نئی دہلی: ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں بلاتفریق مذہب وملت تمام طبقات نے حصہ لیا، قربانیاں پیش کیں، قید وبند کی تکالیف برداشت کیں اور اپنے سینوں پر گولیاں کھائیں مگر ملک کی آزادی اور تعمیر وترقی کو انھوں نے ہر چیز سے مقدم رکھا یہاں تک کہ اپنی جانوں کی بھی پرواہ نہیں کی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نئی نسل اپنے اسلاف کی قربانیوں اور ملک کی تاریخ سے واقف ہو۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے جلیاں والا باغ سانحہ کے سو سال مکمل ہونے پر ماہنامہ ’بچوں کی دنیا‘ کے خصوصی شمارے کی اشاعت پر کیا۔ انھوں نے کہا کہ ماہنامہ ’بچوں کی دنیا‘ میں جلیاں والا باغ کے سانحہ پر مضامین کی اشاعت کے ذریعے کونسل ایک طرف جہاں بچوں کو اپنے ملک کی تاریخ سے جوڑنا چاہتی ہے، وہیں ان میں ملک کے تئیں قربانی کا جذبہ بھی پیدا کرنے کی خواہاں ہے تاکہ ہر بچہ ملک کی تاریخ اور اپنے رہنماؤں کی قربانیوں سے واقف ہو۔

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے مزید کہا کہ 13/اپریل 1919 کو ہندوستان کے بہت سے باشندوں نے امرتسر کے جلیاں والا باغ میں جام شہادت نوش کیا تھا، تاہم ان کی یہ شہادت آنے والی نسلوں کے لیے ایک پیغام بن گئی کہ ملک کی حفاظت اور تعمیر وترقی ہر چیز سے زیادہ ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس سے پہلے بھی ہم اس طرح کے خصوصی شمارے شائع کرتے رہے ہیں اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔ دراصل ماہنامہ ’بچوں کی دنیا‘ صرف ایک رسالہ ہی نہیں بلکہ نئی نسل کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور ان میں ملک وقوم کے تئیں مثبت جذبہ پیدا کرنے کی تحریک بھی ہے۔ یہ رسالہ اپنے مختلف النوع مفید مواد کے سبب بچوں کے درمیان دن بہ دن مقبول ہوتا جارہا ہے۔

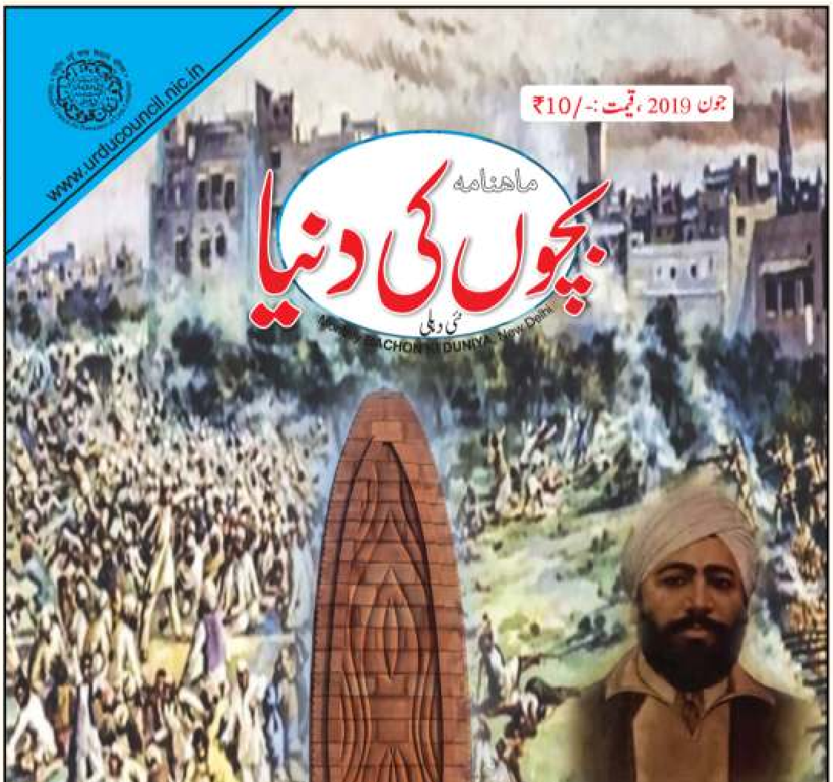

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 9 مئی 2019

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

اردو نعت گوئی میں غیر مسلم شعرائے کرام

مراد آباد: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور ریاجن کلیان سمیتی کے اشتراک سے اتوار کو ایم ایچ ڈگری کالج میں 'اردو نعت گوئی میں غیر مسلم شعرائے کرام' موضوع پر سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ اس پروگرام میں ملک بھر سے آئے مقالہ نگاروں نے اپنے مقالے پیش کیے۔ پروگرام کا آغاز مولانا ابوالحسن نے تلاوت قرآن سے کیا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے اتر پردیش اردو اکادمی کی سابق چیئر پرسن ترنم عقیل نے شرکت کی۔ انھوں نے کہا کہ نعت نبی اکرمؐ کی شان بیان کرتی ہے، یہ عنوان اس سمینار کی کامیابی کا ضامن ہے۔

مہمانان ذی وقار کے طور پر شریک این سی پی یو ایل کے رکن مظاہر خاں اور بار ایسوی ایشن کے سابق سکریٹری آنند موہن گپتا نے پروگرام کی تعریف کی۔ ڈاکٹر اسما، ڈاکٹر ایم اے معروف، ڈاکٹر شاکر، ڈاکٹر آصف حسین، ترنم پروین وغیرہ نے اپنے مقالے پیش کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ دور کی اگر بات کریں تو بہت سے غیر مسلم شاعر نعت و منقبت کہے بغیر آگے نہیں بڑھتے۔ برج موہن، کیفی دہلوی ایک باکمال شاعر گزرے ہیں جو نعت رسول کے بغیر اپنے تمام کلام کو نامکمل تصور کرتے ہیں۔ پروگرام کی نگرانی ڈاکٹر وشواوتار جیمنی نے کی۔ صدارت مشہور شاعر منصور عثمانی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض سینئر صحافی سید محمد ہاشم نے انجام دیے۔ اظہار تشکر ناصر منصوری نے کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 6 مئی 2019

یاس یگانہ چنگیزی: حیات وخدمات

مراد آباد: قومی کونسل برائے اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے نہرو یوا مہیلا سمیتی کے زیر اہتمام ایک روزہ قومی سمینار بہ عنوان 'یاس یگانہ چنگیزی: حیات و خدمات' منعقد کیا گیا۔ تقریب کا افتتاح مفتی شبیر نے تلاوت کلام الٰہی سے کیا۔ جبکہ نعت پاک کا نذرانہ پیش کرنے کی سعادت خیال مراد آبادی نے حاصل کی۔ مذکورہ موضوع پر مراد آباد کے علاوہ دیگر اضلاع وصوبوں کے قلمکاروں نے اپنے مقالات پیش کیے۔ معروف قلمکار اور صولت پبلک لائبریری کے چیئرمین سین شین عالم نے کہا کہ اردو کے منتشر الخیال، تنگ مزاج، انا پرست، ضدی، سخت گیر، شعلہ خو اور باغیانہ تیور رکھنے والے شعرا میں یاس یگانہ چنگیزی کا نام سرفہرست رکھا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ زندگی بھر اپنی ذات وسماج سے الجھنے والا یہ شاعر کبھی مذہبی حوالہ سے جھنجھلاہٹ آمیز اظہار پر معتوب ہوا تو کبھی انانیت کی حد تک دراز خودشناسی کے سبب طنز تضحیک کا شکار بنا۔ کبھی بے وجہ شعرائے متقدمین کی کھال کھینچنے پر لوگوں سے جھگڑتا رہا تو کبھی فکر وفن میں یکتائی کے دعوے نے کسی سے ذہن ملنے نہیں دیا۔ کبھی کشمکش حیات سے ایسا نبرد آزما ہوا کہ خود میں الجھ کر رہ گیا۔ غرض متضاد ومتنازعہ کیفیات و واقعات کا عمر بھر شکار رہنے والا یہ شاعر اردو زبان وادب میں اپنی انفرادیت کے ایسے نقوش چھوڑ کر گیا کہ ناقدین ادب کو کم ازکم یہ تو تسلیم کرنا ہی پڑا کہ یگانہ واقعی یکتا و یگانہ تھا۔ انھوں نے کہا کہ عجیب اتفاق ہے کہ زندگی بھر غالب کی مخالفت کرنے والے یگانہ کی شاعری اور شخصیت پر ہمیشہ غالب کا سایہ رہا یعنی جس طرح مرزا اسداللہ خاں اسد کو غالب تخلص اختیار کرنے کے بعد غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی ٹھیک اسی طرح یاس عظیم آبادی کو یگانہ تخلص رکھنے پر ہی اعتبار وافتخار حاصل ہوا۔ انھوں نے اپنے قدآور معاصرین سے کس قدر آگے بڑھ کر فکر وفن کی راہیں ہموار کیں اور جدید اردو غزل کے بنیاد گزاروں میں ان کا نام خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ یگانہ اس لحاظ سے بھی اپنے معاصرین میں ممتاز نظر آتے ہیں کہ تحقیقی اور تنقیدی حوالہ سے سب سے زیادہ کام انھیں پر کیا گیا ہے۔

سمینار میں ڈاکٹر شفیع ایوب جے این یو دہلی، ڈاکٹر معراج الحسن مراد آباد، ڈاکٹر سالک جمیل پٹیالہ پنجاب، ڈاکٹر شمس تبریزی پنچکولہ پنجاب، تمیم احمد نسیمی اور سید آصف حسن نے بھی اپنے مقالات پیش کیے۔ اس موقع پر خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی ڈاکٹر ایس ٹی حسن نے کہا کہ آج اردو کا جو حال ہے اس سے ہم اہل اردو اچھی طرح واقف ہیں لیکن اردو رسم الخط اور بول چال کی زبان کو ایک منظم سازش کے تحت اس لیے ختم کیا گیا کہ ہم اپنی تہذیب سے دور ہوجائیں اور اپنے اکابر اور بزرگان دین کی تاریخ سے وابستہ نہ ہوں۔ سمینار کے روح رواں محمد جان ترکی اور زیبا تبسم نے بھی مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔ تقریب کی نظامت صحافی و شاعر کشش وارثی نے اپنے منفرد انداز میں کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 6 مئی 2019

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دهلی:

بہ یاد ثاقب بریلوی حلقہ کے مشاعرہ کا انعقاد

نئی دهلی: حلقہ تشنگانِ ادب کی 513 ویں شعری نشست کے نام پر شاندار مشاعرہ کا انعقاد ہوا۔ بہ یادِ اردو دوست شاعر ثاقب بریلوی لودھی روڈ نئی دہلی ایونیو روڈ بلاک 13 میں واقع کمیونٹی سینٹر میں، ڈاکٹر جی آر کنول کی صدارت وسیماب سلطان پوری کی نظامت میں منعقد مشاعرے میں روزہ دار ممبر بھی شریک ہوئے۔ شرف میزبانی سابق سکریٹری محکمہ فن ثقافت والسنہ حکومت، اردو اکادمی دہلی منیشا سکسینہ IPS اور دیویش شری واستو IPS کو حاصل رہا۔ اردو دوست آنجہانی شاعر ثاقب بریلوی کے فرزند آنجہانی اکشے کمار کے اہل خانہ کے خلوص کی ستائش کی گئی۔ صدر حلقہ ڈاکٹر جی آر کنول نے اس موقعے پر کہا کہ اردو دوست شاعروں میں آنجہانی ثاقب بریلوی کلام کی بنیاد پر اچھے رتبے کے شاعر تھے۔ صدر نے مزید کہا صحیح معنوں میں شری واستو اور سکسینہ خاندان نے اصل میں ادبی روایت کی پاسداری نبھائی ہے، بزرگوں کی روایت کو زندہ رکھنا بڑی بات ہے۔ پریس سکریٹری حلقہ تشنگان ادب حبیب سیفی نے بتایا آنجہانی ثاقب بریلوی کی یاد میں پہلی نشست حلقہ کی جانب سے جشن ثاقب بریلوی کی صورت میں 20 مئی 1982 منعقد ہوئی تھی۔ آج کا یہ 38 واں مشاعرہ تھا جس نے شرکاء کو اپنا معترف بنایا۔ کنوینر IPS دیویش شری واستو نے کہا کہ سالہا سال مئی کے مہینے کا ساری فیملی کو شدت سے انتظار رہتا ہے، ہم منتظر رہتے ہیں کہ کب مشاعرے کا اعلان ہو اور بڑے پاپا کی روح کو تسکین کا ذریعہ احباب شعر وادب کو بلا کر بنا سکیں۔ ہمارے گھر کا رجحان بلا شبہ ادبی رجحان ہے، شعر وشاعری کا رجحان خود منیشا سکسینہ میں بھی ہے، امت کمار نے دلچسپی دکھائی تو یہ ممکن ہوسکا۔ آنجہانی اکشے کمار کی فیملی میں سے ادب کا ذوق وشوق رکھنے والی نئی نسل نے بھی اپنی نظموں اور شاعری کے ذریعہ ادبی لگاؤ کا ثبوت دیا جن میں ریتک، آدت سکسینہ، دیویا شری واستو، امت کمار، کے نام شامل ہیں۔ مشاعرے میں کم وبیش 40 شعرا وشاعرات نے حصہ لیا۔

پریس ریلیز: حبیب سیفی، دہلی، 23 مئی 2019

آندھرا پردیش:

قرآن اور سائنس

المدینہ کالج میں توسیعی لکچر بعنوان 'قرآن اور سائنس' کا

اہتمام کیا گیا۔ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز عزت مآب شیخ الجامعہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدر آباد نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت فرمائی۔ جناب الحاج محمد عبدالقدیر آئینہ پوری صدر مدینہ ایجوکیشنل سوسائٹی نے صدارت کی۔ پروگرام کا آغاز حافظ ریحان کی قرأت پاک سے ہوا۔ ڈاکٹر بشیر احمد پرنسپل نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کی 35 سالہ تدریسی، تحقیقی اور اشاعت دین کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز قرآن مجید، سائنس اور تعلیم کے میدان کے انٹرنیشنل اسکالر ہیں۔ انھوں نے تقریباً زائد از 17 ممالک بشمول امریکہ، برطانیہ، ترکی، عرب امارات، کویت، سعودی عربیہ، مراقش، اردن وغیرہ کے مختلف شہروں میں اسلام اور سائنس کے عنوان سے اپنے کلیدی خطبے پیش کیے ہیں۔ المدینہ کالج کے وسیع وعریض آڈیٹوریم میں طلبا و طالبات کے علاوہ اساتذہ اور شہر محبوب نگر کے دیگر تعلیمی سوسائٹیز کے عہدے دار اور دانشوران کی تقریباً 400 کی تعداد موجود تھی۔ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے اپنے خطاب کا آغاز سورہ علق، سورہ قصص کی آیتوں سے کیا۔ انھوں نے کہا کہ علم کا حاصل کرنا ہر ایک پر فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر بچے کے اندر صلاحیتیں پوشیدہ رکھی ہیں۔ ان صلاحیتوں کو فروغ دینے اور نشو ونما کرنے میں والدین اور اساتذہ کا اہم رول ہوتا ہے۔ اسلام ایک مکمل دین ہے اور قرآن مجید مکمل ضابطہ حیات ہے اور ہمارے نبی حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجسم قرآن ہیں آپ کا ہر قول اور عمل ہمارے لیے اسوہ حسنہ ہے۔ احکاماتِ الٰہی اور سنت رسول صلعم سے روگردانی نہ کریں۔

پریس ریلیز: محمد مصباح عبید احمد، 29 اپریل 2019

اعزاز و اکرام:

اردو کوچنگ امتحان میں کامیاب طالب علموں کو سند تقسیم

دھام پور: اردو ادب انجمن ویلفیئر سوسائٹی کی جانب سے ایک سالہ اردو کوچنگ کے امتحان میں کامیاب طالب علموں کو اتر پردیش اردو اکادمی کے ذریعے سند تقسیم کی گئی۔ محلّہ نئی سرائے واقع تنظیم کے آفس پر ایک سالہ اردو کوچنگ میں کامیاب امیدواروں کو ایک سند دی گئی جس کی ایک سالہ اردو کوچنگ کر کے امتحان پاس کرنے کے بعد اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ سے سند جاری کی جاتی ہے۔ سرکار کے ذریعے اردو کی ترقی اور اس کا دائرہ بڑھانے کے لیے یہ کوچنگ بنا کسی اجرت کے دینے کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس موقعے پر سکریٹری محمد یونس نے خواہشمند لوگوں سے اپیل کی ہے کہ زیادہ سے زیادہ اردو سیکھیں اور اردو بولیں، اردو اپنائیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو ہمارے ملک میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ وہ ایک بڑی زبان ہے یہ کسی مذہب یا کسی خاص طبقے کی زبان نہیں ہے۔ پروگرام کی نظامت محمد یونس اور صدارت محترمہ روشن جہاں نے کی۔

روزنامہ 'اخبارِ مشرق' دہلی، 6 مئی 2019

غالب اکادمی میں ادبی نشست کا انعقاد

نئی دهلی: غالب اکادمی، نئی دہلی میں ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر جی آر کنول نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر ڈاکٹر سید فاروق نے شرکت کی۔ انھوں نے کہا کہ یہ بہت اچھی بات ہے کہ غالب اکادمی کی نشست میں مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی ہے۔ ادیب مختلف موضوعات کو مختلف نظریے سے دیکھتا ہے۔ ہمیں ملک کی سالمیت اور یکجہتی کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ اس موقعے پر انجم عثمانی نے اپنا افسانہ دوسری چادر اور چشمہ فاروقی نے اپنا افسانہ موبائل پیش کیا۔ مشاعرہ میں شریک شعرا میں جی آر کنول، معین شاداب، شعیب رضا فاطمی، فروغ اسلام، شفا کجگاؤنوی، ایم آر قاسمی، کیلاش سمیر، ودیا جین، نسیم بیگم نسیم، شاہد انور، شہلا احمد، ارملا مادھو کے نام قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں ماہی اور عزیزہ مرزا نے بھی اپنے کلام پیش کیے۔ افسانوں پر گفتگو بھی ہوئی۔ اس موقعے پر کنور مہندر سنگھ بیدی کے مقبول عام اشعار پر مبنی کتاب کی رونمائی بھی ہوئی اور نارنگ ساقی نے حاضرین کی خدمت میں کتابیں پیش کیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 7 مئی 2019

شعیب نوگانوی

امروهه: عالمی شہرت یافتہ شاعر شعیب رضا نوگانوی کو ان کے سعودی عرب دورے کے دوران اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ اس دوران میکس فاؤنڈیشن کے منتظمین کی جانب سے ان کی خدمت میں استقبالیہ کے ساتھ ساتھ شاعر اہل بیت اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ اس دوران فاؤنڈیشن کے ارشاد حیدر نے کہا کہ ہمیں خوشی ہے کہ شعیب نوگانوی رثائی شاعری کے حوالے سے پوری دنیا میں حلقہ نوگانواں کا نام روشن کر رہے ہیں۔ شعیب نوگانوی نے کہا کہ ان کو خوشی ہے کہ میکس فاؤنڈیشن نے ان کو اس اعزاز کے لیے منتخب کیا، شعیب نوگانوی نے مزید کہا کہ بذریعہ شاعری ان کی کوشش سماج کو پیغام دینا ہوتا ہے جس سے نوجوان نسل بیدار ہو سکے۔ قابل ذکر بات ہے کہ اس سے قبل وہ اردو اکادمی دہلی اور ایرانی حکومت کی جانب سے ممتاز اعزاز حاصل کر چکے ہیں۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 30 مئی 2019

رسم اجرا:

مہِ کامل

رام پور: سابق ایڈیٹر ماہنامہ نیا دور اور ڈپٹی ڈائریکٹر اطلاعات میرٹھ ڈویژن ڈاکٹر وضاحت رضوی کے دست مبارک سے انجمن الفلاح ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام منعقدہ مخصوص تقریب میں ڈاکٹر اطہر مسعود خاں کا تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ 'مہ کامل' کا رسم اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے وضاحت رضوی نے کہا کہ ماہنامہ 'نیا دور' کی اشاریہ سازی ایک نمایاں کام ہے جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اردو دنیا میں یہ تحقیقی کام ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ بالخصوص ریسرچ اسکالرز اس سے زیادہ مستفید ہو رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اطہر مسعود خاں نے اشاریہ اردو غزل، اشاریہ اردو افسانہ، اشاریہ شعرائے اترپردیش، اشاریہ میر انیس وغیرہ تیار کر کے اردو محققین وناقدین کے لیے کام آسان کر دیا ہے۔ محترمہ رضیہ پروین نے بڑی خوبصورتی اور سلیقہ مندی سے اس کتاب کو مرتب کیا ہے۔ حالانکہ ڈاکٹر اطہر مسعود خاں نے بہت سے مضامین سپرد قلم کیے ہیں مگر رضیہ پروین نے ان کے اہم مضامین کو منتخب کر کے کتابی شکل میں جس طرح عوام الناس کے لیے پیش کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔

اس تقریب میں مقامی ادبا، شعرا اور صحافیوں نے بھی مہ کامل کتاب پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انجمن الفلاح کے بانی اور سماجی کارکنان انور مسعود خاں المعروف کپتان صاحب نے تقریب میں آنے والے تمام مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 6 مئی 2019

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا'

اورنگ آباد: نئی نسل کے لیے ملک وملت کی تاریخ سے آگاہی نہایت ہی ضروری ہے۔ تاریخ کے بغیر کوئی بھی قوم و ملک اپنی شناخت وحیثیت طے نہیں کر سکتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر مرزا خضر (سابق صدر شعبہ تاریخ مولانا آزاد کالج فاروپمن) نے محسن احمد اردو پرائمری اسکول اورنگ آباد میں 25/مئی صبح گیارہ بجے ریڈ اینڈ لیڈ فاؤنڈیشن کی جانب سے قومی اردو کونسل دہلی سے شائع ہونے والے رسالہ 'ماہنامہ بچوں کی دنیا' کے جلیاں والا باغ واقعہ کو سو سال ہونے پر شائع خصوصی شمارہ کی رونمائی کی گئی۔ ڈاکٹر ذاکر پٹھان (صدر شعبہ تاریخ بدناپور کالج) نے جلیان والا باغ حادثہ کی تاریخ اور اس کے پس منظر پر تفصیل سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ 13/اپریل 1919 کو بیساکھی کے تہوار کے موقع پر یہ حادثہ رونما ہوا جس میں کئی ہندوستانیوں کی جانیں گئیں، انگریزوں نے ڈاکٹر ستیہ پال سنگھ اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو گرفتار کر لیا تھا جس کی وجہ سے عوام میں زبردست بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔ انگریز حکومت نے رولٹ ایکٹ پاس کیا جس کی رو سے کسی بھی ہندوستانی کو جب چاہے اور جہاں چاہے بغیر کسی گواہ و ثبوت اور صرف شک کی بنیاد پر گرفتار کر لیا جاتا تھا۔ اس قانون کے خلاف پورے ملک میں زبردست تحریک چلائی گئی۔ جنرل ڈائر نے معصوم لوگوں پر گولی چلانے کا حکم دیا۔ ایک ہزار سے زائد لوگ شہید ہوئے۔ ڈاکٹر شیخ اعجاز نے اپنے خطاب میں کہا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی تاریخ کو از سر نو ترتیب دیں اور نئی نسل کے لیے آسان اور عام فہم زبان میں اس کو شائع کریں۔ پروگرام میں یہ طے کیا گیا کہ نئے تعلیمی سال کے آغاز میں اورنگ آباد کے اردو اسکولوں میں جلیان والا باغ حادثہ پر ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کا خصوصی شمارہ ریڈ اینڈ لیڈ فاؤنڈیشن کی جانب سے مفت میں دیا جائے گا۔ ساتھ ہی یہ بھی فیصلہ لیا گیا کہ اورنگ آباد، مہاراشٹر اور خصوصاً ملک کی تاریخ اور مسلم بادشاہوں پر چھوٹے چھوٹے کتابچے کم قیمت میں طلبا اور عوام الناس کے لیے شائع کیے جائیں گے، جن سے طلبا اور عوام میں تاریخ سے دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کا شوق پیدا ہوگا۔ واضح رہے کہ ریڈ اینڈ لیڈ فاؤنڈیشن کا مشہور پروگرام 'چلو کرتے ہیں باتیں کتابوں سے'، 'مصنف سے ملیے' کے تحت نئی کتابوں کی اشاعت اور شہر میں کسی ادیب، شاعر، مصنف کی آمد پر مختلف پروگراموں کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ اس طرح کی معلومات فاؤنڈیشن کے صدر مرزا عبدالقیوم ندوی نے پروگرام کے ابتدا میں دی۔

پریس ریلیز: مرزا عبدالقیوم ندوی، اورنگ آباد، مہاراشٹر، 27 مئی 2019

شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی میں جرنل کے خصوصی شمارے کا اجرا

سائنسی مضامین پر مبنی 'سائنسی قوس قزح' کا اجرا

شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی میں جرنل کے خصوصی شمارے کا اجرا

پٹنہ: پٹنہ یونیورسٹی کے قیام کو ایک سو سال مکمل ہوگئے ہیں۔ کسی ادارے کے لیے ایک سو سال بہت ہوتے ہیں۔ شعبۂ اردو نے ایک بڑا کام کیا ہے کہ اردو کے حوالے سے پٹنہ یونیورسٹی کی ایک صد سالہ تاریخ کو جرنل میں سمودیا ہے۔ اس طرح کا کام ہر شعبے کو کرنا چاہیے۔ ان خیالات کا اظہار پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر راش بہاری پرساد سنگھ نے اردو جرنل کے خصوصی شمارے کا اجرا کرتے ہوئے آج شعبۂ اردو کے سیمینار ہال میں منعقد ایک تقریب میں کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو زبان میں جو خوبصورتی اور کشش ہے وہ بہت کم زبانوں میں ہے۔ اس زبان کی حفاظت اور فروغ کی کوشش ہم سب کو کرنی چاہیے۔ واضح ہو کہ اردو جرنل کا تازہ شمارہ 548 صفحات پر پٹنہ یونیورسٹی کی خدمات کے حوالے سے شائع ہوا ہے۔

تقریب کی نظامت کرتے ہوئے جرنل کے ایڈیٹر ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے جرنل کا تعارف اور اس کی تاریخ پیش کی اور اس کی اشاعت میں آنے والی دشواریوں کا ذکر کیا۔ جبکہ صدر شعبہ ڈاکٹر جاوید حیات نے مہمانوں کا استقبال کیا اور شعبے کی جانب سے مہمانوں کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا۔

مہمان خصوصی پروفیسر ڈولی سنہا، پرووائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی نے کہا کہ کسی تعلیمی ادارے کی پہچان اس کی تحقیقی سرگرمیوں سے ہوتی ہے اور جرنل اس کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہے اور شعبۂ اردو یہ کام بخوبی کر رہا ہے۔ انھوں نے اردو کو سائنس، قانون، کامرس اور ٹکنالوجی کی زبان بنانے پر بھی زور دیا۔ پٹنہ کالج کے پرنسپل پروفیسر راما شنکر آریہ نے شعبے کو فعال اور متحرک شعبہ قرار دیتے ہوئے اس کی سرگرمیوں پر خوشی کا اظہار کیا اور اردو جرنل کو شعبے کے سفر میں ایک سنگ میل قرار دیا۔ سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر اعجاز علی ارشد نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ شہاب ظفر اعظمی نے اس شمارے کے ذریعہ ساگر کو گاگر میں بھرنے کا کام کیا ہے۔ پانچ ابواب میں جرنل کی تقسیم ان کے حسن ادارت اور ذوق صحافت کی عمدہ مثال ہے۔ پروفیسر علیم اللہ حالی نے شعبۂ اردو کو ہندستان کی یونیورسٹیوں میں ممتاز قرار دیتے ہوئے اس کی وجہ یہاں کی علمی و ادبی سرگرمیوں کو قرار دیا۔ پروفیسر اسلم آزاد نے موجودہ زمانے میں شعر و ادب سے طلبہ کی بے رغبتی کا ذکر کرتے ہوئے انہیں سنجیدہ اور اچھا طالب علم بننے کی تلقین کی۔ اس موقع پر شعبے کے طلبہ میں سے ڈاکٹر زرنگار یاسمین اور محمد منہاج الدین نے جرنل کے تازہ شمارے پر اپنے تبصرے بھی پیش کیے۔ تقریب میں شہر عظیم آباد کی اہم شخصیات میں سے رمیش کنول، پروفیسر اسرائیل رضا، مظہر عالم کے علاوہ کئی اہم شخصیات نے شرکت کی۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، پٹنہ، 6 مئی 2019

سائنسی قوس قزح

اورنگ آباد: سیدہ فاطمہ زہرہ اور ڈاکٹر رفیع الدین ناصر کی سائنسی مضامین پر مبنی کتاب 'سائنسی قوس قزح' کا اتوار بروز 5رمئی 2019 کو دفتر ریڈینٹ ایجوکیشن سوسائٹی' دلرس کالونی' اورنگ آباد میں محترمہ عائشہ سلطانہ (موظف میڈیکل انچارج سسٹر' امباجوگائی) کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ رسم اجراء کے موقع پر مشہور ادیب' ناول نگار نور الحسنین نے کہا کہ 'اردو ادب میں سائنسی مضامین پر مبنی کتابوں کی بے حد کمی ہے۔ اس کمی کو سیدہ فاطمہ زہرہ اور رفیع الدین ناصر کی کتاب' سائنسی قوس قزح' کسی حد تک دور کرنے کا کام انجام دے گی۔ یہ کتاب نہ صرف ایک عام قاری کے لیے فائدہ مند ہے بلکہ وہ اردو ادبا جو اردو ادب میں خامہ فرسائی کرتے ہیں ان کے لیے بھی رہنمائی کا کام انجام دے گی۔ اس موقعے پر مصنفہ فاطمہ زہرہ (سابقہ پرنسپل' ڈاکٹر ذاکر حسین جونیر کالج' اورنگ آباد) نے فرمایا کہ سائنسی قوس قزح کو مرتب کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے اردو طلبا' عام قاری اور ادبا سائنس کی بنیادی معلومات حاصل کرسکیں۔ اس موقع پر دوسرے مصنف ڈاکٹر رفیع الدین ناصر نے کہا کہ سائنسی قوس قزح دراصل سائنس کے مختلف رنگوں کا وہ سنگ میل ہے جس کے تحت اردو پڑھنے والے سائنس کی مختلف پیچیدگیوں کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ کتاب مہاراشٹر کے مشہور طباعتی ادارے مرزا ورلڈ بک ہاؤس سے شائع ہوئی۔ کتاب خوبصورت و دیدہ زیب طبع کی گئی ہے۔ کتاب 204 صفحات پر مشتمل ہے جس کی قیمت 130 روپے ہے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر رفیع الدین ناصر، اورنگ آباد، مہاراشٹر، 6 مئی 2019

قرآن کریم اور اللہ کے بندوں کو نفع رسانی

علی گڑھ: ممتاز بزرگ اسکالر، نائب صدر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس و مدیر 'فکر نو' پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی نے سابق صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز پروفیسر

ظفر الاسلام اصلاحی کی نئی کتاب 'قرآن کریم اور اللہ کے بندوں کو نفع رسانی' کی رونمائی کی۔ کتاب کے موضوع کے حوالے سے پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی نے یہ تاثر ظاہر کیا کہ یہ وقت کا ایک اہم موضوع ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب موجودہ صورتِ حال میں بڑی اہمیت و افادیت رکھتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن کریم نے انسانی بھائی چارگی، محبت و ہمدردی اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کا جو پیغام دیا ہے لوگ صدقِ دل سے اس پر

ڈاکٹر ارشاد سیانوی کی کتاب 'نئی صدی کا اردو افسانہ' کا اجرا

محمد ابوالکلام کی تصنیف 'اردو رسم الخط کا ارتقا'

عمل کریں اور بلا کسی تفریق سب کا بھلا چاہنے، دوسروں کو نفع پہنچانے اور ان کے کام آنے سے متعلق جو ہدایات وتعلیمات قرآن میں ملتی ہیں ان کو روزمرہ کی زندگی میں اختیار کریں۔ اسی صورت میں قرآن کا فیض عام ہوگا اور اس کے خوش گوار اثرات معاشرے پر مرتب ہوں گے۔ حلقہ درسِ قرآن، اقرا کالونی (علی گڑھ) سے برائے ہدیہ شائع شدہ اس مختصر کتاب میں نہایت آسان زبان میں خلق خدا کو نفع رسانی سے متعلق قرآنی آیات کی تشریح و ترجمانی پیش کی گئی ہے اور برمحل احادیث بھی نقل کی گئی ہیں اور اس بات پر خاص زور دیا گیا ہے کہ اسلام دوسروں کو نفع پہنچانے کے باب میں مسلم وغیر مسلم، موافق و مخالف میں کوئی تفریق روا نہیں رکھتا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 9 مئی 2019

نئی صدی کا اردو افسانہ

میرٹھ: ''یہ کتاب تحقیق کے طالب علموں کے لیے بے حد مفید ثابت ہوگی۔ ارشاد سیانوی نے اپنی تنقیدی بصیرت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ 21ویں صدی میں 21 کہانیوں کے حوالے سے کئی بدلاؤ پیش کیے گئے ہیں۔ ابھی کئی بڑے نام چھوٹ گئے جن کو شامل کیے جانے کی ضرورت ہے۔'' یہ الفاظ ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی، (ڈپٹی ڈائرکٹر انفارمیشن، میرٹھ اور سابق مدیر ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ) کے تھے جو شعبۂ اردو میں منعقدہ پروگرام ڈاکٹر ارشاد سیانوی کی دوسری تنقیدی کاوش 'نئی صدی کا اردو افسانہ' کی رسم اجرا کے موقعے پر ادا کر رہے تھے۔ اس موقعے پر معروف افسانہ نگار محترم خورشید حیات نے کہا ''فکر نو کی تجلیوں کو نئی تنقید کے کوہِ طور پر دیکھنا ہو تو ڈاکٹر ارشاد سیانوی کی کتاب 'نئی صدی کا اردو افسانہ' کے ورق ورق کا مطالعہ ضروری ہے کہ اکیس کہانیوں پر انھوں نے جو تجزیے کیے ہیں، انھیں پڑھ کر مجھے ایسا لگا کہ ہر کہانی پر تجزیہ کرتے وہ تحلیل کے مراحل سے گزرے ہیں۔ اردو فکشن پر ریسرچ کرنے والے طلبا کے لیے یہ کتاب کافی اہمیت کی حامل ہے۔

پروگرام کا آغاز مفتی راحت علی صدیقی نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ پروگرام کی صدارت، صدر شعبۂ اردو، پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر پروفیسر سنجیو کمار شرما وائس چانسلر، مہاتما گاندھی سینٹرل یونیورسٹی، بہار نے شرکت کی جبکہ مہمانان ذی وقار کے بطور ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی (ڈپٹی ڈائرکٹر، انفارمیشن میرٹھ) سید معراج الدین (سابق چیئرمین، پھلاودہ) اور معروف فکشن نگار خورشید حیات شریک ہوئے۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر شاداب علیم اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر فرقان سردھنوی نے انجام دیے۔ سبھی مہمانان نے مل کر کتاب کی رونمائی کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 6 مئی 2019

اردو رسم الخط کا ارتقا

ناگپور: ناگپور حلقہ ادب سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر محمد ابوالکلام سابق پرنسپل اسلامیہ ہائی اسکول و جونیئر کالج آف سائنس ناگپور کی تازہ ترین تصنیف 'اردو رسم الخط کا ارتقا' کا اجرا پانچویں قومی اردو کانفرنس 2019 کے افتتاحی اجلاس منعقدہ ڈی ڈی ای آڈیٹوریم مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد میں بدست ڈاکٹر محمد اسلم پرویز وائس چانسلر کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس جلسے میں زاہد حسین خاں ریٹائرڈ پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ، ڈاکٹر قیصر جمیل، بھگوان مہاویر میڈیکل ریسرچ سینٹر، حیدرآباد، ڈاکٹر قاضی سراج اظہر ایسوی ایٹ مشی گن یونیورسٹی امریکہ نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے خطبہ صدارت پیش کیا۔ ڈاکٹر عابد معز نے کانفرنس کی غرض و غایت بیان کی اور مہمانوں کا تعارف پیش کیا۔ پروفیسر نجم الحسن، ڈین اسکول برائے سائنسی علوم نے شرکا کا شکریہ ادا کیا اور ڈاکٹر آمنہ تحسین نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ کانفرنس میں ملک کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے مندوبین نے شرکت کی۔

پریس ریلیز: محمد مظہر الحق، ناگپور، 2019

سہرے کی ادبی معنویت

دربھنگہ: ڈاکٹر امام اعظم کی مرتبہ کتاب 'سہرے کی ادبی معنویت' کا اجرا 25 مئی 2019 کو مرتب کی رہائش گاہ ادبستان، محلّہ: گنگوارہ، دربھنگہ (بہار) میں الفاروق ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے زیر اہتمام پروفیسر رئیس انور، پروفیسر ایم نہال، ڈاکٹر قمر الحسن، ڈاکٹر نجیب اختر وغیرہ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر موجود مہمانوں نے کہا کہ ''سہرے جیسی منفرد صنف سخن پر یہ انوکھی اور اولین کتاب ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم نئے اور ان چھوئے موضوعات پر معیاری کتابیں لاتے رہتے ہیں۔ سہرے کے پھولوں کی طرح اس کی خوشبو بھی اردو حلقوں میں پھیل رہی ہے۔ اس کتاب پر اب تک بہت سارے قلم کاروں نے منظوم و منثور تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ کتاب کے مشمولات مرتب کے مقدمے اور شاہد جمیل کے دیباچے کے علاوہ ایک انٹرویو (ڈاکٹر امتیاز وحید)، 12 مضامین اور 235 شعرا کے سہرے شامل ہیں۔ مرتب کے مقدمہ 'میں پیام نشاط لایا ہوں' سے اردو ادب میں سہرے کی روایت اور اس کی تاریخ پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔''

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 29 مئی 2019

'تیری طلب میں'

ممبئی: پریس کلب میں قیصر الجعفری فورم کے زیر اہتمام کمال احمد بلیاوی کے شعری مجموعے 'تیری طلب میں' کا اجرا بدست معروف نقاد، محقق اور شاعر جناب شمیم طارق عمل میں آیا جو کہ اس جلسے کے صدر بھی تھے۔ جلسہ کا آغاز تلاوتِ کلام پاک سے ہوا، بعد ازاں قیصر الجعفری فورم کے روحِ رواں جناب عرفان جعفری نے قیصر الجعفری فورم کا تفصیلی تعارف پیش کیا نیز اس کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے کہا کہ فورم آئندہ بھی اس نوعیت کے پروگراموں کا انعقاد کرتا رہے گا۔ نیوز ٹاؤن پبلشرز کے ڈائریکٹر اور مذکورہ کتاب کے ناشر اشتیاق سعید نے کمال احمد بلیاوی کی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ان کی شاعری میں تغزل کے

علاوہ جا بجا پیاس اور تشنگی کا بکھراؤ ہے جو کہیں صبر تو کہیں جبر کی علامت اختیار کر لیتی ہے تو کہیں عزم و ارادہ کا استعارہ بن کر اُبھرتی ہے۔ ڈاکٹر قاسم امام اور عرفان جعفری نے کمال کی شاعری پر اُن کے شعروں کے حوالے سے مدلل اور خوب سیرت گفتگو کی، نیز ان کے کئی اشعار کو سراہا بھی۔

پریس ریلیز: اشتیاق سعید، مہاراشٹر، 4 مئی 2019

اردو کے ابتدائی ناولوں میں تہذیبی کشمکش کی عکاسی

نئی دھلی: شاہین باغ میں پوروانچل کے اہلِ علم و دانش کی موجودگی میں 'اردو کے ابتدائی ناولوں میں تہذیبی کشمکش کی عکاسی' کا اجرا عمل میں آیا۔ نشست کی صدارت ڈاکٹر عبید اصلاحی نے کی اور پروگرام کی نظامت حافظ عبدالرزاق نے انجام دی۔ اس موقعے پر جامعہ ملیہ اسلامیہ، جے این یو اور ہمدرد کے طلبہ بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ ڈاکٹر عبید اصلاحی نے کتاب کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ آج ہم جس کتاب کا اجرا کر رہے ہیں اس کے مصنف ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ اللہ انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ انھوں نے کہا کہ بھلے ہی وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر ان کی جو تحریر کتابی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے، اس سے آنے والی نسل استفادہ کرتی رہے گی۔ محمد اشرف نے کہا کہ مصنف کی رحلت سے نہ صرف پوروانچل بلکہ ایک بڑا ادبی حلقہ متاثر ہوا۔ مرحوم کی کتاب پڑھ کر ان کے چاہنے والوں کو ضرور تسلی ہوگی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر محمد نبیل احمد، حافظ عبدالرزاق، ڈاکٹر محمد اسجد اور کلیم احمد نے بھی کتاب کے تعلق سے اپنے اپنے تاثرات پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 جون 2019

وفیات:

گریش کرناڈ

بنگلور: گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ مصنف، ڈرامہ نگار،

اداکار اور فلم ساز، ہدایت کار گریش کرناڈ کا 10 جون کی صبح انتقال ہوگیا۔ وہ 81 برس کے تھے اور طویل عرصے سے سانس کی بیماریوں میں مبتلا تھے۔ مسٹر کرناڈ ایک معاصر مصنف تھے، جنھوں نے کنڑ زبان اور ہندوستانی تھیٹر کے شعبے میں قابل ذکر خدمات انجام دیں۔ ادب، تھیٹر اور سنیما کے شعبے میں ان کے بے مثال تعاون کے لیے ہندوستانی حکومت نے انھیں پدم شری اور پدم بھوشن سے بھی نوازا ہے۔ مسٹر کرناڈ کی پیدائش 19 مئی 1938 کو مہاراشٹر کے ماتھیران میں کونکنی کنبے میں ہوئی تھی۔ مسٹر کرناڈ نے کرناٹک یونیورسٹی سے گریجویشن کی تھی۔ اس کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ممبئی آگئے۔ اسی دوران انھیں مشہور روڈس فیلوشپ مل گئی اور وہ انگلینڈ چلے گئے، جہاں انھوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی کے لنکان اور مگڈیلن یونیورسٹیوں سے فلسفہ، سیاسیات اور اقتصادیات میں پوسٹ گریجویشن کی تھی۔ ان کا پورا نام گریش رگھوناتھ کرناڈ تھا۔ مسٹر کرناڈ نے کئی فلموں میں بھی اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں جن میں نشانت، منتھن، سوامی، پکار، اقبال، ڈور، آشائیں، ایک تھا ٹائیگر اور ٹائیگر زندہ ہے اہم ہیں۔ گریش کرناڈ مشہور تخلیقی مصنفین اور اداکاروں میں شمار کیے جاتے تھے۔ اپنی زندگی میں انھوں نے ڈرامہ نگار، اداکار، فلم ہدایت کار، مصنف، صحافی، ان سبھی کرداروں کو انھوں نے بخوبی اور ساتھ ساتھ ادا کیا ہے۔ ان کی ہندی کے ساتھ ساتھ کنڑ اور انگریزی زبان پر بھی اچھی پکڑ تھی۔ انھیں 1974 میں پدم شری اور 1992 میں پدم بھوشن ایوارڈ سے نوازا گیا۔ کنڑ ادب کی تخلیقی تحریر کے لیے انھیں 1998 میں ہندوستان کے سب سے معزز 'گیان پیٹھ' ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ 1998 میں ہی انھیں کالی داس سمان سے بھی سرفراز کیا گیا تھا۔ صدر جمہوریہ رام ناتھ کووند، وزیر اعظم نریندر مودی اور اطلاعات و نشریات کے وزیر پرکاش جاوڈیکر نے گیان پیٹھ ایوارڈ سے سرفراز نامور مصنف اور تھیٹر آرٹسٹ گریش کرناڈ کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ مسٹر مودی نے ٹوئٹ کیا کہ 'گریش کرنارڈ کو ان کی ہمہ جہت اداکاری کے لیے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔'

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 جون 2019

ڈاکٹر انور سجاد

لاهور: اردو زبان کے معروف ادیب، دانش ور، ڈرامہ نگار اور اداکار ڈاکٹر انور سجاد 6 جون کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ ان کی عمر 84 سال تھی۔ ڈاکٹر انور سجاد کچھ عرصے سے علیل تھے اور انھوں نے اپنے علاج کے لیے

پاکستان کے صدر اور وزیر اعظم سے بھی مدد کی اپیل کی تھی۔ میڈیا رپورٹس کے مطابق، ان کی بیگم کا کہنا ہے کہ کچھ عرصے سے ان کا کھانا پینا بھی چھوٹ گیا تھا۔ انھوں نے سوگواروں میں اہلیہ اور ایک بیٹی چھوڑی ہے۔ پیشے کے اعتبار سے، انور سجاد میڈیکل ڈاکٹر تھے لیکن ان کی وجہ شہرت ڈراموں میں ان کی منفرد اداکاری اور ڈرامہ نگاری بنی۔ انھوں نے بہت سی ڈاکومینٹریز کے لیے بھی اداکاری کی۔ ڈاکٹر انور سجاد نے افسانے بھی لکھے۔ ان کی تصنیف میں جنم روپ، نیلی نوٹ بک، رسی کی زنجیر، زرد کونپل، نگارخانہ صبا اور سمندر شامل ہیں۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 8 جون 2019

وشوا ناتھ طاؤس

نئی دھلی: اردو کے بزرگ اہلِ قلم جناب وشوا ناتھ طاؤس کا 6 جون 2019 کو دہلی سے متصل نوئیڈا میں

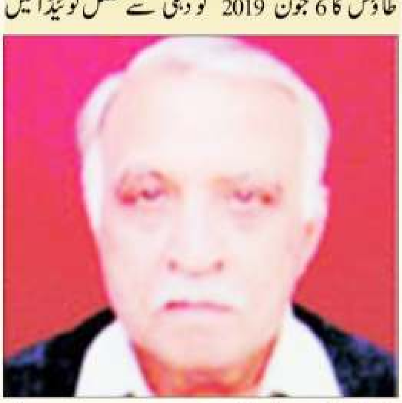

انتقال ہوگیا۔ وشوا ناتھ طاؤس 10 جون 1932 کو فاضلکا، پنجاب میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والدِ محترم وہاں کے ایک معروف تاجر تھے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے فاضلکا میں ہی حاصل کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد 1960 میں وہ چنڈی گڑھ آگئے جہاں 1985 تک مقیم رہے۔ اس کے بعد کچھ برس دہلی کے پیتم پورہ میں رہے اور پھر 1991 میں نوئیڈا میں اپنے چھوٹے بیٹے راجیو آہوجہ کے ساتھ مستقل رہائش پذیر ہوگئے اور آخر وقت تک یہیں

رہے۔ مرحوم کے پس ماندگان میں دو بیٹے اور ایک بیٹی شامل ہیں۔ انتقال کے وقت ان کی عمر تقریباً 87 برس تھی۔ اردو کے بزرگ قلم کار کی حیثیت سے یوں تو طاؤس کی کئی حیثیتیں ہیں مگر بمبئی کی فلم انڈسٹری سے ان کا شغف بے مثال تھا۔ وہ برسوں ممبئی کی فلمی دنیا سے وابستہ رہے تھے۔ اپنے زمانۂ قیام ممبئی میں وہ پابندی سے ڈائری لکھتے تھے۔ بعد کے زمانے میں یہ ڈائریاں ان کے بمبئی کی فلمی دنیا پر لکھے گئے مضامین کے لیے اولین ماخذ بن گئیں اور بمبئی کی فلموں اور ان سے وابستہ لوگوں پر ان کے مضامین اردو کے اہم ترین ادبی رسائل خصوصاً ہفت روزہ 'ہماری زبان' دہلی میں شائع ہوئے۔ وہ ایک خاموش طبع سنجیدہ بزرگ تھے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) سے ان کی وابستگی طویل تھی۔ وہ آخر عمر تک انجمن کی مجلسِ عاملہ کے رکن رہے تھے۔

روز نامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 11 جون 2019

خراج عقیدت :

علامہ انور صابری کو خراجِ عقیدت

نئی دھلی: علامہ انور صابری نے اپنی پوری زندگی اردو ادب کے لیے وقف کردی تھی۔ موصوف نہ صرف تحریک آزادی کے پرستار تھے، بلکہ وہ شاعر انقلاب کے نام سے بھی ہر خاص و عام میں مقبول تھے۔ یہ باتیں معمر شاعر امیر دہلوی نے علامہ انور صابری کی یاد و شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے حاجی ہوٹل جامع مسجد میں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ دہلی کے ان تمام شاعروں اور شاعرات کو ہم دل کی گہرائیوں سے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں جنھوں نے اردو ادب کے میدان میں مخلصانہ جدوجہد کی۔ امیر دہلوی نے کہا کہ دہلی گنگا جمنی تہذیب کا مرکز ہے جہاں تمام مذاہب کے لوگ ایک دوسرے کے تہواروں میں شامل ہو کر اپنی فرقہ ورانہ ہم آہنگی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اس موقعے پر امیر دہلوی نے علامہ انور صابری کے مخصوص انداز میں ان کی غزلیں اور ان کے کلام کو پیش کیا۔ اس کے علاوہ دیگر شرکا نے بھی علامہ انور صابری کی حیات و شخصیت پر روشنی ڈالی۔

روز نامہ 'صحافت' دہلی، 16 مئی 2019

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر...................................... بتاریخ.................................... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

قانون

ادارہ

صفحات:440

قیمت:160 روپے

اردو ادب کی تنقیدی تاریخ

مصنف:سید احتشام حسین

صفحات:341

قیمت:105 روپے

اردو کی کہانی

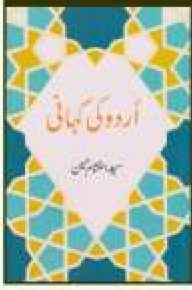

مصنف:سید احتشام حسین

صفحات:104

قیمت:25 روپے

اردو سب کے لیے

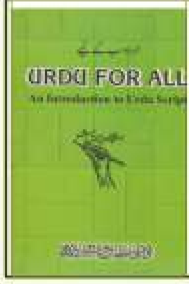

ادارہ

صفحات:116

قیمت:85 روپے

اردو سب کے لیے

مصنف:عبدالودود انصاری

صفحات:121

قیمت:90 روپے

مشرق ومغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ

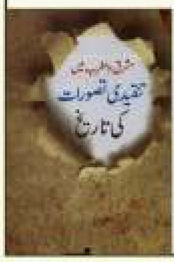

مصنف:محمد حسن

صفحات:373

قیمت:168 روپے

سماجی تحقیق

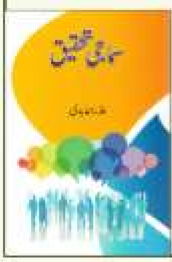

مصنف:عذرا عابدی

صفحات:490

قیمت:215 روپے

جدید ہندی شاعری پر اردو کا اثر

مصنف:ڈاکٹر نریش

صفحات:155

قیمت:90 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, July-2019, Vol.21, Issue:07
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2017-19
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/06/2019**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

عزت مآب رمیش پوکھریال نشنک (مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل، حکومت ہند) کا شمار ہندی کے ممتاز قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ بچپن سے ہی انہیں نظمیں اور کہانیاں لکھنے کا شوق رہا ہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 'سمرپن' 1983 میں شائع ہوا تھا۔ 'مجھے و دھاتا بننا ہے'، 'تم بھی میرے ساتھ چلو'، 'دیش ہم جلنے نہ دیں گے'، 'جیون پتھ میں'، 'ماتر بھومی کے لئے' ان کی نظموں کے اہم مجموعے ہیں۔ ان کی کہانیوں کے مجموعوں میں 'روشنی کی ایک کرن'، 'بس ایک ہی اچھا'، 'کیا نہیں ہوسکتا' قابل ذکر ہیں۔ ان کی نظموں اور کہانیوں کے ترجمے بہت سی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

کہہ رہی ہے زندگی

بہت ہی نزدیک میرے، رہ رہی ہے زندگی
میں انوکھی داستاں ہوں کہہ رہی ہے زندگی

کچھ حقیقت ہے اگر
ایک بلبلہ ہے زندگی
بوند ساگر بن سویم
ہنساتی - رلاتی زندگی
آج اپنوں میں پرائی سی رہی ہے زندگی
میں انوکھی داستاں ہوں، کہہ رہی ہے زندگی

ہر طرف ہی بھیڑ ہے
دیکھو یہاں بھگدڑ مچی
کھو رہا طوفان میں سب
ایک شواس تک بھی نہ بچی
طوفان کے سارے تھپیڑے سہ رہی ہے زندگی
میں انوکھی داستاں ہوں کہہ رہی ہے زندگی

زندگی پھولوں کی بگیا
کنٹکوں کا گھیر بھی
مسکراہٹ سے بھرا ہے
زندگی کا پھیر بھی
اک بوند آشا کا سمندر، بن رہی ہے زندگی
میں انوکھی داستاں ہوں، کہہ رہی ہے زندگی۔

رمیش پوکھریال نشنک

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025